CARE LIST APPROVED PEER REVIEWED & REFEREED JOURNAL ISSN 2320-3781

نقشِ نو

۲۰۲۲ء_۲۰۲۳ء

سالانہ عالمی اردو جریدہ

(خطوط نگاری نمبر)

مدیر: ڈاکٹر ناصحہ عثمانی

شعبۂ اردو

حمیدیہ گرلس ڈگری کالج، پریاگراج

الہ آباد یونیورسٹی

نقشِ نو

(خطوط نگاری نمبر)

سالانہ عالمی اردو جریدہ

شمارہ پنجدہم

۲۰۲۲ء۔۲۰۲۳ء

مدیر: ڈاکٹر ناصحہ عثمانی

نائب مدیر: ڈاکٹر زرینہ بیگم

شعبۂ اردو

حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، پریاگ راج

الہ آباد یونیورسٹی، یو۔پی۔انڈیا

'نقشِ نو' سالانہ عالمی اردو جریدہ۔شمارہ پنجدہم

یو۔جی۔سی۔CARE لسٹ میں منظور شدہ جریدہ

سرپرست: مسز تزئین احسان اللہ　　نگراں: پروفیسر یوسف نفیس

اعزازی مدیر　　پروفیسر عبدالحق

مدیر　　ڈاکٹر ناصحہ عثمانی　　نائب مدیر　　ڈاکٹر زرینہ بیگم

مجلسِ مشاورت:

ڈاکٹر مامون ایمن (نیویارک)　　پروفیسر شبنم حمید (پریاگ راج)

ڈاکٹر عارف نقوی (جرمنی)　　ڈاکٹر ندرت محمود (پریاگ راج)

ڈاکٹر محمد آصف علی (ماریشس)　　ڈاکٹر شبانہ عزیز (پریاگ راج)

پروفیسر اسلم جمشید پوری (میرٹھ)　　ڈاکٹر صدیقہ جابر (پریاگ راج)

پروفیسر احمد محفوظ (دہلی)　　ڈاکٹر فرح ہاشم (پریاگ راج)

کمپیوٹر کمپوزنگ: شاذیہ غلام انصاری

ناشر: شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، نوراللہ روڈ، پریاگ راج۔یو۔پی۔انڈیا

فون نمبر: 0532-2978600　موبائل نمبر: 7007400501- 9559258741

ای میل: naqshenauurdu@gmail.com

ISSN 2320-3781 Naqsh-E-Nau

قیمت: اندرونِ ملک 200 روپئے، بیرون ملک 20 ڈالر (ڈاک خرچ الگ)

'نقشِ نو' کے مشمولات میں ظاہر کردہ نفسِ مضمون سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

(جملہ حقوق بحقِ شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج محفوظ ہیں۔)

فہرست

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
۱۔	اپنی بات	ڈاکٹر ناصحہ عثمانی	
۲۔	انشائے رشیدی	پروفیسر عبدالحق	۷
۳۔	اردو میں مکتوب نگاری: آغاز وارتقا اور زوال	پروفیسر اسلم جمشید پوری	۱۴
۴۔	بشیر الدین احمد کی ادبی خدمات	ڈاکٹر ہما مسعود	۳۵
۵۔	مولانا محمد علی جوہرؔ کی خطوط نگاری	ڈاکٹر اعظم انصاری	۵۰
۶۔	صفیہ اختر کی مکتوب نگاری	ڈاکٹر صبیحہ سید	۶۲
۷۔	اکبرالہ آبادی فن خطوط نویسی کے آئینے میں	ڈاکٹر شیخ عمران	۷۰
۸۔	سرسید کا خواب اور ان کی کاوشیں	ڈاکٹر محمد فرحان دیوان	۸۱
۹۔	غالبؔ کے خطوط میں زندگی کی کہانیاں	ڈاکٹر طاہرہ پروین	۹۹
۱۰۔	نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس: پروفیسر محمود الٰہی	ڈاکٹر بشریٰ بانو	۱۰۸
۱۱۔	خطوط اقبال میں تصوف کے مباحث	ڈاکٹر طالب اکرام	۱۴۲
۱۲۔	غالب کے فارسی خطوط کا مختصر تذکرہ	ڈاکٹر شبانہ عزیز	۱۵۷
۱۳۔	مجاہدین آزادی کے کچھ اہم تاریخی خطوط	ڈاکٹر نزہت فاطمہ	۱۷۴
۱۴۔	اردو میں خطوط نگاری کی روایت	ڈاکٹر عبدالحفیظ	۱۹۱
۱۵۔	حسرت موہانی خطوط کے آئینے میں	ڈاکٹر فرح ہاشم	۲۱۰
۱۶۔	خطوط غالب معلومات کا گنجینہ	ڈاکٹر امتیاز احمد علی	۲۱۹
۱۷۔	غبار خاطر کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر معراج الدین خان	۲۲۷

۱۸۔	تاریخ نویسی میں مکتب ادب کی اہمیت: مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط کے خصوصی حوالہ کے ساتھ	ڈاکٹر تبسم نگار	۲۳۸
۱۹۔	خطوط غالب کی ادبی اہمیت	سراج انور محمد میراں	۲۵۵
۲۰۔	خطوط نگاری کی روایت	ڈاکٹر اقصیٰ امان	۲۸۱
۲۱۔	مکتوب نگاری اور بھوپال	لیسریٰ راحت	۲۸۷
۲۲۔	مرزا غالبؔ کی خطوط نگاری	ڈاکٹر محمد سفیان احمد	۲۹۲

اپنی بات

خطوط نگاری صدیوں سے اظہار ذات اور اظہار جذبات کا ہی نہیں رابطوں کا بھی اہم ترین ذریعہ رہی ہے۔ یہ رابطے ذاتی نوعیت کے ہوں یا سیاسی، سماجی، تہذیبی یا مذہبی۔ مراسلے، خطوط، رقعات اور نامہ نگاری نے نہ صرف انسانوں کو جوڑنے کا کام کیا ہے بلکہ اکثر اوقات سماجی اور سیاسی مسائل میں روح بھی پھونکی ہے اور سماج کے علاوہ تاریخ میں بھی ایک نیا دستاویز رقم کیا ہے۔

اکیسویں صدی برقی توانائی اور تکنیکی انقلاب کی صدی ہے زندگی کے تمام شعبہ جات میں بیسویں صدی کے اواخر سے ہی نمایاں تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں اور اکیسویں صدی شروع ہوتے ہوتے یہ تکنیکی تبدیلیاں زندگی کا جزو لاینفک بن گئیں ان تکنیکی انقلابات نے جہاں سیاسی اور سماجی طریقۂ کار میں ایک نئی روح پھونکی وہیں ہمارے کچھ تہذیبی اقدار پہ ضرب کاری بھی کی۔ کتب بینی کے شوق اور مکتوب نگاری بھی اس نئی تبدیلی کے زیر اثر زوال پذیر کا شکار ہونے والے وہ شوق اور مصروفیات زندگی ہیں جو اس نئی روش کے زیر اثر اب تہذیبی کتاب کے گم کردہ اوراق بنتے جا رہے ہیں جبکہ تہذیب ہی نہیں سیاست اور تحریک و تاریخ نویسی میں بھی یہ نمایاں اہمیت کے حامل تھے۔

اردو و فارسی ادب کا سرمایہ ایسے بے بہا سرمایوں سے لبریز ہے چنانچہ 'نقش نو' کی مجلس ادارت نے اس گنجہائے گراں مایہ سے خزف ریزے تلاش کرنے کی خاطر اس خصوصی شمارے کی ترتیب دی۔ غالب، آزاد، سرسید، محمد علی جوہر وغیرہ کے خطوط پر تحقیقی مقالوں کے

علاوہ رشید احمد صدیقی کے خطوط کی اہمیت اور ان کی انشا پردازی، محمود الٰہی کے خطوط، حسرت موہانی خطوط کے آئینے میں، خطوط اقبال میں تصوف کے مباحث، اکبر الہ آبادی فن خطوط نویسی کے آئینے میں وغیرہ مضامین یقیناً 'نقش نو' کی تحقیقی اور تنقیدی شناخت کو بنانے میں معاون ہوں گے نیز طالبان علم کے لیے مفید و معاون ہونگے اور گذشتہ برسوں کی مانند ہی اس سال بھی 'نقش نو' اپنی نمایاں پہچان بنانے میں کامیاب ہوگا۔

ہم مجلس ادارت کی جانب سے سبھی مقالہ نگاروں کے تعاون کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں کہ ان کی معاونت کے بغیر یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچانا ممکن نہیں تھا۔ آپ کی رائے ہمارے لیے بیش قیمت سرمایہ ہے۔ انتظار رہے گا۔

ناصحہ عثمانی

مدیر

انشائے رشیدی

جدید انتقادی سرمایہ میں دو جملے محاورۂ تنقید بن کر بہت مشہور ہوئے۔ طلبا و اساتذہ کے درمیان یہ کثرتِ حوالہ کا سبب بھی بنے۔ کلیم الدین احمد مرحوم کا جملہ اردو میں تنقید کو معشوق کے موہوم کمر سے تعبیر کرنا ایک منفی نقطۂ نظر کا غماز تھا۔ مگر اسے غلط کہنا بھی ممکن نہ تھا۔ رشید احمد صدیقی مرحوم کا غزل کو اردو شاعری کی آبرو بتانا ایک اثباتی اظہار تھا۔ دونوں جملے قولِ فیصل کے طور پر تسلیم کیے گئے اور سکۂ زر بن کر رائج ہوئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رشید احمد صدیقی نے برسوں کی فکری ریاضت کے بعد اپنے مخصوص اسلوب میں اسے تراشا ہے۔ یہ قول فکری و معنوی تہہ داری کا حامل اور ایک بڑی حقیقت کا اعلانیہ ہے سب سے محبوب صنفِ سخن غزل کو یہ اعزاز و احترام کسی اور کے قلم سے نہ مل سکا۔ معنیٰ خیز اور فکر انگیز جملوں کی خارہ تراشی اور خارہ گدازی میں رشید احمد صدیقی کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ ان کے اس طرح کے جملے ہمیں سرسری نہیں گزرنے دیتے۔ بلکہ ٹھہر کر غور و فکر کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ ان کے اقوال ایک نئی طرزِ تنقید کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ جس میں تہذیبی نور فشانی، فکری رعنائی خیال اور تنقیدی تہہ داری کا آہنگ شامل ہے۔ اس ارتباط نے تخلیق کو پرکھنے کے لیے نئے اسلوبِ نقد کی طرح ڈالی اور انتقادی رہ گزر کو امکانی جہات سے روشن کیا۔

رشید صاحب تخلیقی سرمایہ سے سرشار ذہن کے مالک تھے۔ وہ مزاحیہ مضامین یا خاکہ نگاری میں درک رکھتے تھے۔ مگر ادب کے انتقاد و افہام پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ دوسرے اصنافِ تخلیق بھی ادبی حوالوں سے نور فشاں ہوئے ہیں۔ ان کی ذات حیرت انگیز عناصر سے مرکب ہے۔ ملک و ملت کے احساسِ سود و زیاں میں ان کا شریک کوئی نہیں۔ اسی لیے جو سوز و گداز ان کی تحریروں میں موجود ہے وہ عصر حاضر کے قلم کاروں میں جنسِ نایاب ہے۔ تحریر و تخلیق کی تفہیم اسی زاویۂ نظر سے ہوتی ہے۔ تخلیقی تحریر کے علاوہ ذاتی حالات و کوائف میں بھی اس اندازِ نظر کی نشان دہی مشکل نہیں ہے۔ رشید صاحب کی مکتوباتی

پروفیسر عبدالحق، پروفیسر ایمرطس، دہلی یونیورسٹی، دہلی

تحریریں شاہد ہیں۔

تخلیق کار کے فکر ونظر کی دنیائے دوں جب صفحۂ کاغذ پر منتقل ہو جاتی ہے تو وہ پھر کسی کا مالِ تجارت نہیں رہتی اور نہ ہی مالِ غنیمت کی طرح تقسیم ہوتی ہے۔ ہر ایک کو اس سے بہ قدرِ ظرف مستفیض ہونے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ رشید صاحب اپنے خطوط کی حفاظت اور اشاعت سے مکتوب الیہ کو منع کرتے رہے۔ مگر ان کے مخاطب بھی ایسے نادان نہ تھے جو متکلم کے مشوروں کو مان لیتے۔ تقریباً سب نے ارشادِ گرامی کی روگردانی کی۔ نیاز مندوں نے نگارشاتِ رشیدی کو گنجینۂ گہر جان کر گلے سے لگائے رکھا اور انہیں تلف نہ ہونے دیا۔ دیکھتے دیکھتے خطوط کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا کہ اسے مکتوبات کی دنیا کا حیرت خیز معجزہ کہا جا سکتا ہے۔ ان کی تعداد اور تکثیریت کی ایسی مثال ہماری ادبی وعلمی ثقافت میں ناپید ہے۔ اردو کے مفکر شاعر علامہ اقبال کی ایک مثال ہے۔ جنہوں نے گوناگوں مصروفیت کے باوجود کثرت سے خطوط لکھے ان کے مطبوعہ مکاتیب کی تعداد تقریباً پندرہ سو ہے۔ رشید احمد نے ان پر سبقت حاصل کی جن کی صحیح تعداد کا شمار ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔ مکاتیبِ اقبال کے چھوٹے بڑے تقریباً دس مجموعے شائع ہوئے۔ ان سب کو یکجا کر کے ''کلیات مکاتیب اقبال'' کی چار جلدیں شائع ہوئیں خطوطِ رشید کی تعداد کئی جلدوں پر مشتمل ہو سکتی ہے۔ ان کے مطالعے کے لیے عمرِ خضر درکار ہوگی جس میں سینہ شگافی اور خارہ گدازی کے لیے لبیک کہنے والے کسی مردِ افگنِ عشق کی آزمائش بھی ہوگی۔ شرر کا شعلہ سے الجھنا بے محل سمجھ کر اور تب وتابِ یک نفس کو غنیمت جان کر خود کے مرتب کردہ دو مختصر مجموعوں پر راقم نے اکتفا کیا ہے۔ پہلا مجموعہ ''رشید احمد صدیقی افکار واسالیب'' میں شامل مکاتیب ہیں۔ دوسرے خطوط بعد کی تالیف ''رشید احمد صدیقی کا ثقافتی منظر نامہ'' میں موجود ہیں۔ ان دونوں میں خطوط کی مجموعی تعداد دو سو چھبیس ہے ان میں بڑی تعداد چھوٹے بھائی جناب نیاز احمد صدیقی مرحوم اور ڈاکٹر محمود الٰہی کے نام ہیں۔ دونوں کی نسبت جداگانہ ہے۔ ایک بھائی کی حیثیت رکھتا ہے تو دوسرا شاگرد ہے۔ دونوں کے حفظِ مراتب اور طرزِ تخاطب کے علاوہ

مسائلِ گفتگو بہت مختلف ہیں۔مگر حسنِ سلوک اور شفقت میں دلبری و دل داری ایک جیسی ہے۔اسلوب وانشاء کے ساتھ ذاتی معاملات یکساں ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ بہ حیثیت صاحبِ طرز ادیب کے ان کی ہر تحریر اور ہر جملہ اہمیت رکھتا ہے۔ان کے ان گنت خطوط ضائع ہو گئے جو علامہ اقبال، ذاکر حسین، عابد حسین ،پطرس بخاری، فراق، جوش، اصغر ،جگر، فانی، مولانا سہیل اور دوسرے حضرات کے نام لکھے گئے ہیں۔سیکڑوں خطوط تلف ہو گئے۔خلیق احمد نظامی ،مسعود حسین خاں، آل احمد سرور وغیرہ نے اپنے نام لکھے گئے خطوط شائع کیے ہیں۔ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے دوسرے حضرات کے مکاتیب مرتب کیے ہیں۔مہر الٰہی ندیم اور لطیف الزماں صاحبان نے کئی جلدوں میں مرتب کر کے ایک قابلِ رشک کام انجام دیا ہے۔ بعد ازاں اردو کونسل نے ایک منصوبے کے تحت کلیات مکاتیب کا سلسلہ شروع کیا ہے۔یہ تفصیل ایک حیرت خیز عجوبہ ہے۔اقرار کرنا پڑتا ہے کہ آج تک کسی ادیب نے اتنی کثرت سے خطوط نہیں لکھے۔دونوں انگلیوں کے درمیان قلم پکڑنے کی مشقت نے فاصلہ پیدا کر دیا تھا جو انتقال کے بعد کوشش کے باوجود درست نہ ہو سکا۔ایسا لکھنے والا ادیب بھی نظر میں نہیں ہے جن کے مضامین کی آٹھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں یہ ان کی مسلسل کتابوں کے علاوہ ہیں۔جنہیں عاشقِ رشید لطیف الزماں مرتب کر چکے ہیں۔انہوں نے بڑے اہتمام سے رشید صاحب کے بکھرے ہوئے مضامین کو کئی جلدوں میں شائع کیا ہے۔مہر الٰہی کے تعاون سے یہ بڑا کام انجام پا سکا ہے۔ان اشاروں سے رشید صاحب کی تحریروں کے انمول ذخیرے کا تصور کیا جا سکتا ہے۔اور ان کے قلم کی جولانی کا بھی علم ہوتا ہے۔

خطوط میں شخصیت کے عکس واثر کا برملا اظہار ہوتا ہے اور نہاں خانۂ دل میں پوشیدہ اسرار بھی لاشعوری طور پر خطوط میں سرگوشیاں کرتے نظر آتے ہیں۔اسالیب کے ساتھ شخصی کوائف کو سمجھنے کے لیے خطوط کا مطالعہ ناگزیر ہوتا ہے کیوں کہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان حجابات حائل نہیں ہوتے۔عام طور پر ذاتی خطوط ہم مشرب و ہم راز کو ہی لکھے جاتے ہیں۔ہم کلامی اور ہم زبانی میں یہی دونوں روبرو اور درد آشنا ہوتے ہیں۔رشید صاحب کو اپنے چھوٹے بھائی سے جو تعلق خاطر ہے وہ خاندان کے کسی فرد سے نہ

ہوسکا۔ معاملہ بھی ایک طرفہ نہ تھا۔ نیاز صاحب خردسالی کے باوجود بڑے بھائی کا جس طرح خیال رکھتے ہیں وہ بھی مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ رشید صاحب کا بڑا حصہ علی گڑھ میں گزرا۔ نیاز صاحب کی زندگی کا بیشتر وقت آبائی وطن منڈیا ہوں میں بسر ہوا۔ دونوں مقامات کے درمیان تقریباً آٹھ سو کلو میٹر کا فاصلہ ہے مگر اہتمام دیکھیے کہ ہر دوسرے یا تیسرے دن خیریت کا خط وارد ہوتا ہے۔ اور جواب بھی موصول ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ خطوط کا بڑا حصہ محفوظ نہ رکھا جاسکا۔ خطوط رشید احمد صدیقی مرتبہ لطیف الزماں خاں میں نیاز صاحب کے نام صرف پانچ خطوط ہیں۔ ناچیز نے اور خطوط حاصل کئے ہیں۔ جو تلف ہونے سے رہ گئے تھے ان کے بھتیجے پرنسپل شکیل احمد صدیقی کی وساطت سے یہ حاصل ہوئے ان خطوط میں بعض ایسی باتیں موجود ہیں جو دوسرے مقامات پر اشارتاً بھی موجود نہیں ہیں۔ رشید صاحب کے ذہنی کرب کی ایک پُر آشوب کہانی ہے۔ حالات کی سنگ دل سے جس طرح ان کا سینہ شگاف ہوا ہے وہ مثال کسی ادیب و دانشور کی تحریر میں نظر نہیں آتی۔ رشید صاحب بے حد حساس اور دردمند دل کے مالک تھے۔ ہر چھوٹا بڑا حادثہ یا واقعہ انہیں متاثر کرتا اور افسردگی میں اضافہ کرتا رہا۔ عمر کے آخری پینتیس سال ذہنی کرب کے پیچ وتاب اور درد وسوز میں گزرے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اپنی بذلہ سنجی سے دوسروں کو ہنسانے والا قلم شہر آرزو کی نوحہ گری کے لیے وقف ہوجاتا ہے۔ ابنائے وطن کے ستم شعاروں کے ہاتھوں چراغِ دل کا بے نور ہوجانا ان کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھا ان کے مصائب ملازمت سے سبک دوشی سے پہلے شروع ہوچکے تھے۔ ان کے جانشینوں نے ان کی اذیتوں کے اضافے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ خاص طور پر اس شخص نے جسے رشید صاحب نے بڑے ارمانوں کے ساتھ شعبے میں تقرر کیا اور انتہائی بزرگانہ شفقت سے حرمتِ قلم کے اسرار سکھائے۔ انہیں تادم حیات اس کا صدمہ رہا۔ صدمات تو اور بھی تھے جنہوں نے تنہا نشینی کے لیے مجبور کردیا۔ وہ میل وملاقات سے بھی گریز کرنے لگے۔ جگر سوز کیفیات سے مسلسل سابقہ رہا۔ اربابِ اقتدار کا علی گڑھ سے ایک نفرت آمیز رویہ رشید صاحب کے لیے سوہانِ روح بن گیا پھر اردو سے عناد کا حاکمانہ

جبر بھی ان کے لیے کسی طوفان بدوش حادثے سے کم نہ تھا۔تحریریں شاہد ہیں کہ ان کے اعصاب کی مسکراہٹوں کی دنیا ہی دگرگوں ہوگئی۔ثقافتی سرمایہ کی حفاظت کی تمام تدبیریں موہوم ہوگئیں۔لٹے ہوئے قافلے کے خیمے کی طنابیں ٹوٹ چکی تھیں راکھ کے ڈھیر باقیات میں بچ رہے تھے۔فسق وفساد کی عام فضا میں جینے کا حوصلہ چھن گیا۔آزادی کے بعد چشم زدن میں اقدار کی پامالی میں تاب وتواں کو بحال رکھنا رشید صاحب جیسے حساس انسان کے لیے مشکل تھا۔کڑھنے کی کیفیت سے اضطراب بڑھتا گیا۔صرف قلم ہی ایک سہارا تھا جو دل پر گزرنے والے محسوسات کو رقم کرتا رہا۔علی گڑھ کے طلبا کے نام عزیزانِ ندوہ کے نام، علی گڑھ کی مسجد قرطبہ،علی گڑھ ماضی وحال، جیسے دل دوز خطبات میں اس دونیم کیفیت کو دیکھا جاسکتا ہے۔ مذکورہ حوالوں سے قطع نظر ان کے نجی خطوط کے بین السطور شعوری اظہار کی فراوانی ہے۔

''میری حالت جسمانی اور ذہنی دونوں طرح سے اعتدال پر نہیں ہے ۔اس کا احساس بہت ہوتا ہے یہاں کی زندگی بالکل اجنبیوں کی زندگی ہے....بہرحال سال باسال سے زندگی بڑی سنسان، ویران اور بے معنی ہوگئی ہے۔''[۱]

ڈھائی سال بعد ۹ رمئی ۶۳ء کے خط کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''بہت سے وجوہ کی بنا پر علی گڑھ میں رہنا بالکل نہیں چاہتا۔لیکن سوال گاڑی کھینچنے کا ہے وہ میری تقدیر میں ہے.....علی گڑھ میں وہ بھی اپنے گھر میں رہنا بڑا ہی سوہانِ روح ہے۔کوئی روشنی اور راستہ دکھائی نہیں دیتا۔''[۲]

ان کا اخلاص، عقیدہ صبر واستقامت سے بھرپور زندگی کی جھلکیاں اور نہاں خانۂ دل میں اندوختہ محسوسات کا اضطراب سب کچھ خطوط میں موجود ہے۔

''تم جس فشار میں مبتلا ہو اس کا مجھے علم ہے اور اس سے طبیعت کو

جیسی پریشانی ہے کیا بتاؤں ۔اللہ سے مانگیے، گڑگڑایئے اور
کچھ نہ ملے تو اس کی مصلحتوں پر محمول کر کے چپ ہو رہتے ہیں
۔''

ایک دوسری تحریر ملاحظہ ہو ۔ پاکئ داماں اور ایمان وآگہی کی طہارت کے ساتھ بجھے ہوئے دل سے پیدا ہونے والی صبر آشنائی کا منظر دیکھیے ۔

''میرے لیے شیروانی وغیرہ نہ بنوانا ۔ اب اس طرح کی
چیزوں کے اوڑھنے پہننے ، اچھا کھانے پینے ، سیر وتفریح ،
تقریب وغیرہ قسم کی چیزوں سے طبیعت بھاگتی ہے۔''

وہ ثقافتی شوکت کے ترجمان تھے جواب باقیات اور آثار میں تبدیل ہو چکا ہے۔ نیاز احمد صدیقی اقدار واخلاص کے ایک نایاب پیکر تھے اور رشید احمد صاحب بھی بہ قول اقبال:

وہ میرا یوسف ثانی وہ شمع محفل عشق
ہوئی ہے جس کی اخوت قرارِ جاں مجکو

وہ اس سے بہتر شفقت کا سلوک فرماتے رہے ۔ یہ تعلقات مثال کی مانند تھے ۔ جو آخر تک برقرار رہے۔ رشید صاحب دل پر گزرنے والی ہر بات کو انہیں لکھتے اور مشورہ مانگتے ۔ بعض امور میں وہ رفیق حیات سے بھی رجوع نہ کر کے نیاز صاحب سے غبارِ دل کو ہلکا کرتے دوسری طرف نیاز صاحب برادر خرد کی طرح بڑے بھائی کی صحت وسلامتی کے ساتھ ان کی خدمت پر مامور رہتے ۔ نواح کی مشہور مٹھائیاں اور خوشبوئیں بھیجتے رہتے ۔ ان کے ملبوسات بھی اپنی نگرانی میں تیار کرا کے روانہ کرتے رہے۔ گھر گھرانے کے افراد کی بھلائی اور بہبود کے لیے دونوں کی فکرمندی یکساں تھی ۔ بیشتر خطوط میں خانگی معاملات، افراد اور معاش ومعیشت کے اہم مسائل ہی زیر گفتگو رہتے ۔ سبکدوشی کے بعد دونوں بھائیوں کو ضروریاتِ زندگی کی کفالت ایک مشکل مسئلہ تھا۔ کیوں کہ دونوں حضرات

کثیر الاعیال اور مہمان نواز تھے۔ اعزہ سے لے کر طلبا اور ضرورت مندوں کی حاجت روائی سرشت میں شامل تھی۔ حسنِ سلوک کا یہ سلیقہ بزرگ کی بخشی ہوئی سرنوشت تھی جسے صرف سعادت ونعمت نہیں میراثِ پدر جان کر انجام دیتے رہے۔ طلباء کی امداد کے لیے رشید صاحب چٹگاؤں تک سفر کرتے رہے۔ علی گڑھ میں ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا۔ جو ضرورت مند طلباء کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ نہ جانے اور کیسے کیسے لوگ مستفیض ہوئے یہ سلسلۂ جاریہ ہے۔ ان کی تحریروں سے فیض رسانی اور اسالیب شناسی کا ایک رودِ رواں جاری ہے اور فردائے صبحِ درخشاں کی ابدی قوت سے معمور ہے۔

اردو میں مکتوب نگاری: آغاز وارتقا اور زوال

خط لکھنا، خیریت کا لین دین ہے۔ اس کی ضرورت اُس وقت بڑی ہوئی ہوگئی، جب انسان لکھنے پڑھنے لائق ہوا ہوگا اور اپنوں سے دور بغرضِ ملازمت، تجارت یا رہائش کہیں اور گیا ہوگا۔ یہ کہنا تو ممکن نہیں کہ دنیا کا وہ پہلا شخص کون ہے جس نے پہلی بار خط لکھا ہوگا۔ اُردو میں مکتوب نگاری کی روایت تو خاصی قدیم ہے لیکن غالبؔ نے مکتوب نگاری کو ایک نیا مقام عطا کیا بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ غالبؔ نے مکتوب نگاری کو بطورِ صنف متعارف کرنے اور اعتبار بخشنے میں اساسی کردار ادا کیا۔ غالبؔ سے قبل کی خطوط نگاری کے بہت واضح نقوش نہیں ملتے۔ ایسا نہیں ہے کہ غالبؔ سے قبل خط لکھے نہیں جاتے تھے، بلکہ خط بہت زیادہ ثقیل زبان اور طول طویل القابات کے ساتھ لکھے جاتے تھے۔ خط میں کام کی بات تو صرف دو ایک جملے ہی میں ہوا کرتی تھی، مگر پورا خط احترام وآداب، القابات، دعائیہ جملوں سے بھرا ہوتا تھا۔ فارسی کے جملے، مصرعے اور ضرب الامثال کا استعمال زیادہ ہوتا تھا۔ یہ تو خیر سمجھیں کہ حضرتِ غالبؔ نے شاعری کے ساتھ ساتھ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو باضابطہ خط لکھے اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ غالبؔ کے وہ خط محفوظ رہے جو بعد میں ترتیب وتدوین کے ساتھ کتابی شکل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئے ورنہ اردو ادب ایک صنف سے محروم ہوجاتا۔

غالبؔ نے جس طرح خطوط تحریر کیے، اس سے جہاں ایک طرف خطوط میں درآئی ثقالت کم ہوئی تو دوسری طرف خط میں گفتگو کا انداز بھی آیا۔ غالبؔ کی زبان کی بے ساختگی، برجستگی اور ظرافت نے خط کو انتہائی مؤثر اور دلچسپ بنادیا۔ خطوطِ غالبؔ پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے گویا دو لوگ آپس میں گفتگو کررہے ہیں۔ سنجیدہ سے سنجیدہ مسائل بھی خط میں کچھ اس طرح بیان ہوتے ہیں

پروفیسر اسلم جمشید پوری، صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

کہ گویا کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔

اردو میں خطوط نگاری کی ابتدا:

یہ بات آج تک تحقیق طلب ہے کہ اردو میں پہلا خط کس نے کس کو تحریر کیا۔ اس سلسلے میں ہمارے محققین اور ناقدین کرام کسی ایک بات پر متفق نہیں ہیں۔ 1981ء میں شائع پروفیسر ثریا حسین کی کتاب ''گارساں دتاسی: اردو خدمات، علمی کارنامے'' محمد طفیل کے نقوش کے خطوط نمبر 1968، داستانِ تاریخِ اردو، حامد حسن قادری 1966 اور غالبؔ اور شاہانِ تیموریہ (ڈاکٹر خلیق انجم) میں اردو کے پہلے خط اور پہلے مکتوب نگار پر کچھ اشارے ملتے ہیں۔ جن کے مطالعے سے ایک دھندلی سی تصویر سامنے آتی ہے، جس کے مطابق افتخار الدین علی خاں شہرتؔ (1810)، رجب علی بیگ سرور، خواجہ غلام غوث خاں بے خبرؔ (1846)، جان طپش، راسخ عظیم آبادی (1914 سے قبل) کے خطوط ملتے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر ثریا حسین کی تحقیق کے مطابق شہرتؔ کا خط تاریخی اعتبار سے اردو کا پہلا خط قرار پاتا ہے لیکن یہاں ایک مسئلہ پھر بھی قایم ہے۔ شہرتؔ نے یہ خط کس کو لکھا، یہ واضح نہیں ہے۔ اس سلسلے میں گارساں دتاسی کے ذریعہ اس عہد کے خطوط کا مجموعہ ''ضمیمہ ہندوستانی کی مبادیات'' جو 1833ء میں شائع ہوا۔ ہماری تحقیق کا واحد ذریعہ ہے۔ اس مجموعے میں اردو کے بیشتر خطوط ملتے ہیں۔ جن میں سے زیادہ تر انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی اور فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین اور ملازمت کے خواہش مند حضرات کے خطوط ہیں۔ انہیں خطوط میں ایک خط راجہ رام موہن رائے کا بھی ہے۔ جو انھوں نے 1831 میں لندن سے دتاسی کو پیرس بھیجا تھا۔ خط ملاحظہ فرمائیں:

جناب فضیلت مآب زادمجدہم وشرفہم

رقعہ مبارک پہنچا و بندہ کو مسرور و معزز کیا۔ قادر علی الاطلاق آپ کو

اس یادآوری کے ساتھ سلامت رکھے۔ تین مہینے سے زیادہ انگلینڈ

میں مقیم ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب پارس میں مشرف
خدمت ہوگا اور وہ آپ کی توجہ سے جناب شیزی صاحب کی
ملاقات حاصل کرے گا۔ آپ کے وعدۂ مراعات سے بندۂ
کمتر ممنون ہوا وادائے شکر تہہ دل سے کرتا ہے۔
زیادہ حدِّ ادب خادمکم ممنونکم
رام موہن حرّر فی التاریخ یکم اگست 1831

(بحوالہ اردو میں ادبی خط نگاری کی روایت اور غالبؔ، ڈاکٹر بیگم نیلوفر احمد، ص 70، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2007)

راجہ رام موہن رائے کا یہ خط اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ گارساں دتاسی کے نام ہے اور اردو خطوط کے اوّلین نمونوں میں سے ایک ہے۔ غالبؔ سے قبل رجب علی بیگ سرور اور ایک آدھ خط خواجہ غلام غوث خاں بےخبرؔ کا ملتا ہے۔ ویسے یہ بات بھی ثابت ہے کہ بےخبرؔ، غالبؔ کے معاصر ہیں اور خطوطِ غالبؔ کے مجموعے 'عودِ ہندی' کو پہلے انھوں نے ترتیب دیا تھا۔ ہوسکتا ہے ایک آدھ خط، غالبؔ کے خطوط سے پہلے کا ہو، یہاں ان کے ایک خط کا اقتباس نقل کررہا ہوں۔

''...خدا کا شکر کرو کہ اُس نے تمھیں محبوب صورت، مرغوب
سیرت، حسنِ شمائل، پسندیدہ خصائل، فہم ورساء، ذہن وذکا،
عقل سلیم، طبیعت مستقیم، علمِ مفید، بختِ سعید، تقریر کی
فصاحت، تحریر کی بلاغت...''

(انشائے بےخبر، مرتبہ سیّد مرتضیٰ حسین بلگرامی، علی گڑھ، ص 10)

بےخبرؔ کا یہ خط، مدح سرائی دوسرے لفظوں میں نثر میں تعریف کا نمونہ ہے۔ بےخبرؔ ہوں یا

رجب علی بیگ سرور، سرسیّد ہوں یا الطاف حسین حالی، سب غالبؔ کے معاصر ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالبؔ سے قبل اردو میں مکتوب نگاری کی روایت نہ بہت قدیم ہے اور نہ صحت مند و توانا۔ معاصرین غالبؔ میں بھی بے خبر پر غالبؔ کے اثرات نظر آتے ہیں۔ خط کو عام فہم اور نثر کو رواں دواں بنانے میں جو کردار خطوطِ غالبؔ نے ادا کیا وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ ہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کام کو آگے بڑھاتے ہوئے غالبؔ کے ساتھ ساتھ سرسیّد اور الطاف حسین حالی کے خطوط نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ یہاں غالبؔ کا ایک خط ضرور دینا چاہوں گا۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

ازعمر و دولت برخوردار باشند۔

بدھ کا دن، تیسری تاریخ فروری کی، ڈیڑھ پہر دن باقی رہے۔ ڈاک کا ہرکارہ آیا اور خط مع رجسٹری لایا۔ خط کھولا۔ سو روپے کی ہنڈوی، بل، جو کچھ کہیے وہ ملا۔ ایک آدمی رسید مہری لے کر نیل کے کٹرے چلا گیا۔ سو روپیہ چہرہ شاہی لے آیا۔ آنے جانے کی دیر ہوئی اور بس۔ چوبیس روپے داروغہ کی معرفت اُٹھے تھے۔ وہ دیے گئے۔ پچاس روپے محل میں بھیج دیے۔ چھبیس روپے باقی رہے، وہ بکس میں رکھ لیے۔ روپے کے رکھنے کے واسطے بکس کھولا تھا، سو یہ رقعہ بھی لکھ لیا۔ کلیان سودا لینے بازار گیا ہوا ہے۔ اگر جلد آ گیا تو آج، ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیج دوں گا۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور اجر دے۔ بھائی! بری آ بنی ہے۔ انجام اچھا نظر نہیں آتا، قصہ مختصر یہ کہ قصہ تمام ہوا۔

غالبؔ

چارشنبہ، 3 فروری 1858، وقت دوپہر

غالبؔ کے مذکورہ خط میں جو اوصاف ہیں، وہ سب پر عیاں ہیں۔ لفظوں کی سادگی، جذبات نگاری، چھوٹے چھوٹے جملے، بے ساختگی، حالات کا تذکرہ وغیرہ سب کچھ ایک چھوٹے سے خط میں موجود ہے۔ خطوطِ غالبؔ میں نہ صرف غالبؔ کی ذاتی زندگی کے عکس ملتے ہیں بلکہ عہدِ غالبؔ، معاصرینِ غالبؔ، دوست احباب، شاگرد اور اُن کے عہد کے علاوہ 1857 کے حالات، انگریزوں کے بدلتے تیور، پنشن کے معاملات، اصلاح و تصحیح کے معاملے وغیرہ کا بھی احوال ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ غالب کا ایک خط جو انہوں نے 1857 کے پس منظر میں لکھا، اسے بھی ضرور ملاحظہ کریں۔

۵/دسمبر 1857ء کو لکھے مذکورہ خط میں غالبؔ نے دہلی خصوصاً بلی ماران کے حالات اور اپنی ناگفتہ بہ حالت کا ذکر کیا ہے۔ غالب کس طرح ایسے ہنگامی حالات میں محفوظ رہے، یہ بات بھی خط سے واضح ہوجاتی ہے۔

غالبؔ تفتہؔ کو جنوری 1858ء میں ایک خط میں لکھتے ہیں :

''آج سنیچر بار کو دوپہر کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا اور تمھارا خط لایا۔ میں نے پڑھا اور جواب لکھا اور کلیان کو دیا، وہ ڈاک لے گیا۔ خدا چاہے تو کل پہنچ جائے۔

میں تم کو پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ دلی کا قصد کیوں کرو اور یہاں آکر کیا کروگے؟ بنک گھر میں سے خدا کرے، تمہارا روپیہ مل جائے۔

بھائی! میرا حال یہ ہے کہ دفترِ شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا۔ کسی مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی۔ حکام وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں۔ بلایا نہیں گیا، داروگیر سے محفوظ ہوں۔ کسی طرح کی باز پرس ہو تو بلایا جاؤں۔ مگر ہاں، جیسا کہ بُلایا نہیں گیا، خود بھی بروے کار نہیں آیا۔ کسی حاکم سے نہیں ملا، خط کسی کو نہیں لکھا۔ کسی سے درخواستِ ملاقات نہیں کی۔ مئی سے پینس (پنشن) نہیں پایا۔ کہو، یہ نو دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے۔ انجام کچھ نظر آتا نہیں کہ کیا ہوگا؟ زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے۔ ہرگوبند سنگھ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک بار میرے پاس بھی آئے تھے۔ والدّعاء

روز شنبہ سوم جنوری 1858ء　　غالبؔ وقت نیم روز

[خطوط غالبؔ، مرتبہ خلیق انجم، جلد اول ص:۲۶۹۔۲۶۸]

غالبؔ کے اس خط سے کئی باتیں ظاہر ہو رہی ہیں۔ ایک تو وہ دہلی کے حالات کے پیشِ نظر اپنے دوست کو دہلی نہ آنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ دوسرے بنک میں رکھے اپنے دوست کے پیسے کو بھی واپس مل جانے کی دعا کرتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ حالات اس طرح کے تھے کہ بینکوں میں رکھا پیسہ بھی محفوظ نہیں تھا۔ ایک اور خاص بات یہ بھی ظاہر ہوتی ہے کہ حالات اتنے خراب تھے کہ مخبروں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ ہر شخص پر نظر رکھی جاتی تھی۔ حاکم سے ملنا، کسی کو خط لکھنا، کسی سے ملنے کا وقت لینا وغیرہ ایسے کام تھے جو مشکوک تھے۔

خطوطِ غالبؔ سے عہدِ غالبؔ کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہی

باعث ہے کہ مکتوب نگاری میں ڈیڑھ صدی کا طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی آج تک کوئی غالبؔ کا ہمسر پیدا نہیں ہوا۔ جبکہ مکتوب نگاری کے ضمن میں تقریباً ایک درجن بڑے ادیبوں کے نام بہ آسانی لیے جاسکتے ہیں۔ بےخبرؔ، سرور، الطاف حسین حالی، سرسیّد، شبلی، مہدی افادی، اقبال، منٹو، ابوالکلام آزاد، مالک رام، سجاد ظہیر، عبدالحق کے خطوط کی اہمیت سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ مگر غالبؔ ان سب پر غالب ہیں۔

اردو میں جب مکتوب نگاری کی ابتدا کی بات کی جاتی ہے تو ہمارے محقق اس کا سہرا بھی غالب کے ہی سر باندھتے ہیں۔ لیکن ماہر غالب مالک رام کی رائے دوسروں سے کچھ مختلف ہے۔ وہ غالب سے پہلے رجب علی بیگ سرور اور دیگر اصحاب کا ذکر بھی کرتے ہیں:

> ''بیش تر لوگوں کا خیال ہے کہ اردو میں خط نویسی کی ابتدا غالبؔ سے ہوئی۔ یہ درست نہیں۔ غالبؔ سے پہلے فسانۂ عجائب والے رجب علی بیگ سرورؔ نے خطوط لکھے اور شائع کیے اور یوں اِکّا دُکّا خط کئی اور اصحاب کے بھی ملتے ہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ غالبؔ نے خطوں میں ایسا بدیہہ انداز اختیار کیا کہ انہیں سحرِ حلال بنا دیا۔ اس سے پہلے اور خود ان کے زمانے میں بھی فارسی خطوں میں لمبے لمبے القاب و آداب اور عبارت آرائی کی یہ بھرمار تھی کہ سطریں پڑھ جایئے لیکن مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تحریر کا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کسی کو بھی اس اسلوب تحریر کی لغویت کا خیال نہ آیا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اسے ترک کر دینے یا اس میں اصلاح کی جرأت نہیں ہوئی۔ اس کا سہرا بھی غالبؔ کے سر رہا۔''

(’نقوش‘ خطوط نمبر۔ جلد اوّل۔ مدیر: محمد طفیل۔ اپریل 1968ء۔ ص 39)

مالک رام نے اردو خطوط نویسی کی ابتداء کے تعلق سے رجب علی بیگ سرور اور دیگر کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن یہ بھی مانا ہے کہ وہ غالب ہی ہے جنہوں نے فارسی خطوط کے لمبے لمبے القاب و آداب اور عبارت آرائی کو اپنی تحریر سے ترک کرنے کی جرأت کی اور بالآخر وہ غالب کی اولیت کو مان لیتے ہیں۔

مکتوب نگاری کا ارتقا

مکتوب نگاری کی روایت کو غالبؔ کے عہد اور بعد میں سمجھنے کے لیے میں یہاں چار معروف مکتوب نگاروں سرسیّد، شبلی، اقبال، منٹو اور ابوالکلام کے خطوط کے حوالے سے گفتگو کر رہا ہوں۔ سرسیّد کا شمار معاصرینِ غالبؔ میں بھی ہوتا ہے اور بعد کے لوگوں میں بھی۔ ویسے ایماندارانہ بات تو یہی ہے کہ سرسیّد کی فکر و نظر اور تحریر میں ایک موڑ 1870 سفر لندن سے واپسی کے بعد آیا۔ جس میں ’تہذیب الاخلاق‘ کی اشاعت کا بڑا ہاتھ ہے۔ جس کے بعد سرسیّد کے مضامین، مقالات اور خطوط میں بھی اردو نثر کے وہ نمونے ملتے ہیں جن سے اردو نثر کو عام بنانے کی تحریک کو تقویت ملی اور یہ سب غالبؔ کے بعد ہوا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سرسیّد کی نثر پر بھی غالبؔ کے خطوط کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اور سرسیّد کو نثر کو عام فہم بنانے کی تحریک بھی غالبؔ سے ہی ملی ہے۔ 1870 کو سرسیّد کی ادبی اور سماجی زندگی کا خط فاصل کہا جا سکتا ہے۔ ان کی تحریر میں امتیازات کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں سرسیّد کا ایک خط ملاحظہ فرمائیں۔ منشی شیام بہاری لال کو لکھا گیا سرسیّد کا یہ خط:

مشفقی منشی شیام بہاری لال صاحب

نجم الدین عرف ٹٹو کو یکم جنوری سے بارہ روپیہ ماہواری کے حساب سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے تنخواہ ملا کرے گی۔ آپ لالہ سری لال کے ہاں سے منجملہ مبلّغان کانفرنس 20 روپیہ منگا لیجئے۔ بارہ روپیہ تو نجم الدین کو بابت ماہ جنوری دے دیجئے اور کانفرنس کے

اخراجات میں لکھئے۔ اور یہ روپیہ بابت کرایہ ریل آمدورفت
نجم الدین کانفرنس کے حساب میں لکھئے اور وہ آٹھوں روپیہ
میری امانت روزنامچۂ مدرسہ میں جمع کردیجئے۔ والسلام

خاکسار

2/فروری1893 سیّداحمد

(مکاتیب سرسیّد، مرتبہ مشتاق حسین، ص383، فرینڈ بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، 1995)

سرسیّد کا مذکورہ بالا خط کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس خط سے ایک تو سرسیّد کے قومی یکجہتی کے نظریے کو تقویت ملتی ہے کہ سرسیّد نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں غیر مسلم ملازمین کو بھی ملازمت پر رکھا۔ دوسرے سرسیّد کے ذاتی معاملات کی ایک جھلک بھی دکھائی دیتی ہے کہ سرسیّد کس طرح محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا حساب کتاب شفافیت سے رکھتے تھے۔ جہاں تک خط کی زبان کا تعلق ہے تو اس میں کوئی دورائے نہیں کہ زبان بہت سہل اور عام فہم ہے۔ خط کا سن 1893 ہے یعنی عہدِ غالبؔ کے بعد کا زمانہ خطوطِ غالبؔ کے اثرات بھی مکاتیب سرسیّد پر صاف نظر آتے ہیں۔ سرسیّد کی تخلیقی کائنات کا یہ دوسرا دَور ہے جس میں تہذیب الاخلاق کے مضامین کے موضوعات اور زبان سے اُردو کے فروغ کا نیا دَر وا ہوا تھا۔

اردو خطوط نگاری کے ارتقا میں معاصرین سرسید میں علامہ شبلی کا نام خاصا نمایاں ہے۔ انہوں نے قسطنطنیہ سے سرسید احمد خاں کے نام متعدد خطوط لکھے، جن میں سے ایک طویل خط کا اقتباس یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

سیدی!

تسلیم، ۲۲ مئی کو یہاں پہنچا، لیکن تردات کی وجہ سے خط
لکھنے کی مہلت نہ مل سکی، یہ خط بھی مختصر اور پرائیویٹ ہے، کچھ

میں کچھ باتیں آپ انتخاب فرما کر چھاپ دیں تو ممکن ہے، میں نے سردست ایک مختصر سا حجرہ ۱۱/روپیے مہینہ کرایہ کا لے لیا ہے، لیکن کھانے کا صرف بہت زیادہ ہے۔

سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آپ دو تین سو یا اس سے زیادہ روپئے بھیج دیں کہ جو کتاب جس وقت ہاتھ آئے لے لی جائے، یا نقل و کتابت کا انتظام کیا جا سکے، کتابیں یہاں بہت ہیں اور نادر ہیں، لیکن کہاں تک لکھوائی جا سکتی ہیں، امام غزالی کی تصنیفیں یہاں موجود ہیں اور بوعلی سینا کی تو شاید کل تصنیفات مل سکتی ہیں، امام غزالی کے خطوط بھی موجود ہیں، خیر جو ممکن ہوگا کیا جائے گا، یہاں اکثر لوگوں سے ملاقات ہو سکتی ہے، لیکن مشکل زبان کی ہے، بعض بڑے کالج دیکھے مگر زبان کی اجنبیت کی وجہ سے حالات معلوم کرنے میں نہایت دقت ہوتی ہے، میں نے ترکی پڑھنی شروع کی ہے اور ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ بقدر ضرورت واپسی کے وقت تک سیکھ لوں گا، اس وقت تمام کالجوں وغیرہ کی رپورٹ تیار کر سکوں گا۔

حالات دلچسپ ہیں اور سفر نامہ کے لیے بہت سامان مل جائے گا، لیکن اس وقت بلکہ زمانۂ قیام تک مطلق فرصت نہیں مل سکتی، ہر روز تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا ہے، بہت بڑا شہر ہے اور تمام کتب خانے وغیرہ دور دور واقع ہیں۔۔۔۔۔۔۔

شبلی نعمانی

25/مئی 1882ء

قسطنطنیہ مقام تختہ خان قریب محمود پاشا

(خطوط شبلی، مرتب مولوی محمد امین زبیری، تاج کمپنی لاہور، 1926ء ص، 41)

شبلی کے مذکورہ خط سے بہت کچھ مترشح ہے 19 ویں صدی میں قسطنطنیہ کی جو ادبی، سماجی، تعلیمی اور مذہبی اہمیت تھی، وہ ان کے خط سے واضح ہے۔ شبلی کتابوں کے ذخائر دیکھ کر اتاولے سے ہو گئے ہیں اور سب کچھ خرید لینا چاہتے ہیں۔ کئی کالجز کا معائنہ کیا ہے۔ ترکی بھی سیکھ رہے ہیں۔ خط سے ظاہر ہو رہا ہے کہ شبلی سرسید کے تعلیمی مشن کے لئے، کچھ سیکھنے، کالجز کا معائنہ کرنے اور کچھ کتب خریدنے کے لیے قسطنطنیہ گئے تھے۔

بیسویں صدی میں مکتوب نگاری کا جہاں تک سوال ہے تو اقبالؔ منٹو اور ابوالکلام آزاد کے مکتوب کو صدی کے نمائندہ خطوط کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اقبال ہماری شاعری کی آبرو ہیں تو ان کی نثر کا بھی ایک اہم مقام ہے۔ مکاتیبِ اقبال خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ جنہیں سیّد مظفر حسین برنی نے 'کلیاتِ مکاتیبِ اقبال' کی شکل میں پانچ ضخیم جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ جنھیں اُردو اکادمی، دہلی نے 1993 میں شائع کیا۔ اقبال کا ایک خط دیکھیں۔ یہ انہوں نے مولانا سیّد سلیمان ندوی کے نام لکھا تھا۔

15/جنوری 34

مخدومی، السلام علیکم

دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے، جمہوریت فنا ہوری ہے اور اس کی جگہ ڈکٹیٹرشپ قائم ہوری ہے۔ جرمنی میں مادّی قوت کی پرستش کی تعلیم دی جارہی ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف بھی ایک جہادِ عظیم ہو رہا ہے۔ تہذیب و تمدن (بالخصوص یورپ میں) حالتِ نزاع میں ہے۔ غرض کہ نظامِ عالم ایک نئ

تشکیل کا محتاج ہے۔ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس
جدید تشکیل کا کہاں تک مد ہوسکتا ہے۔اس مبحث پر اپنے خیالات
سے مستفیض فرمائیں۔اور اگر کچھ کتابیں ایسی ہوں جن کا مطالعہ اس
ضمن میں مفید ہوتو ان کے ناموں سے آگاہ فرمایئے۔والسلام
محمد اقبال

(کلیات مکاتیبِ اقبال، مرتبہ سیّد مظفر حسن برنی، ص449، جلد سوم، اردو اکادمی دہلی، 1993)

مولانا سیّد سلیمان ندوی، اقبالؔ کے معاصرین میں تھے۔ مذہبی فکر و فلسفہ اور اسلامی وژن کے معاملے میں مولانا سیّد سلیمان ندوی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اقبالؔ ان کا بہت احترام کرتے تھے اور وقتاً فوقتاً بعض اسلامی معاملات میں مولانا سے صلاح و مشورہ بھی کرلیا کرتے تھے۔ اقبالؔ خود اسلامی فکر و فلسفے کے تعلق سے اپنا ایک مخصوص نظریہ رکھتے تھے۔ اور اپنی شاعری میں خودی کا فلسفہ ہو یا کامل مومن کی بات، اقبال نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ اور تعلیمات کو بنیاد بنا کر اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ اقبالؔ کے متعدد اشعار اسلامی نظریۂ تبلیغ و اشاعت کا بہترین ذریعہ ہیں۔

مذکورہ خط میں اقبالؔ پورے عالم میں سیاسی ابتری اور تہذیب و تمدن کی شکست و ریخت سے فکرمند ہیں۔ جمہوریت اور سرمایہ داری کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ آمریت بڑھ رہی ہے ایسے میں اقبالؔ مولانا سے سوال کر رہے ہیں کہ کیا اسلام عالم میں جدید تشکیل میں معاون ہوسکتا ہے؟ یہ خط دراصل ہندوستان کے ساتھ ساتھ پوری دنیا کے سیاسی نظام کے لیے ہونے والی فکرمندی کا اظہار یہ ہے۔ یعنی اس خط سے عصری حسیت کے طور پر سیاسی صورتِ حال کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی مولانا سیّد سلیمان ندوی کی سیاسی، سماجی اور مذہبی مدبر کی حیثیت کو مزید مستحکم کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ سیاسی نظامِ حیات کے تعلق سے اقبال کے فکر و نظر اور عملی اقدام سے بھی آگاہ کرتا ہے۔ یہ ایک اچھے خط کا وصف ہے کہ اچھے خطوط، ذاتی زندگی، عوامی رابطے، اپنے عہد کی سیاسی و سماجی صورتِ حال کی تفصیل نہیں بتاتے تو اشارے ضرور کرتے ہیں۔ غالبؔ

کے خطوط میں یہ عناصر بخوبی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

اردو خطوط نگاری میں جب منٹو کا نام لیا جاتا ہے تو بعض لوگوں کو حیرانی ہوتی ہے۔ منٹو جیسا بڑا افسانہ نگار جس نے اپنے عہد اور بعد میں بھی اپنی افسانہ نگاری کا لوہا تسلیم کروایا تھا۔ جب کسی کو خط لکھتا ہے تو اس میں بھی بہت سے نئے پہلو وا ہوتے ہیں۔ منٹو کے احمد ندیم قاسمی کے نام بہت سے خطوط ملتے ہیں۔ جو دلچسپی سے خالی نہیں ہیں یہاں ان کا ایک خط نقل کیا جارہا ہے:

۱۷۔ اڈلفی چیمبرز، کلیئر روڈ۔ بمبئی ۸

(جنوری 1939ء) برادرِ مکرّم

وعلیکم السلام۔ آپ کا محبت نامہ ملا۔ شکریہ!... میں آگے کچھ اور لکھنا چاہتا تھا معاً میرے دماغ میں یہ خیال آیا کہ آپ اور میں، یعنی قاسمی اور منٹو، مٹی کے دو ڈھیلے ہیں جو لڑھک لڑھک کر قریب آنا چاہتے ہیں... مٹی کے دو ڈھیلے...! ٹھیک ہے... انسان مٹی کا ڈھیلا ہی تو ہے۔

یہ سن کر بہت خوشی حاصل ہوئی کہ آپ کو انعام میں ایک طلائی تمغہ ملا... مجھے تمغے پسند ہیں، مگر ان پر کھدے ہوئے حروف اور شکلیں بالکل ناپسند ہیں، جو گونگی ہوتی ہیں۔ آپ کا خط ڈاکیے نے اس وقت میرے ہاتھ میں دیا، جبکہ میں اپنی اسٹوری MUD کو مکمل کر رہا تھا۔ آپ کی رائے پر میں نے غور کیا، مگر جو کچھ آپ نے لکھا ہے غیر فلمی ہے۔ اس لیے مجھے اُس سے کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا۔ بہر حال آپ یہ سن کر خوش ہونگے کہ میں نے ''کیچڑ'' مکمل کر لیا ہے۔ جو کچھ میں چاہتا

تھا اُس کا ۴/۳ حصہ اُس میں آ چکا ہے۔ بقایا آ جائے گا اس لیے کہ میں دن رات اسی کے متعلق غور وفکر کرتا رہتا ہوں۔ MUD میں آپ کو بہت سی نئی چیزیں نظر آئیں گی۔ ''نیا قانون'' کے استاد منگو کی جھلک آپ کو نتھو کے کیریکٹر میں ملے گی۔ پھر میں نے اپنے ہر کیریکٹر کو اُس کی برائیوں اور اچھائیوں سمیت پیش کیا ہے۔ اگر یہ اسٹوری فلمائی گئی اور ڈائریکشن اُس چیز کو برقرار رکھ سکی جو میرے سینے میں ہے تو میرا خیال ہے کہ آپ میرے MUD میں سارا ہندوستان دیکھ لیں گے۔

''خودکشی'' میں بچپن ہے، یہ اُس زمانے کی تحریر ہے، جب میں خودکشی کا خیال کیا کرتا تھا۔ آپ نے ضرور محسوس کیا ہوگا کہ افسانے کی عبارت ایک ایسے سینے سے نکلی ہوئی ہے، جو بہت چھوٹا ہے۔

آپ ''اوپیرا'' لکھ کر ضرور روانہ فرمایئے۔ یہاں سے آپ کو اس کا حق الخدمت روانہ کر دیا جائے گا۔ رفیق صاحب اسے کمپوز کریں گے۔

آپ کی نظمیں مل گئیں۔ بے حد شکریہ۔ مصوّر میں چھپتی رہیں گی۔

رفیق صاحب سب کی سب لے گئے ہیں۔

خلش صاحب اور نذیر صاحب آداب عرض کرتے ہیں۔

اگر ہو سکے تو ''ساقی'' کے سالنامے میں ''پھاہا'' اور 'ادبِ لطیف' کے سالنامے میں ''ٹیڑھی لکیر'' ضرور پڑھیے گا۔

کیا آپ نے مصوّر میں ''نیا سال'' پڑھا؟... کیا رائے ہے؟

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا بھائی　　سعادت حسن منٹو

(آپ کا سعادت حسن منٹو(منٹو کے خطوط, مرتب اسلم پرویز، دوسرا ایڈیشن ،عرشیہ پبلی کیشنز ، دہلی، 2019،ص،69)

احمد ندیم قاسمی کے نام منٹو کے خطوط کے ہر خط میں کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور سامنے آتی ہے۔اس خط میں بھی منٹو نے انسان کی بے ثباتی کو ثابت کیا ہے۔ساتھ ہی ساتھ اپنی Mud (کیچڑ) کے تعلق سے بہت ساری باتیں لکھی ہیں یہ بھی لکھا ہے کہ نیا قانون کے استاد منگو کی جھلک مڈ کے نتھو کے کردار میں نظر آئے گی اور یہ فلم ہندوستان کا منظر نامہ پیش کرے گی۔افسانہ خودکشی کے بارے میں بھی احمد ندیم قاسمی سے ذکر کرتے ہیں۔اس طرح کی باتوں سے منٹو کا یہ خط بھرا پڑا ہے،آپ کو یہاں بھی منٹو دوسروں سے مختلف نظر آئے گا۔جس میں ساقی اور ادب لطیف کا ذکر ملے گا تو مصور کا بھی۔ممبئی کے فلمی شب و روز ملیں گے تو افسانوی دنیا بھی نظر آئے گی۔اور منٹو کا منفرد انداز بھی جو کہ ان کی نثر خصوصاً افسانوں کا خاصا ہے۔کئی جگہ خط میں افسانہ نگار منٹو نظر آتا ہے۔

بیسویں صدی میں مکتوب نگاری کا کوئی ذکر مولانا ابوالکلام آزاد کے مکتوب کے بغیر ادھورا ہی تسلیم کیا جائے گا۔بیسویں صدی ہی کیا اردو میں مکتوب نگاری کا ارتقا اور روایت،مولانا آزاد کے خطوط کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔''غبارِ غاطر'' مولانا ابوالکلام آزاد کے ایسے خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے احمد نگر قلعہ میں نظر بندی کے تقریباً تین سال میں اپنے رفیق نواب صدر یار جنگ (حیدرآباد) کے نام تحریر کئے تھے۔یہ سارے خطوط،اردو میں مکتوب نگاری کے ذیل میں عام ڈگر سے ایک انحراف کی صورت سامنے آئے۔بظاہر یہ خطوط ایک رفیقِ خاص کے لیے تحریر ہوئے ہیں۔لیکن ان خطوط میں ایک عالم،مفکر،دانشور،سیاست داں کی زندگی کے ذاتی اوراق موجود ہیں۔قید و بند کے معاملات وحالات، ہندوستان کا سیاسی منظر نامہ،تحریکِ آزادی کی سرگرمیاں، کانگریس کا حال،

انگریزوں کی منصوبہ بندی اور مقاماتِ نظر بندی کے تذکرے شامل ہیں۔ یہ سارے خطوط یک طرفہ ہیں اور ایک عالم، ادیب اور دانشور کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ بعض خط خاصے طویل ہیں اور بڑی بڑی کہانیاں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان خطوط کا سب سے بڑا وصف ان کی زبان اور طرزِ تحریر ہے۔ یہاں میں قلعۂ احمد نگر سے 29/اگست 1942 کو لکھا گیا ایک خط پیش کرنا چاہوں گا۔ پورا خط تو طویل ہے، ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

قلعہ احمد نگر

29/اگست 1942

....لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں، مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشہ میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں۔ کلکتہ میں آپ نے ڈلہوزی اسکوائر ضرور دیکھا ہوگا۔ جنرل پوسٹ آفس کے سامنے واقع ہے، اسے عام طور پر 'لال ڈگی' کہا کرتے تھے۔ اس میں درختوں کا ایک جھنڈ تھا کہ باہر سے دیکھیے تو درخت ہی درخت ہیں، اندر جایئے تو اچھی خاصی جگہ ہے اور ایک بینچ بھی بچھی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں، اب بھی یہ جھنڈ ہے کہ نہیں۔ میں جب سیر کے لیے نکلتا، تو کتاب ساتھ لے جاتا اور اس جھنڈ کے اندر بیٹھ کر مطالعہ میں غرق ہو جاتا۔ والد مرحوم کے خادمِ خاص حافظ ولی اللہ مرحوم ساتھ ہوا کرتے تھے۔ وہ باہر ٹہلتے رہتے اور جھنجھلا جھنجھلا کر کہتے، ''اگر تجھے کتاب ہی پڑھنی تھی، تو گھر سے نکلا کیوں؟'' یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور اُن کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔ دریا کے کنارے

ایڈن گارڈن میں بھی اس طرح کے کئی جھنڈ تھے۔ایک جھنڈ
جو برمی پگوڈا کے پاس مصنوعی نہر کے کنارے تھا اور شاید اب
بھی ہو، میں نے چن لیا تھا کیوں کہ اس طرف لوگوں کا گزر
بہت کم ہوتا تھا۔اکثر سہ پہر کے وقت کتاب لے کر نکل جاتا
اور شام تک اس کے اندر گم رہتا۔اب وہ زمانہ یاد آتا ہے تو
دل کا عجب حال ہوتا ہے ۔

عالمِ بے خبری، طرفہ بہشتے بود است
حیف صد حیف کہ ما دیر خبر دار شدیم!

ابوالکلام

محولہ بالا اقتباس مولانا آزاد کے ایک طویل خط جو تقریباً 11 صفحات (کتابی سائز) پر پھیلا ہوا ہے، کا ہے۔اس چھوٹے سے اقتباس کے مطالعے کے بعد بھی یہ احساس ہو جاتا ہے کہ مولانا کا طرزِ تحریر نہ صرف اپنے معاصرین بلکہ اردو مکتوب نگاری کی روایت میں مختلف و منفرد ہے۔ اقتباس کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم کسی افسانے یا ناول کے کسی اقتباس کا مطالعہ کر رہے ہوں۔اقتباس کا کمال یہ ہے کہ اس میں مولانا کے بچپن کے یادگار واقعات کا ذکر ہے۔یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مولانا بچپن سے ہی تعلیم کے دیوانگی کی حد تک شوقین تھے۔ورنہ کھیل کود اور سیر و تفریح کی عمر میں جھنڈ کے اندر کتاب لے کر پڑھائی کرنا، کہاں سمجھ میں آتا ہے۔آج کل ایسے جھنڈ کا طالب علموں کے ذریعہ جو استعمال ہوتا ہے، وہ بھی ہم پر عیاں ہے۔آج کی نسل تو پارکوں میں ایسے تنہا گوشوں کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے اور عاشقانہ راز و نیاز بلکہ اس کے آگے کے سفر سے بھی محظوظ ہوتی رہتی ہے۔خط میں کلکتہ کے بعض معروف مقامات ڈلہوزی اسکوائر اور ایڈن گارڈن کا ذکر موجود ہے۔ویسے خط کی زبان میں ایک طرح کی سادگی ہے۔عموماً یہ تصور کیا جاتا

ہے کہ مولانا کی زبان بہت زیادہ فصیح و بلیغ ہوا کرتی ہے۔جس کے سمجھنے کے لیے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے، ایسا نہیں ہے۔خط میں جس طرح کی عام فہم زبان کی بنیاد غالبؔ نے ڈالی اور پھر بعد کے لوگوں نے جس طرح سے اسے عروج بخشا،مولانا آزاد نے اپنے خطوط میں اس کو آگے بڑھایا ہے۔

سجاد ظہیر سے کون واقف نہیں،ترقی پسند تحریک کے بانی کے طور پر آپ کی خدمات کا کوئی ثانی نہیں ہے۔سجاد ظہیر کی پوری زندگی جہد مسلسل اور قربانیوں کا نمونہ رہی ہے انہوں نے تحریک کے لیے کیا کیا نہیں کیا۔کئی بار جیل گئے۔کافی طویل عرصے جیل میں رہے۔بیرونی ممالک کے سفر کیے۔رسائل و اخبارات جاری کیے۔اپنے ساتھیوں میں کامریڈ بنے بھائی کے نام سے مشہور تھے۔آپ نے عارف نقوی کے نام کئی خطوط لکھے ہیں۔یہاں ان کا ایک خط نقل کر رہا ہوں۔خط کافی دلچسپ اور مزے دار ہے ساتھ ہی سجاد ظہیر اور عارف نقوی کی ذاتی زندگی کے کئی در وا کرتا ہے۔

عوامی دور (ہفتہ روز)

7/4 آصف علی روڈ

9/دسمبر 1961ء

نئی دہلی

عزیزی عارف۔ہم سب تمھارے خط کے انتظار میں تھے۔آج پہلی بار تمھارا رقعہ ملا۔تم نے لکھا ہے کہ اس کے پہلے تم ایک خط بھیج چکے ہو۔مجھے یا کسی اور کو یہاں نہیں ملا۔تم نے اسے لکھ کر اپنی جیب میں ڈال لیا ہوگا۔

اور اس خط سے کچھ بھی تو معلوم نہیں ہوتا،نہ تمھارے سفر کا حال،نہ یہ کہ برلن پہنچ کر تم پر کیا کیا گذری،نہ یہ کہ وہاں تمھارے رہنے سہنے اور تعلیم کا کیا انتظام ہوا۔خطوں پر ٹھیک سے ٹکٹ لگاؤ،ٹھیک سے پتا

لکھو، اور خود پوسٹ کرو۔

عوامی دور کا کام بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ دو ہفتے سے ہم لوگوں نے آٹھ آٹھ صفحوں کے ضمیمے جاری کئے ہیں۔ پہلے تو عباس کا طویل افسانہ تھا، جو آگرہ میں انھوں نے پڑھا تھا۔ پھر اس بار اجے کا ایک لمبا مضمون ہے۔

بھئی عوامی دور ایر میل سے بھیجنے میں بہت رقم خرچ ہو جاتی ہے۔ اور نہ اسد نے نہ آپ نے خریداری اور ایر میل کی رقم بھیجنے کی بات کی ہے۔

تمھارا ابنّے

اردو مکتوب نگاری کا سفر راجہ رام موہن رائے سے غالبؔ، پھر اقبال، منٹو، ابوالکلام آزاد اور سجاد ظہیر تک آتے آتے عروج تک آ پہنچا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو مکتوب نگاری کے ارتقا میں متعدد مکتوب نگار نے اپنے کارہائے نمایاں سے اسے ہر طرح مضبوط و مستحکم کیا ہے۔ لیکن جو کام غالبؔ نے کیا وہ بے مثل ہے۔ آج بھی مکتوب نگاری کے تعلق سے جتنا کام، ترتیب و تدوین، سمینار وغیرہ کا انعقاد عمل میں آتا ہے اس میں کثرت غالبؔ پر ہونے والے کاموں کی ہی ہے۔

مکتوب نگاری کا زوال

اکیسویں صدی میں انفارمیشن ٹکنالوجی نے جس برق رفتاری سے ترقی کی ہے اور پوری دنیا کو اپنی مٹھی میں قید کیا ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ نئی صدی، نئی ٹکنالوجی اور نئے موضوعات نے ہماری زندگی کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی متاثر کیا ہے۔ ادب کی صورت تبدیل ہوئی ہے۔ نئے اور انوکھے موضوعات بعض ایسے موضوعات بھی جن کے بارے میں کبھی سوچا نہیں تھا، آج ہمارے سامنے

ہیں۔اکیسویں صدی سے قبل سائبر اسپیس، سائبر کرائم، سوشل میڈیا وغیرہ کے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔آج بڑے بڑے کارنامے، کرائم اور نت نئی چیزیں سوشل میڈیا اور سائبر میڈیا سے سامنے آرہی ہیں۔رابطے کے نہ صرف ذرائع بدل گئے ہیں بلکہ انتظار کے لمحات ختم سے ہوگئے ہیں۔اب طویل محبت ناموں اور اُن کے جوابات کا انتظار نہیں ہوتا۔اب چھوٹی بڑی باتیں، انتہائی رازدارانہ طریقے سے ایک دوسرے تک پہنچ جاتی ہیں۔آج کے زمانے میں ای میل، وہاٹس ایپ، فیس بک وغیرہ کے ذریعہ نہ صرف خط بلکہ تصاویر اور آواز سب سکنڈوں میں ایک دوسرے تک پہنچ جاتی ہیں۔ایسے میں جہاں ہم نے بہت ترقی کی ہے وہیں ہماری کچھ خوبصورت عادتوں، روایتوں اور محبت کے طور طریقوں کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔اب خطوط لکھنے کا سلسلہ کم ہوتے ہوتے آفس کے کام کاج تک سمٹ کر رہ گیا۔شارٹ ہینڈ کا زمانہ تو کب کا جاچکا لیکن اختصار نویسی، مخفف اور ابتدائی حروف، اختتامی حروف، نشانات، اعداد، اشیا کی تصاویر وغیرہ ایسے اشارے کنایے بن گئے ہیں کہ اب لمبی لمبی باتیں، طویل گفتگو، لمبے جملے وغیرہ یہ سب گئے وقتوں کی باتیں ہوگئی ہیں۔آج ہر آدمی گھوڑے کی پیٹھ پر سوار، اُلٹے سیدھے، قواعد کی درستگی جیسی صفات سے خالی جملے فخریہ استعمال کر رہا ہے۔ایسے میں جہاں ہماری بہت سی اصناف میں تبدیلیاں آئی ہیں، وہیں کچھ نے بالکل دم توڑ دیا ہے۔کچھ تغیر وتبدل کے شانوں پر سوار خود کو نئے ماحول میں ڈھالنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔کچھ خاتمے کے قریب ہیں۔اکیسویں صدی میں تغیر وتبدل اور تکنیک کے طوفان سے خود کو محفوظ نہ کر پانے والی اصناف میں سب سے زیادہ خطرناک عہد سے گزرنے والی صنف مکتوب نگاری ہے۔بیچارے غالبؔ کو کیا پتا تھا کہ وہ جس صنف کو ثقیل عبارت، فارسی زدگی، طول طویل القابات سے نکال کر بے تکلّفی، برجستگی اور مکالمے کی فضا تک لے آئے ہیں، وہ ایک-ڈیڑھ صدی کے اندر، قریب المرگ ہوجائے گی۔اب خط لکھنے کی زحمت کون کرتا ہے اور ایسا کرے بھی کیوں؟ خط سے خیریت کا ہی تو تبادلہ ہوتا تھا۔اب یہ سارے کام ای-میل اور فیس بُک، وہاٹس ایپ اور دوسرے میڈیا انجام دیتے ہیں۔ہم سب نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ مکتوب نگاری کا پورا نظام ہی مفت (Free) ہوجائے گا۔

لفافے، پوسٹ کارڈ، ان لینڈ لیٹر، ایئرمیل، ٹکٹ، تار وغیرہ کی ضرورت ہی ختم ہو جائے گی۔ ایسے میں خطوط کے تعلق سے کوئی بات کرنا کیسا عجیب لگتا ہے۔ غالبؔ، سرسیّد، شبلی، مہدی افادی، اقبال، ابوالکلام کے بعد بھی مکتوب نگاری سجاد ظہیر، منٹو، علی سردار جعفری، قمر رئیس، مجروح رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، رالف رسل، محمد حسن، شارب ردولوی اور عارف نقوی کے یہاں بھی ایک مستحکم روایت کے طور پر نظر آتی ہے۔ بعد میں بیسویں صدی کے اواخر اور کچھ اکیسویں صدی کے اوائل تک خطوط کے باقیات ملتے ہیں۔ لیکن اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اب بہت ضروری کام سے ہی خط تحریر ہوتے ہیں۔ باقی زیادہ تر کام اب موبائل سے ہونے لگے ہیں اور سوشل میڈیا آدھے ادھورے جملوں کے ساتھ پوری تصویر ہمارے سامنے کر دیتا ہے۔ زمانہ تصویر اور آواز کا ہے اور اب تحریر قصّۂ پارینہ ہوئی جاتی ہے۔

بشیرالدین احمد کی ادبی خدمات

اردو میں مغلوں کے آخری زمانہ تک مکتوبات میں فارسی کا استعمال ہوتا تھا۔ اردو میں اس کا آغاز غالب کے رقعات سے ہوتا ہے۔ غالب بھی پہلے فارسی میں ہی خطوط لکھا کرتے تھے لیکن جب وہ عمر کے آخر حصہ میں پہنچے تو انھوں نے اپنے احباب کو اردو میں خط لکھنا شروع کیا مگر اپنی جدت طبع سے اس میں بھی انھوں نے الگ راہ نکالی۔ ان کے انداز مکتوب نگاری میں جہاں سلاست و روانی پائی جاتی ہے وہیں شوخی کی جلوہ آرائی بھی ملتی ہے۔ ہر چند غالب، غلام غوث بے خبر، حاتم علی مہر، وغیرہ نے اردو میں خطوط نگاری کو عام کیا لیکن اس عہد میں انشاء کی جتنی کتابیں تھیں ان میں زیادہ تر فارسی انشاء پردازی کے نمونے تھے۔ چنانچہ مدارس میں انشائے مادھورام، انشائے خلیفہ وغیرہ داخل نصاب تھیں۔ رفتہ رفتہ رواج کے تحت انشاء نگاری کی کتب اردو میں بھی لکھی جانے لگیں تا کہ مبتدیوں کو خطوط نگاری اور دستاویز وغیرہ لکھنے کی تربیت دی جا سکے۔ ان کے بعد مکتوب نویسی ایک صنف بن گئی۔ جس میں نیاز فتح پوری، رشید احمد صدیقی، مولانا ابوالکلام آزاد، مہدی افادی وغیرہ نے مکتوب نگاری کے فن کو انشائیے میں تبدیل کر دیا۔

اس ذیل میں بشیرالدین احمد نے بھی ''انشائیۂ بشیر'' لکھ کر فن مکتوب نگاری کی روایت کو باقی رکھنے کی کوشش کی۔ ''انشائیۂ بشیر'' ۳۳۲ صفحات کو محیط ہے جس میں علاوہ بشیرالدین احمد کے خطوط کے کئی خواتین کے مکاتیب اور شامل ہیں جن میں شہزادی بیگم، حامدہ بیگم، نجمہ عباس بیگم، صفرا بیگم، قیصری بیگم، محمدی بیگم، وغیرہ کے علاوہ ان کے اس دور کے کچھ اور صاحب طرز ادیبوں کے مکاتیب بھی بطور نمونہ شامل کیے ہیں تا کہ طلباء و طالبات کو ان کے مطالعے سے استفادہ حاصل ہو۔ انھیں خط نگاری کا فن آ جائے۔ کتاب کے شروع میں انتساب اور دیباچے کے بعد بشیرالدین احمد نے آداب مکتوب نگاری کے ذیل میں مندرجہ ذیل عنوانات قائم کیے ہیں اور ان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ مثلاً آداب خطوط نویسی، رسم الخط، خوش خطی وغیرہ۔

ڈاکٹر ہما مسعود، صدر شعبۂ اردو، اسمٰعیل نیشنل مہیلا پی. جی کالج، میرٹھ

دیباچے میں جہاں بشیر الدین احمد نے خطوط نویسی کے آداب سے بحث کی ہے وہاں ضرورت سے کچھ زیادہ اشعار شامل کر کے تفصیل سے کام لیا ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

''المکتوب نصف الملاقاۃ'' عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے یعنی خط کیا ہے۔ گویا آدھی ملاقات ہے.....خط و کتابت دو اجنبیوں میں ایک مستحکم سلسلہ اتحاد وارتباط ہے۔ مراسلت میں دہرا لطف ہے۔ لکھنے والا اس خوشی سے مسرور ہے کہ جس کو ہم خط لکھ رہے ہیں اور جو چشمِ ظاہر سے اوجھل اور دور ہے گویا ہم اس سے باتیں کر رہے ہیں.....اور وہاں کی سنئے جہاں خط پہنچتا ہے۔ وہ بھی دو قدم آگے بڑھ کے بخندہ پیشانی خط کو لپک کر لیتا ہے۔ کبھی بوسہ دیتا ہے کبھی آنکھوں سے لگاتا ہے۔''

(انشائے بشیر۔ص ۱-۲)

اس کے بعد انہوں نے بتایا ہے کہ مردوں اور عورتوں کے لیے فن مکتوب نگاری سے واقفیت کتنی ضروری ہے۔ پھر آداب مکتوب نگاری کے ارتقاء کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

''سب سے پہلے پہل انشاء مولوی سید احمد صاحب دہلوی کی لکھی ہوئی ہے.....دوسری انشاء مولوی راشد صاحب الخیری کی ہے اور تیسری عورتوں کی انشاء صفدر صاحب کی بیگم کی ہے جو لکھنوی ہیں اور ..... جہاں کی زبان اردو ٹھیٹ اردو اور ٹکسالی مستند، بامحاورہ، فصیح اور ستھری مانی جاتی ہے۔''

(انشائے بشیر، ص ۵)

کتاب کا دیباچہ دسمبر ۱۹۲۴ء کا لکھا ہوا ہے۔ کتاب بھی غالباً اسی سن میں شائع ہوئی ہے۔

آداب خطوط نویسی کے ذیل میں بشیر الدین احمد نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ استفادے سے خالی نہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے موضوع سے متعلق تمام معلومات نہایت سادہ اور دلکش انداز میں لکھی ہیں۔

''خط کے مضمون کی بڑی عمدگی یہ ہے کہ اس میں تصنع نہ ہو۔ یعنی آمد ہو آورد نہ ہو.....خط پڑھیں تو یہ معلوم ہو کہ ہم خط لکھنے والے سے باتیں کر رہے ہیں.....نہ یہ کہ انشاء کی کوئی دقیق کتاب پڑھ رہے ہیں .....سیدھے سادے القاب کے معمولی آداب و تسلیم جو مناسب حال ہو میں کافی ہے.....القاب قریب قریب ویسے ہی ہونے چاہئیں جس طرح کہ ہم بات چیت میں مخاطب کر کے بولتے ہیں۔ زیادہ فصاحت بلاغت کو کام میں لانا سادگی اور خلوص کو کھو کر بناوٹ کا رنگ چڑھا دیتا ہے.....چھوٹے اور سادے سودے القاب اور مختصر سے آداب سلام یا دعا کے بعد بلا لمبی چوڑی تمہید کی بھرتی کے، اصل مطلب اور سلاست کو مد نظر رکھنا ہی مراسلت کا سب سے بہتر طریقہ ہے.....سطریں سیدھی اور خط ایسا صاف ہو جانا چاہیے کہ دوسرا بلا تکلف اور بآسانی پڑھ سکے۔ گھچ پچ اور گھسیٹ خط دیکھنے میں برا اور لکھنے والے کی بد سلیقگی اور جلد بازی کو ظاہر کرتا ہے.....سطروں کے بیچ میں فصل کافی اور یکساں ہونا چاہیے.....لفظ کھلے ہوں کہ ایک پر دوسرا حرف نہ چڑھ جائے.....اگر ایک آدھ غلطی ہو جائے تو اسے قلم زن کر دو۔ کاٹنے کے لیے سیدھی لکیر کافی ہے۔ اسے بار بار کاٹ کر بھدا اور گنجلک نہ کرو.....خط کے خاتمہ پر سلاموں اور دعاؤں کی بھرمار

بدنما ہے.....خط تمام کرنے پر بڑوں کو زیادہ حد ادب
برابر والوں کو والسلام چھوٹوں کو والدعا لکھنے کا اچھا طریقہ
ہے..... پھر فقط یعنی ختم .....لکھ کر اپنا نام بالکل صاف
صاف لکھو.....جب ایک دفعہ خط کو ختم کرلو تو.....مکرر، سہ
کرّر کا لکھنا غلط ہے.....اللہ تکملہ یا ضمیمہ لکھیں تو معناً صحیح
ہے۔ خط کے کاغذ کے شروع ہی میں بائیں طرف ہر خط میں
ہر مرتبہ اپنا پورا پتہ یعنی شہر کا نام اور محلّہ۔ دوسری سطر میں تاریخ
مہینا اور سنہ یاد کر کے لکھو.....خط کی پیشانی پر اپنا پتہ لکھ دینا
کافی ہے.....‘‘

(انشائے بشیر، ص۱۲-۱۸)

اس کے علاوہ انھوں نے ڈاک خانے، ریلوے وغیرہ کے سلسلے میں معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ پھر صفحہ ۶۸ سے لے کر ۳۲۳ تک ہر موضوع سے متعلق خطوط کے نمونے پیش کیے ہیں۔ آخری حصّہ میں چند پارہ ہائے عبارت بعنوان خاتمہ لکھے ہیں۔ ذیل میں چند خطوط کے نمونے دیکھیے تا کہ اندازہ ہو سکے کہ انھوں نے کس کو خط لکھے ہیں اور کس کے لکھے ہوئے ہیں اور ان کا معیار خطوط نویسی کیا ہے۔

’’ہمشیرہ مرحومہ سے خطاب‘‘

’’آپا وحیدہ! جب تم انتقال کر گئیں تو میں نے خیال کیا کہ
آفتاب بھی ضرور مر جائے گا۔ رات کو آسمان پر ضیائے منتشر
کے پارہ ہائے منور، چمکتے تارے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں
بند کر لیں گے، چاند کملا کر نیلے آسمان پر اندھیرے کا نقاب

ڈال دے گا۔ پھول پتے مرجھا جائیں گے۔ زمین پژمردہ و پریشان حال ہو جائے گی۔ سطح ارضی پر مسرت اور خوش نمائی اور ان کے متعلقات کا نام ونشان نہ رہے گا۔ تمام روشنیاں گل ہو جائیں گی اور سیاہی کی پریشاں لٹیں تمام دنیا کے چہرے پر بکھر جائیں گی۔ کل عالم کا چہرہ میرے چہرے کی طرح تاریک ہو جائے گا۔ آہ میرے خیال غلط نکلے! سورج اپنی عالم افروز چمک کے ساتھ پھر اس طرح طلوع ہوا۔ تاروں نے بھی جاگ کر اپنی روشن آنکھیں پھر کھول دیں۔ چانداس اطمینان و بشاشت کے ساتھ بلند ہوتا ہوتا سر کے اوپر آ گیا اور جب میں نے ہوا کے جھونکوں کو نکہت گل سے لدا ہوا دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ بس میرا ہی دل تھا، جو مردہ ہو گیا تھا!! امتیاز۔

(نوشتہ امتیاز علی تاج صاحب) منقول از تہذیب نسواں ۲۲ ستمبر ۱۹۱۷ء۔''

(انشائے بشیر، ص ۱۱۶-۱۱۷)

''چھوٹی نند کا خط بڑی بھاوج کے نام

''جناب بھابھی جان صاحبہ، تسلیم آپ کا خط مورخہ ۲۴ اکتوبر بروز شنبہ دو بجے دن کے پہنچا۔ پڑھ کر اطمینان اور خوشی حاصل ہوئی۔ ایک عرصے سے آپ کی خیریت نہ معلوم ہونے سے بے حد بے چینی اور طبیعت متفکر تھی۔ بے شک دہلی میں بھی سیلاب سے جانوں کا زیادہ نقصان ہوا۔ قرب و جوار کی آبادیاں نیست و نابود ہو گئیں۔ بارش کیا تھی ایک طوفان تھا کسی کو زندہ رہنے کی امید نہ تھی۔ رسیدہ بود بلائے۔ ولے بخیر گزشت.....''

(انشائے بشیر،ص۲۳۱،۲۳۲،۲۳۴)

(نوشتہ صفیہ بیگم (دختر خورد مصنف)

''بہو کا خط ساس کے نام۔معظّمہ مکرمہ جناب والدہ صاحبہ دام ظلہا

''.....اگر رشوت بری چیز نہ ہوتی، تو مسلمانوں کو اس کو لینے سے کیوں منع کیا جاتا، ان کے دل پر بھی میری بات کا اثر تو ضرور ہوتا ہے۔مگر اماں جان کیا کیا جائے۔ماتحت لوگ خود رغبت دلا کر ابھارتے ہیں۔ آپ اطمینان فرمائیں۔آئندہ سے انشاء اللہ میں اس کی بہت روک تھام کروں گی ۔ہم لوگ بھی عنقریب قدم بوسی کو حاضر ہونے والے ہیں۔ یہاں سب دست بستہ آداب عرض کرتے ہیں اور بچے آپ کے دیدار کے واسطے بے قرار ہیں۔آپ کی کنیز سلیمہ۔

(نوشتہ محمدی بیگم صاحبہ از خیر حیدر آباد دکن)''

''ماں کا خط اپنے بیٹے خالد کے نام

''اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آگاہ ہو تم پہلے اسلام کی سنت سے
دیتی ہوں دعا ہوں دعا خالد! پھر فرط محبت سے
مقبول دعائیں ہوں سب دور بلائیں ہوں
لے آئے خدا تم کو اب خیر سے عزت سے
رحمت کا رہے سایہ بڑھتا ہی رہے پایہ

ہر وقت خدا رکھے آسائش و صحت سے
صحت بھی ہو عزت بھی، ہو دین بھی دولت بھی
سیرت ہے بہت اچھی ظاہر ہو یہ صورت سے
راضی ہو خدا تم سے شیطاں ہو جدا تم سے
لبریز رہے سینہ ایمان کی دولت سے

.....

اب دیر ہوئی خالد جاتی ہوں خدا حافظ
وقت آ گیا مغرب کا، کیوں تکتے ہو حیرت سے
سن میری دعا باری، ہے فیض ترا جاری
یہ ختم ہوا نامہ تیری ہی عنایت سے

(بیگم محمد علی خاں صاحب آف مالیر کوٹلہ منقول از تہذیب النسواں ۱۰ رمئی ۱۹۲۴ء)''

''انشائے بشیر'' میں بیس خط ''نوشتۂ بشیر'' کے عنوان سے پیش کیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ خطوط بشیرالدین احمد نے ''اقبال دلہن''، ''اصلاح معیشت''، ''لخت جگر''، سے لے کر مفید اضافے کی غرض سے ''انشائے بشیر'' میں شامل کیے ہیں۔ ان خطوط میں خانگی مسائل، تعلیم و تربیت، اخلاقی تعلیم، اصلاحی مقاصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ خطوط کو اصلاح وہدایت کا ذریعہ بنایا ہے۔ خط نمبر ۹۳ میں انہوں نے تعمیر واصلاح کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے وہ خطوط کے لیے نامناسب تھا۔ یہاں چند مثالیں پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

''ماں کا خط بیٹی کے نام''

.....

.....

پہلا فوٹو

درد دل پاس وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا
آدمیت ہے تو بنیاد ہے ہر خوبی کی
ہو نہ یہ بھی تو دھرا کیا ہے پھر انساں کے پاس
انسانیت بھی شرط ہے انساں کے لیے
صورت بری بشر کی ہو، سیرت بری نہ ہو

''یہ امر مسلمہ ہے کہ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جو اندھے میں فرق ہے وہی تفاوت خواندہ اور ناخواندہ میں ہے۔ میں کبھی بھی تعلیم نسواں کی مخالف نہیں بلکہ حامی ہوں اور دل سے حامی ہوں ۔مگر نئی روشنی کی تعلیم سے کان پکڑتی ہوں میری توبہ ہے۔ ہاں پرانی طرز وروش کی دل دادہ اور شیفتہ ہوں۔ یہ تصویر پرانی وضع کی بہو بیٹیوں کی ہے نہ وہ شوخ چشم اور دیدہ ہوائی ہیں کہ چیرو چار بگھارو پانچ۔ یہ شوخ وشنگ بیباک اور ضرورت سے زیادہ چالاک نہیں ان کو انگریزیت چھوئی تک بھی نہیں ۔ یہ وہ منہ ماری گھر کی چار دیواری میں قید ہیں۔ سیر سپاٹا ہوا خوری ان کے خواب وخیال میں بھی نہیں آتی۔ یہ اسیرانِ قفس طاقت اور پرواز نہیں رکھتیں۔ان کی تعلیم کل کائنات قرآن شریف۔ وہ بھی ناظرہ کچھ مذہبی رسالے جیسے راہِ نجات، مالابُد، بہت ہوا

تو اردو کی دو چار چھوٹی موٹی کتابیں اردو روانی سے پڑھ لینا ان کی معراج۔ٹوٹا پھوٹا غلط سلط ایسا اور اتنا لکھ لینا کہ جو اظہار مطلب کو کافی ہو۔انشاٗ پردازی لفاظی، جھوٹی قافیہ بندی سے نابلد محض، لیکن امور خانہ داری کی مشین اور گھر کے کام میں مشاق و تجربہ کار جن کو مثل تعلیم یافتہ لڑکیوں کے نہ گھر میں جھاڑو دینے سے عار نہ مسالا پیسنے اور برتن مانجھنے میں شرم۔باورچی خانہ اور پکانا ریندھنا ان کا اوڑھنا بچھونا۔بہ نام کی مس صاحب یا میم صاحب نہیں۔میم ضرور ہیں مگر کون سی میم جو کام میں ہے۔ یہ گھر کے کاروبار نہیں سمجھتیں۔نہ مجبوری اور مارے باندھے کرتی ہیں بلکہ اپنا فرض اولین سمجھ کر بہ طیب خاطر اور شوق سے بخندہ پیشانی اس کو سرانجام دیتی ہیں۔ ''

(انشائے بشیر،ص۲۸۰)

اس پہلے فوٹو کا شبانہ روز کا روزنامچہ بھی پیش کیا ہے۔اس کے بعد دوسرا فوٹو اس کے برعکس پیش کیا۔

''جو شکل ہے تری وہی اک شوخ کی ہے شکل
جو نام ہے ترا وہی اس کا بھی نام ہے
اپنے عیبوں پر نظر کر اپنے دل کو پاک کر،
کیا ہو اگر خلق میں تو پارسا مشہور ہے
سیرت نہیں ہے جس میں وہ صورت فضول ہے
جس گل میں بو نہیں ہے وہ کاغذ کا پھول ہے''

''ہاں تو ان لڑکیوں کی تصویر تو تم دیکھ چکیں جو تعلیم یافتہ (جس معنی میں آج کل یہ لفظ استعمال ہوتا ہے) نہیں کہی جا سکتیں۔ فی زمانہ تعلیم یافتہ وہی شمار کی جاتی ہیں جنہوں نے اسکولوں بلکہ کالجوں میں اعلیٰ درجے کی باقاعدہ تعلیم پائی ہے، اور دھڑا دھڑ ایف،اے اور بی،اے کی ڈگریاں لی ہیں.....اللہ اللہ! ان کا کیا کہنا وہ زمین پر قدم بھی بمشکل دھرتی ہیں۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ اسکولوں ہی کی نظر ہوا۔ شک نہیں کہ ان کی سوسائٹی اعلیٰ درجے کی ہے، جہاں ٹینس اور بیڈ منٹن کے گولے اچھلتے رہتے ہیں۔ جہاں بلا صبح و شام ہوا خوری کے صحت قائم نہیں رہ سکتی۔ جہاں نہانے، دھونے، بال بنانے سنوارنے کپڑے بدلنے سے ایک دم کی فرصت نہیں۔ جہاں پوڈروں کی تہ پہ تہ چہرے پر جمائی جاتی ہے، جہاں سینٹ کی شیشیاں لنڈھائی جاتی ہیں۔ جہاں کیونڈر کی بارش ہوتی ہے اور پومیڈ کی استر کاری۔ جہاں خالی آنکھوں سے بجز عینک کے دکھلائی نہیں دیتا۔ جہاں کلائی پر گھڑی باندھے تک بے کلی رہتی ہے جس پر گھڑی گھڑی نظر پڑتی ہے ۔ جہاں سارے زیور بالائے طاق رکھ کر صرف دل آویزے ہیں۔ گلا طوق و زنجیر سے آزاد ہے، ہار گلے کا ہار نہیں۔''

(انشائے بشیر، ص ۲۸۵)

خط کے آخر میں دوسرے فوٹو کا شبانہ روز کا روزنامہ پیش کیا ہے۔ میم کا رنگ ڈھنگ ان کا

انداز کھانے پینے سونے جاگنے کے اوقات غرض ہر چیز کا نقشہ تفصیل سے نمایاں کیا ہے۔اس کے علاوہ باپ کا خط بیٹی کے نام، بیوی کا شکایت آمیز خط میاں کے نام، باپ کا تعزیتی خط بیٹی کے نام، بیٹی کا جواب، سہیلی کا خط سہیلی کے نام، بڑی بہن کا خط چھوٹی بہن کے نام وغیرہ ایسے خطوط ہیں جو مختصر مقالات معلوم ہوتے ہیں۔کہیں مذہبی عقائد اور رسوم کا بیان ہے تو کہیں اخلاق و اعمال پر بحث کی ہے کہیں انگریزی تہذیب وتمدن کی تمام خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالی ہے۔موضوع سے متعلق ہر پہلو پر بڑی وضاحت و صراحت کے ساتھ بحث کی ہے۔جس سے یہ خطوط کافی طویل ہو گیے ہیں لیکن مکتوب نگاری کی شرائط پر پورے نہیں اترتے۔خطوط میں القاب وآداب کے رسمی انداز سے گریز کیا گیا ہے۔خطوط کے آخر میں کہیں دعا سلام کا التزام بھی ہے اور کہیں ان تکلفات کو ضروری نہیں سمجھا گیا۔

خطوط کا خاتمہ بے تکلفی سے ہوتا ہے۔اشعار کا استعمال بھی کرتے ہیں۔بشیر الدین احمد کے اسلوب میں کفایت الفاظ یا اختصار نظر نہیں آتا۔کچھ خطوط کو چھوڑ کر نفس مضمون کے اعتبار سے ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی کہ انہیں خط کہا جا سکے۔البتہ تحریر میں گفتگو کا بے تکلف انداز پایا جاتا ہے۔کہیں کہیں حاشیہ میں بعض تفصیلات پیش کی ہیں اور مشکل الفاظ کے معنی بھی دیے گیے ہیں۔خاتمہ کے عنوان سے انہیں انشائ لکھنے کا خیال کیونکر آیا اس پر روشنی ڈالی ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے۔

> ''اگر بہنیں میری مدد نہ کرتیں اور میرا ہاتھ نہ بٹاتیں تو کتاب اس قدر جلد اور ایسی جیسی کہ اب ہے تیار نہ ہوتی اور اگر ہوتی تو صرف میرے خیالات اور میری زباں ہوتی، رہی یہ انشا خود عورتوں کی زبان ہے انہیں کے خیالات ہیں اور یہی اس میں جدت اور ندرت ہے۔''

(انشاے بشیر، ص ۳۲۴)

جہاں تک خطوط کی زبان کا تعلق ہے بشیر الدین احمد نے کچھ تبدیلیاں البتہ کی ہیں۔بقول ان

کے ۔

''اس انشا میں کوشش اس بات کی گئی ہے کہ دہلی کی مستورات
کی خاص زبان ہو جو اردو معلیٰ کہلانے کی مستحق ہو۔''

(انشائے بشیر، ص ۳۲۵)

اس لیے انہوں نے کچھ تبدیلیاں تو ضرور کی ہیں مگر کم۔

''جہاں ضرورت تھی کچھ گھٹا بڑھا دیا ہے مگر وہ بہت کم۔ دہلی کی
زبان اور محاورات سے جہاں قدم ڈگمگایا وہیں میں نے کچھ
سہارا لگا دیا ہے۔
اردو زباں ہوگئی ہندوستاں میں مسخ وہ بات وہ محاورہ وہ گفتگو
نہیں متروک لہجہ فصحا و ثقات ہے معنی وہ ہیں کہ جس میں
نزاکت کی بو نہیں۔''

(انشائے بشیر، ص ۳۲۴)

چنانچہ زبان، خیالات، طرز ادا کے لحاظ سے ''انشاے بشیر'' مستورات کے شایان شان بھی ہے۔ مضامین کارآمد اور زبان صاف ستھری پاکیزہ اور شستہ ہے۔ بشیر الدین احمد کے بیٹے مولوی منذر احمد نے قطعہ تاریخ لکھا ہے۔

میرے والد بشیرالدین احمد نے
خوب لکھی کتاب کیا کہنا
جس کو ہو شوق، شوق سے دیکھے
چشمہ علم و فیض کا بہنا
لڑکیوں کے لیے ہے یہ انشا

خوب صورت بنا بنایا گہنا
یہ نصائح کا خوب زیور ہے
بن گئی وہ کہ جس نے یہ پہنا
چن لیں اس میں سے گل نصیحت کے
جس کی تقدیر کا جو ہو لہنا
پلے باندھیں نصیحتیں جس نے
رنج و غم اس کو پھر نہیں سہنا
جھولا جھولیں ذرا بڑھائیں پینگ
شجر علم کا یہ ہے ٹہنا
رہ رو جادۂ حصول علم
کے لیے ہے یہ راستہ دھنا
سال تصنیف عیسوی چوبیس
آپ کو یاد چاہئے رہنا
منذر احمد کی نظم کی تعریف
بس یہی ہے کہ واہ کیا کہنا

راشد الخیری اپنی تقریظ میں ''انشائے بشیر'' سے متعلق اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں۔

''اس وقت تعلیم نسواں کے سلسلے میں گنتی کے چند افراد جو کام کر رہے ہیں اور ان ہی حضرات میں مولانا کا اسم گرامی ہے اور میں یہ کہنے میں یقیناً حق بجانب ہوں گا کہ دور حاضر میں ان مصنفین میں جن کی

خدمات تعلیم نسواں تک محدود ہیں۔ اخی مکرم کی خدمات کسی سے کم نہیں۔ یہ انشا جو اس وقت میرے سامنے ہے۔ برادر محترم کی تازہ تصنیف ہے اور میں نے لڑکیوں کے واسطے پہلی انشا مولوی سید احمد صاحب کی دیکھی جواب ناپید ہے اس کے بعد شاید دو یا تین اور لکھی گئیں۔ مگر اس انشائ میں منجملہ دیگر خوبیوں کے ایک خصوصیت جو اس کو ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ جو ہدایتیں لڑکیوں کو کی گئی ہیں وہ کسی اور میں نہیں۔ مجھے امید و یقین ہے کہ دنیائے نسواں اس قابل قدر انشائ سے پوری طرح مستفید ہوگی۔''

(انشائے بشیر۔ص۳۲۶۔تقریظ مولوی راشد الخیری، ۲۴ر نومبر ۱۹۲۴ء دہلی)

آداب خطوط نویسی کی ایک اہم شرط یہ ہے کہ خطوط واقعی لکھے گئے ہوں اور ان میں بے تکلفی کی شان نظر آئے۔ بشیر الدین احمد نے ایسے خطوط شائع نہیں کیے جو واقعی خطوط ہوں۔ ان میں سے بیشتر انشائیے ہیں جو مختلف رسالوں سے نقل کیے گیے ہیں۔ جہاں تک ان کے ادبی ہونے کا سوال ہے وہ یقیناً ادبی شاہ کار ہیں اور بچیوں کے لیے اخلاقیات کا اچھا درس ہیں جن کے مطالعہ سے انہیں کسی حد تک خطوط نویسی بھی آسکتی ہے اور ان میں پاکیزہ خیالی بھی پیدا ہوسکتی ہے۔ منظوم خط بھی بڑے طویل ہیں جو اپنی جگہ مختصر مثنویاں ہیں۔ ایسے خطوط کون کسی کو لکھتا ہے حالانکہ بشیر الدین احمد سے پہلے غالب اور چند دوسرے ادیبوں کے مکتوبات شائع ہو چکے تھے اور بشیر الدین احمد انہیں سامنے رکھ کر خطوط لکھ سکتے تھے یا دوسروں سے لکھوا سکتے تھے لیکن انہوں نے اس بات کا لحاظ نہیں رکھا۔ وہ خود دیباچے میں لکھ چکے ہیں کہ خطوط کو واقعی خطوط ہونا چاہیے۔ پھر بھی ان مکتوبات کے

مطالعہ سے ہماری بچیوں کو آداب خطوط نویسی کی شرائط کا علم ہوسکتا ہے اور وہ دیے ہوئے مکتوبات کی عبارت سے لطف اندوز ہوسکتی ہیں۔

مولانا محمد علی جوہرؔ کی خطوط نگاری

ہندوستان کے عظیم مجاہد آزادی، ہر دل عزیز لیڈر، اردو کے بے باک صحافی، پر جوش شاعر وشعلہ بیان مقرر کی شہرت، محبوبیت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی صدسالہ یوم پیدائش کے موقع پر حکومت ہند نے ان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی یاد میں ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔ مولانا محمد علی جوہرؔ 10/ دسمبر 1878ء کو رامپور کے ایک مشہور گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے خاندان کے افراد اہل سیف کے علاوہ اہل قلم بھی تھے اور ان کے خاندان کے چار افراد داغؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔ ملک اس وقت سماجی، سیاسی، معاشی، ادبی، لسانی اور نظریاتی نشیب وفراز کے دور سے گزر رہا تھا۔ عوام کے ذہنوں پر مایوسی ونا امیدی کا غلبہ تھا۔ سکوت دہلی کے بعد اہل فن وکمال لکھنؤ، حیدرآباد، الور اور رام پور جیسے شہروں کی جانب ہجرت کر گئے۔ داغؔ، امیرؔ اور تسلیم جیسے با کمال شاعر ریاست رام پور کی زینت بڑھا رہے تھے۔ رامپور میں جگہ جگہ مشاعرے ہوا کرتے تھے جہاں سے برابر واہ واہ، سبحان اللہ کی صدائیں سنائی دیتی تھیں۔ مولانا محمد علی کے گھر پر برابر مشاعرے ہوتے تھے اور وہ اس میں شریک ہوتے تھے۔ انہوں نے جب تخلیقی شعور کی دہلیز پر قدم رکھا تو شاعری کی دیوی کے قدموں میں سر جھکا دیا اور اپنا تخلص جوہرؔ رکھا۔ تعلیمی زندگی کے دوران ان کے سماجی، مذہبی، سیاسی اور قومی خیالات ونظریات میں پختگی آتی گئی۔ بعد ازاں انہوں نے اپنی تحریروں وتقریروں سے اپنے ہم وطنوں کے ذہنوں کو بیدار کرنے، جدوجہد کے راستے پر چلانے اور انگریزوں کی غلامی سے ملک کو آزاد کرانے کی پیہم کوشش کرتے رہے۔ جس کی پاداش میں برسوں انہیں جیل کی صعوبتوں کو برداشت کرنا پڑا اور ان کے اہل خانہ کو بہت سے مسائل ومصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ ہندوستان کے عظیم المرتبت مجاہد آزادی، اردو کے ممتاز صحافی، شاعر اور نقاد کی سماجی، مذہبی، سیاسی وادبی زندگی کے بوقلمونی جہات ان کے مکتوبات میں جا بجا اس بات کی

ڈاکٹر اعظم انصاری، اسسٹنٹ پروفیسر، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ

گواہی دیتے ہیں۔انہوں نے مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ڈاکٹر مختار انصاری، سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور دیگر اپنے عزیز و اقارب کو مختلف مواقع پر خطوط تحریر کئے ہیں۔ان کے خطوط کی تعداد زیادہ نہیں ہیں، لیکن ان کے خطوط مفصل ہوتے ہیں گویا ایک رسالہ کے مساوی الحجم اور ان کی روح کے ترجمان ہیں۔ان کے خطوط کے بارے میں عبدالماجد دریا آبادی 'خطوط مشاہیر' میں لکھتے ہیں کہ:

''خطوط اس مجموعہ میں تعداد میں زیادہ نہیں۔لیکن بعض بہت مفصل ہیں گویا ایک رسالہ کے مساوی الحجم۔اور محمد علی کی روح کے ترجمان سب کے سب ہیں۔محمد علی کے خطوط نویسی کا طریقہ بھی یہی تھا۔وہ خط زیادہ نہیں کم لکھتے۔زیادہ لکھنے کی انہیں فرصت ہی کب ملتی؟ لیکن جب لکھتے دل کھول کر رکھ دیتے دل کو بند رکھنا، زبان کو روک رکھنے کی طرح تو وہ جانتے ہی نہ تھے...ابتدا کے خطوط کیسی زندہ دلی، شگفتگی کے مرقع ہیں اور آخری خطوط کیسی اداسی اور مظلومیت کے خاکے، جلے ہوئے دل سے کچھ کلمات بعض معاصرین کے تند و تلخ اور ناملائم نکل گئے ہوں تو شاید زیادہ قابل ملامت نہ ہوں۔''

حوالہ 1، ص۔186-187

اسی طرح کے خیالات کا اظہار مولانا سید سلیمان ندوی سابق ناظم دارالمصنفین نے بھی کیا ہے کہ محمد علی جوہر لمبے لمبے خطوط لکھا کرتے تھے۔یہ خطوط ان کی وفات کے بعد معارف میں شائع ہوتے رہے، جس میں ان کے سیاسی خیالات کے علاوہ ان کے دینی، علمی اور ادبی نظریات کی گواہی دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کے معاصر سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:

''محمد علی مرحوم خط لکھنے اور جواب دینے میں بہت سست تھے وہ

ضروری خط کا جواب انتظار کا پورا وقت گزار کر آخری لمحہ میں دو
پیسے کے بجائے بارہ آنہ خرچ کر کے تار پر دیا کرتے اور اگر
جواب لکھنے بیٹھ گئے تو دوسطری جواب کے بجائے صفحوں میں
جا کر اس کو تمام کرتے۔''

حوالہ 2۔،ص۔462،معارف۔اعظم گڑھ, جون 1931ء

مولانا محمد علی جوہؔر کے ان خطوط کے ذریعہ ہم ان کی زندگی کے نشیب وفراز اور ان کے عزیز واقارب سے بخوبی واقف ہو سکتے ہیں۔

مولانا محمد علی جوہؔر کی سوانح اور ان کے ذریعہ لکھے گئے خطوط کے مطالعہ کے بعد یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ تعلیم یافتہ اور آسودہ حال خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ان کے خاندان کے افراد ریاست رامپور سے وابستہ پنج ہزاری منصب دار تھے۔گھر پر اہل فن وکمال کی محفلیں سجتی تھیں اور وہ اس میں برابر شریک ہوا کرتے تھے۔انہوں نے دس سال کی کم عمری میں موزوں شعر کہنا شروع کر دیا۔جوہؔر اپنے بڑے بھائی ذوالفقار علی خان گوہؔر کے ساتھ اردو کے مایہ ناز شاعر داغؔ دہلوی کے دولت کدہ پر جاتے تھے، جہاں برابر مشاعرے کی شمع روشن ہوا کرتی تھی جس میں کہنہ مشق اور نوآموز شاعر اپنا کلام پیش کرتے تھے۔انہوں نے عبدالماجد دریا آبادی کو 16 اگست 1916ء کو چھندراڑہ جیل سے ایک خط میں اپنے کلام موزوں کا مفصل تذکرہ کرتے ہیں۔اس سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں:

''آپ میری شاعری کا کیا پوچھتے ہیں۔بچپن میں تو بہت سے
سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں اس وقت زلف و ابرو کی
تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا۔رامپور میں اس زمانے
میں پیدا ہوا تھا۔ جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔داغؔ،امیؔر،
تسلیم ،عروؔج دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے

ستارے سب رامپور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔خود میرے خاندان میں شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغؔ کے شاگرد ہوئے،جن میں میرے ایک حقیقی بھائی ذوالفقار علی خان صاحب گوہرؔ اور میرے چچازاد بھائی اور خسر عظمت علی خان اور ان کے بھائی حافظ احمد علی خان صاحب شوق شامل تھے۔گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا.....اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار علی روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا اور مجھے بھی لے جاتے تھے۔داغ نے پہلے دن پوچھا کہو کچھ شعر یاد ہیں۔میری عمر بہت کم تھی۔مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دئے تھے۔جنہیں میں نہایت شان اور زور سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔میں نے داغ کے ہی چند شعر انہیں سنا دئے۔سن کر پھڑک گئے اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس بچے کو ضرور لایا کرو۔جناب والا اس کے بعد میں دعویٰ کروں کی شعر وسخن کی گود میں پلا ہوں تو بے جا نہ ہوگا۔مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔سنئے میں نہ صرف شعر وسخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں۔اس کو ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں۔کوئی بے ادبی و گستاخی باقی نہ رہی ہو۔جو میں نے شعر وسخن کی شان میں نہ کی ہو۔''

حوالہ 3،ص۔209-210

محمد علی کا گیارہ سال کی عمر میں علی گڑھ میں داخلہ ہو گیا تھا۔وہاں کی فضا ان کے لئے موزوں ثابت ہوئی اور وہ علامہ شبلی جیسے عظیم المرتبت استاد کے زیر سایہ تربیت پانے لگے۔۔محمد علی اپنے کورس کی

کتابوں سے کم دلچسپی دکھاتے بلکہ اعلیٰ درجہ کی کتابوں کا مطالعہ کے شوقین تھے، اسی میں محو ہو جاتے تھے ۔محمد علی کے بڑے بھائی ذوالفقار علی علامہ شبلی کے شاگرد تھے ۔ انہوں نے محمد علی کے کلام موزوں اور حافظے کی تعریف علامہ شبلی سے کی ۔علامہ شبلی نے ایک روز محمد علی کو بلوایا اور ان کا امتحان لیا جس میں وہ پوری طرح کامیاب رہے۔اس بات کا ذکر انہوں نے عبدالماجد صاحب کو لکھے گئے خط میں کیا ہے جس کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا مرحوم سے کیا۔دوسرے نے میرے حافظے کی تعریف کی کہ المامون میز پر رکھی تھی۔اٹھا کر پڑھنے لگا اور دوسرے دن میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے اس کا ایک شعر عربی کا پڑھا تو اس کا مجھے ترجمہ سنا دیا۔حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے ۔ پہلے مامون کے اولاد کی فہرست مانگی۔پھر اس کا حلیہ پوچھا۔جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرع طرح اسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر پوچ اسی وقت تیار ہو گئی ۔میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر تو جوسکہ بیٹھ گیا تھا۔وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔''

حوالہ۴۔ص۔211

جیسا کہ بالا سطور میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ محمد علی جوہر کتب بینی کے شوقین تھے۔مختلف موضوعات پر لکھی گئی کتابوں اور خاص کر مذہبی کتب کا مطالعہ ان کی روزمرہ کی زندگی میں شامل تھا۔وہ تخلیق کے ساتھ ہی ساتھ تحقیق میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔انگلینڈ میں دوران

تحقیقی مطالعہ نے،ان کے نظریات میں اور زیادہ وسعت اور پختگی پیدا کردی تھی ۔سید سلیمان ندوی کی کتاب 'ارض القرآن' جب زیور طبع سے آراستہ و پیراستہ ہوکر منظر عام پر آئی تو اس کی بہت پذیرائی ہوئی۔کتاب کی شہرت ومقبولیت کے چرچے سن کر مولانا محمد علی جوہؔر نے سید سلیمان ندوی کو خط لکھ کر اس کو پڑھنے کی خواہش ظاہر کی ۔سید سلیمان ندوی نے اس کی ایک کاپی محمد علی جوہؔر کو جیل میں مرحمت فرمائی۔ارض القرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد محمد علی جوہر نے سید سلیمان ندوی کو جو خط ارسال فرمایا ہے وہ تحقیقی وتنقیدی بصیرت کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اس کتاب کے متعلق محمد علی جوہر کا تنقیدی نقطہ نظر ملاحظہ ہو:

> ''اور انڈکس کیوں غائب ہے،مکرمی یورپ سے کم از کم انڈکس تو ضرور اخذ کر لینا چاہئے۔مجھے خود قرآن پاک کے انڈکس کی ضرورت ہوتی ہے تو انگریزی تراجم میں دیکھنا پڑتا ہے اس کمی کو ضرور پورا کیجئے۔''

بحوالہ ۵۔مقالات جوہر ص۔۴۹

اسی طرح سے جب عبدالماجد دریا آبادی کی انگریزی تصنیف 'سائیکالوجی آف لیڈرشپ' شائع ہوکر منظر عام پر آئی تو اس کی تشہیر کے اشتہار بھی شائع ہوئے اور ایک اشتہار عبدالماجد صاحب نے محمد علی کو جیل میں بھیجا تھا۔اس کتاب کے متعلق مختلف لوگوں کی آرا اخبار ورسائل کے ذریعہ محمد علی کو معلوم ہوتی رہتی تھیں۔اس کتاب کا تفصیلی جائزہ اینی بسنٹ کے اخبار 'نیو انڈیا' میں شائع ہوا تھا جس کی دانشور طبقہ میں خوب پذیرائی ہوئی تھی۔محمد علی جوہر 22/ مئی 1916 کو لکھے ایک خط میں عبدالماجد صاحب کو اس کتاب کی ایک کاپی بھیجنے کی درخواست کرتے ہیں۔محمد علی جوہر اس تخلیق کا بہت ہی گہرائی و گیرائی کے ساتھ اور تنقیدی نقطہ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں۔محمد علی جوہر مطالعہ کتب کے بعد،عبدالماجد صاحب کو ایک مکتوب ارسال کرتے ہیں جس میں اس تصنیف پر تنقیدی تبصرہ کرتے ہیں اور بلیغ مشوروں سے بھی نوازتے ہیں۔

وہ اپنے خط میں رقم کرتے ہیں۔

''مغز کے لحاظ سے میں سمجھتا ہوں کہ اجتماع سے تو آپ نے بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔لیکن ''قائدین'' (لیڈروں) ہیں اسی قدر اجمال سے کام لیا ہے۔یہ بالکل درست ہوتا کہ آپ اجتماع کی نفسیت پر بحث کر کے لیڈ روں کے متعلق ایک منفیانہ پہلو اختیار کرتے یہ کہ کر کہ اجتماع میں جن اوصاف کی کمی ہوتی ہے۔وہ اس کے افراد میں پوری طرح پائے جاتے ہیں۔لیکن یہ یاد رکھئے کہ جس عمومی حیثیت سے آپ اجتماعات پر بحث کر سکتے ہیں۔وہ اس کے لیڈروں کے لئے کافی نہیں، کتاب کی نظر ثانی کے وقت میں آپ سے بزور شفارش کرتا ہوں۔کہ لیڈروں کے متعلق اپنے اس تناسب کو بدل دیجئے۔کتاب کا یہ حصہ زیادہ تفصیل کا مستحق ہے۔اوراس حصے میں مزید شرح وبسط کی گنجائش نہیں۔ضرورت بھی ہے۔''

حوالہ 6۔ص۔193

اسی طرح کے خیلات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''یاد رہے کہ جب گھڑی ساز گھڑی کے کسی ٹوٹے ہوئے پرزے کو سنبھالنا چاہتا ہے تو خورد بینی شیشہ لگا لیتا ہے جس سے نقص اصلیت سے کہیں بڑا معلوم ہوتا ہے۔یہ اس غرض سے کہ باریک سے باریک نقص بھی صاف نظر آئے اور اصلاح کی جا سکے۔اچھے سے اچھا نقاد بھی اکثر اس غرض سے

مبالغہ سے کام لیتا ہے اور عوام سے کہیں زیادہ اسے 'لطیف' اور 'باریک بین' بننا پڑتا ہے۔ چونکہ غرض اصلاح ہے نہ کہ فساد۔ اس لئے یہ بال کی کھال نکالنا اس کے لئے جائز ہی نہیں سمجھنا چاہئے۔ بلکہ اس کے لئے اصرار کرنا چاہئے۔ اس وجہ سے میں نے بھی اس تنقید میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور مصر ہوں کہ آپ خود اس سے بھی زیادہ مبالغے سے کام لیں۔ جوہری جب سنگ تراشی میں مشغول ہوتا ہے تو زیادہ وقت اس کا اس تراش خراش میں صرف نہیں ہوتا جو عوام کو نظر آ سکے۔ بلکہ ایسی باریک اصلاح میں جس کا نظر آنا تقریباً نا ممکن ہے اور جو کچھ وہ گھنٹوں کی محنت میں تراشتا ہے وہ نہایت باریک خاک کے چند ذرّے ہوتے ہیں جو تراشتے تراشتے ہی ہوا لے اڑتی ہے۔''

حوالہ 7۔ص۔206

محمد علی کے مکتوبات میں جو اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے اس میں طنزیہ جملے جگہ جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ اپنی بات کو سادہ اسلوب اور جامع پیرائے میں بیان کرتے ہیں اور بات کو دلچسپ بنانے کے لئے متعدد جگہوں پر ضرب الامثال اور محاوروں (ساری خدائی ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف، ملا کی دوڑ مسجد تک، سونے پر سہاگہ) کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی کے الفاظ کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنی عبارتوں کی مرصع سازی کرتے ہیں مگر مرزا غالب اور مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح مسجع و مقفیٰ نگاری سے گریز کرتے ہیں۔ طرز بیان میں قرآن کی آیتوں اور اشعار کے علاوہ فارسی کے اشعار کو بھی موقع کی مناسبت سے پیش کرتے ہیں۔ جملوں میں کہیں کہیں عربی، فارسی کے ثقیل و متروک الفاظ کا عام قاری کے ذہن پر گراں گزرتا ہے۔ ان کے اسلوب بیان میں شوخی و ظرافت کے پہلو بھی نمایاں طور پر دکھائی

دیتے ہیں۔ان کے خطوط کی ایک خاص بات یہ ہے کہ جب وہ اپنے مکتوب الیہ کو خط لکھتے ہیں تو القاب وآداب اور سلام بندگی کے بعد خدا حافظ یا نیاز مند محمد علی لکھتے ہیں۔اور پھر اس کے بعد مکرر لکھ کر کئی کئی صفحے تحریر کرتے جاتے ہیں جس میں سماجی، سیاسی وادبی وغیرہ مسائل کا تذکرہ کرتے ہیں۔ عبدالماجد دریا آبادی کو 10/ نومبر 1916 کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں اپنی چھوٹی لڑکی کی تیمارداری ٹائیفائڈ میں حال ہی میں کر چکا تھا۔میری اہلیہ سخت علیل رہیں تو ان کی تیمارداری مجھ ہی کو کرنا پڑی۔ان امراض پیہم نے مجھے چھندواڑہ کی اچھی خاصی مس فلارنس نائٹ انگل بنا دیا تھا۔یہ تو امر مسلم ہے کہ ''ساری خدائی ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف'' اپنے سالے کی تیمارداری میں ایسا منہمک ہوگیا اور ایسا منہمک ہونا پڑا کہ آپ کو ایک کارڈ بھی اطلاعاً نہ لکھ سکا۔''

حوالہ۔8، ص۔222

محمد علی جوہر چھندواڑہ جیل کی نظر بندی کے دوران سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں کہ میں جیل سے آپ کی کتاب اور رسالہ کی قیمت ادا نہیں کر پا رہا ہوں۔جیل سے باہر آنے کے بعد اس کا زر مبادلہ ادا کر دونگا یعنی کامریڈ اور ہمدرد کو مفت بھیجوا کر اس کی بھر پائی پوری کر دونگا۔اس سلسلے میں ان کی شوخی تحریر ملاحظہ ہو:

''اس وقت تو یہ خیال ہے کہ اخباری اور علمی برادری کا اس زمانہ میں جس قدر ہو سکے کھاؤں، مگر جب اس نظر بندی سے چھوٹوں تو سب کو خوب کھلاؤں۔''

بحوالہ ۔9ص 53 مقالات یوم جوہر

محمد علی جوہرؔ کو بچپن سے ہی شعروشاعری سے لگاؤ تھا۔ گھر پر ہونے والے مشاعرے میں شرکت کرتے اور مشاعرے میں روشن ہونے والی شمع سے کلام موزوں کے لئے روشنی حاصل کرتے تھے۔ جب محمد علی کا داخلہ علی گڑھ میں ہو گیا تو دوران تعلیم وہ وہاں ہونے والے مشاعروں میں شامل ہوتے تھے ۔ یہاں ان کی ذہنی وتخلیقی ضیاء کو اور زیادہ پختگی و بالیدگی عطا ہوئی لیکن ان کے کلام کی لو مدھم تھی۔ حب وطن کی خاطر محمد علی نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور اس کے ذریعہ عوام کو انگریزوں کے ظلم وستم سے باخبر کرنے، ذہنوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ۔ خدام کعبہ کی تشکیل کی، گاندھی جی و دیگر رہنماؤں کے ساتھ مل کر پورے ملک میں خلافت تحریک چلائی۔ پہلی جنگ عظیم (جنگ بلقان) میں کھل کر ترکوں کی حمایت اور انگریزوں کی مخالفت کی ۔ جنگ بلقان کے متعلق اپنے رسالہ میں ایک مضمون شائع کیا، جس کو انگریزی سرکار نے نوٹس لیا اور سرکار کے خلاف مضمون لکھنے کی پاداش میں انہیں جیل میں ڈال دیا۔ محمد علی جوہرؔ نے جیل میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ قید و بند میں ان کے شعری جوہر کھلے۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ قید و بند کی یادگار ہیں جو پوری توانائی کے ساتھ اپنی ضیاء ہر سمت بکھیر رہے ہیں اور قاری کے اذہان وقلوب کو منور کر رہے ہیں ۔ محمد علی جوہرؔ کے اشعار ان کے دلی جذبات وکیفیات اور نفسیات کے آئینہ دار ہیں جس میں ان کی زندگی کے نشیب وفراز کو مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ محمد علی جوہرؔ خطوط میں اپنے رفقا کو تازہ کلام بھی بھیجتے رہتے تھے۔ ان کی بیشتر غزلیں اردو کے مشہور اساتذہ میرؔ، غالب، اقبالؔ، شیفتہؔ اور حالیؔ وغیرہ کی زمین پر ہوا کرتی تھیں۔ اس بات کے شواہد ان کے خطوط میں جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔

عبدالماجد دریا آبادی کو چھندواڑہ سے 16/ اگست 1916 کو ایک خط میں پانچ تازہ غزلیں ارسال کرتے ہیں۔ مرزا غالبؔ کی غزل کا مصرعہ اولیٰ دیکھئے جس زمین میں محمد علی جوہرؔ نے غزل کہی ہے پیش خدمت ہے۔

مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور (غالبؔ)

یاد وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور
جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور

گر بوئے گل نہیں، نہ سہی، یاد گل تو ہے
صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور

شاید کی آج حسرت جوہرؔ نکل گئی
اک لاش تھی پڑی ہوئی گور و کفن سے دور

حوالہ 10۔ص 215

اسی طرح سے مولانا الطاف حسین حالیؔ کی غزل کا مصرعہ اولیٰ ملاحظہ فرمایئے اور اس کے بعد محمد علی جوہرؔ کی غزل دیکھئے جن کے چند اشعار ہر خاص و عام کی یادداشت میں محفوظ ہیں۔

شادی کے بعد غم ہے، فقیری غنا کے بعد (حالیؔ)

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

حوالہ۔11 ،ص۔217

اردو ادب کے آئینہ میں ہم جب محمد علی جوہر کی شخصیت کا عکس دیکھتے ہیں تو اس کا عکس عظیم مجاہد آزادی، قومی و مذہبی رہنما، نڈر صحافی، بلند پایہ شاعر، پر جوش خطیب جیسے مختلف جہات میں دیکھنے

کوملتا ہے۔وہ شخص غلام ملک میں ضرور پیدا ہوا تھا لیکن اس نے غلام ملک میں مرنا پسند نہیں کیا۔محمد علی جوہر گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے برطانیہ گئے تھے، وہیں ان کا انتقال ہوا۔ان کی تجہیز و تکفین بیت المقدس میں ہوئی۔اس بات کی شہادت ان کے اشعار سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے تقریباً تیس سال پہلے تخلیق کئے تھے۔

یوں بچ سکو مواخذہ حشر سے تو ہاں
مارا دیار غیر میں ہم کو وطن سے دور

ہے رشک ایک خلق کو جوہؔر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پرور دگار دے

کتابیات:

حوالہ 1۔خطوط مشاہیر۔عبدالماجد دریا آبادی (حصہ اول) مولانا محمد علی جوہر، مولانا اکبرالہ آبادی، مولانا شبلی نعمانی، نسیم بکڈ پو۔لاٹوس روڈ، لکھنؤ 1944ء

حوالہ 2۔ معارف۔اعظم گڑھ، جون 1931ء، ص۔462

حوالہ 3۔خطوط مشاہیر۔عبدالماجد دریا آبادی (حصہ اول) مولانا محمد علی جوہر، مولانا اکبرالہ آبادی، مولانا شبلی نعمانی، نسیم بکڈ پو۔لاٹوس روڈ، لکھنؤ 1944ء

حوالہ 4۔خطوط مشاہیر۔عبدالماجد دریا آبادی (حصہ اول) مولانا محمد علی جوہر، مولانا اکبرالہ آبادی، مولانا شبلی نعمانی، نسیم بکڈ پو۔لاٹوس روڈ، لکھنؤ 1944ء

بحوالہ 5 ۔مقالات جوہر۔اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔دوسرا ایڈیشن 2005ء

حوالہ 6۔خطوط مشاہیر۔عبدالماجد دریا آبادی (حصہ اول) مولانا محمد علی جوہر، مولانا اکبرالہ آبادی، مولانا شبلی نعمانی، نسیم بکڈ پو۔لاٹوس روڈ، لکھنؤ 1944ء

حوالہ 7 ۔خطوط مشاہیر۔عبدالماجد دریا آبادی (حصہ اول) مولانا محمد علی جوہر، مولانا اکبر الہ آبادی، مولانا شبلی نعمانی، نسیم بکڈپو۔لاٹوس روڈ، لکھنؤ 1944ء

حوالہ 8۔ خطوط مشاہیر۔عبدالماجد دریا آبادی (حصہ اول) مولانا محمد علی جوہر، مولانا اکبر الہ آبادی، مولانا شبلی نعمانی، نسیم بکڈپو۔لاٹوس روڈ، لکھنؤ 1944ء

بحوالہ 9 ۔مقالات یوم جوہر۔اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔دوسرا ایڈیشن 2005ء

حوالہ 10۔ خطوط مشاہیر۔عبدالماجد دریا آبادی (حصہ اول) مولانا محمد علی جوہر، مولانا اکبر الہ آبادی، مولانا شبلی نعمانی، نسیم بکڈپو۔لاٹوس روڈ، لکھنؤ 1944ء

حوالہ 11۔ خطوط مشاہیر۔عبدالماجد دریا آبادی (حصہ اول) مولانا محمد علی جوہر، مولانا اکبر الہ آبادی، مولانا شبلی نعمانی، نسیم بکڈپو۔لاٹوس روڈ، لکھنؤ 1944ء

صفیہ اختر کی مکتوب نگاری

اُردو ادب میں خط نویسی ایک مستقل صنف کی حیثیت رکھتی ہے۔ غالبؔ اقبالؔ، نیازؔ، مولانا عبدالماجد دریابادیؔ، سید سلیمان ندویؔ، جگرؔ اور کئی دوسرے نامور ادیبوں کے خطوط اپنے اندازِ بیان کی ندرت کی وجہ سے مقبول ہیں۔

صفیہ اختر جو اُردو کے مشہور شاعر اسرار الحق مجازؔ کی بہن اور جاں نثار اختر کی شریک حیات تھیں۔ اُنھیں اُردو مکتوب نگاری کی دنیا میں منفرد اور امتیازی مقام حاصل ہے۔ صفیہ اختر نے اپنے شوہر جاں نثار اخترؔ کو جو خطوط لکھے تھے، وہ ''زیرلب'' اور ''حرف آشنا'' نامی دو مجموعوں میں اکٹھا کئے گئے ہیں۔ یہ خطوط خانگی ہیں لیکن صفیہ اختر کے پُر اثر قلم اور دل کو چھو لینے والی جذبات نگاری نے انفرادی اور نجی چیزوں کو عام اور عالمگیر بنا دیا ہے، ان خطوط کو پڑھتے وقت دل کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔

صفیہ اختر کے ان خطوط میں ایک فراق زدہ، بے بس، بیمار، محبت کرنے والی، سماج سے ٹکرانے والی اور اپنے شوہر کو سہارا دینے والی عورت کی تصویر ملتی ہے۔ اسی بنا پر ان کے خطوط میں نہ مریضانہ ذہنیت ملتی ہے نہ قنوطیت کی پرچھائیں۔ بلکہ ہمت و جوش کی لہر فضا میں دوڑتی نظر آتی ہے۔ صفیہ کی شہرت ان خطوط کے علاوہ ان کے تنقیدی مضامین کی وجہ سے بھی ہے۔ ان مضامین اور خطوط میں زبان و بیان کے دلکش نمونے اور الفاظ کا ایسا عمدہ انتخاب بھی دیکھنے کو ملتا ہے، جس سے نثر میں شعریت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صفیہ اختر حسن تحریر سے بخوبی واقف تھیں۔ ان کی تحریر خصوصاً خطوط، تحریر کے حسن اور معمہ گیر تخیل سے معمور ہے۔ وہ اپنے خطوط میں ایک خاص فکری اور تصوراتی فضا پیدا کر دیتی ہیں۔ انکے تصورات حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں پر چھائے ہوئے ہیں۔ موسم، گرد و پیش کے حالات، خوشی و غم کے علاوہ موت و زندگی، زندگی کے مسائل، تنہائی کا کرب، زندگی کے تجربے، زندگی سے پیار اور جینے کی خواہش، غرض ہر پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے آگے بڑھتی ہیں۔ ان خطوط میں ان کا مطمحِ نگاہ رجائیت پسندانہ

ڈاکٹر صبیحہ سید، صدر شعبۂ اردو، نائٹ کالج آف آرٹس اینڈ کامرس، کولہاپور

رہا ہے۔

صفیہ اختر نے اپنے خطوط میں منظر نگاری سے بھر پور کام لیا ہے۔انہیں اپنے خیالات وجذبات کے اظہار میں اپنے تخیل کی جولانی دکھانے کا موقع مل جاتا ہے۔ان کے کئی خطوط میں منظر نگاری نظر آتی ہے۔ جب گذشتہ دن یاد آتے ہیں، تو ہر گذشتہ لمحہ اپنی دلفریبی کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔فکری عناصر ان خطوط کو انفرادیت بخشتے ہیں۔وہ منظر نگاری ضرور کرتی ہیں، لیکن جہاں بھی انھیں موقع ملتا ہے، ایسے جملے لکھ دیتی ہیں، جو غور وفکر پر مجبور کر دیتے ہیں۔مثلاً اپنے ایک خط میں جاں نثار اختر کو یوں مخاطب کرتی ہیں:

''میرے دل کی گرمی! میرے سینے کا گداز! میرے ذہن کی روشنی! میری کلائی کی مضبوطی!''

''یہ سب کچھ تمہاری زندگی کے راستے میں صرف ہوں گے۔ تمہاری زندگی کیلئے یہی کچھ ہے''

''میرے پاس ،اور پوری وفا داری کے ساتھ ہے یہ سب کچھ۔''

اسی خط کے آخر میں یوں رقم طراز ہیں:

''آؤ یہ نیا سال اس طرح شروع کرو کہ مجھ پر اعتماد پیدا کرو۔ اور خود پر بھی۔تمہارا حوصلہ دگنا ہو جائے گا۔تمہاری محبت کے لازوال سرچشمے اُبل پڑیں گے۔تم جاگ جاؤ گے اور میرا سال۔''

ایک اور خط کی منظر نگاری دیکھئے۔

''یہ دور عجیب خلفشار کا دور ہے۔ بقول شخصے ہر چہرے پر نا

آسودہ خوشیوں اور نامرادامنگوں کی کہانی لکھی ہوئی ہے۔دوست
اپنے گردوپیش نظر کرو۔''

ایک دوسری تحریر کی منظرنگاری دیکھئے۔

''خوش رہو، کھاؤ پیو۔ہنسواور بہت سا کام کرو۔اس یقین کے ساتھ
ایک گرم دل اور دو نازک دھڑکنیں تمہیں پیار، عزت فخر اور غرور سے
اپنا سمجھتے ہیں۔''

منظرنگاری میں جذباتی ہیجان کی کیفیت بھی دیکھئے،

''جس انداز سے تم مجھے بعض لمحوں میں پیار کرتے ہو، وہ سہا دینے
کیلئے کافی ہوتا ہے،
دوستو! میرے جسم میں تمہارے لئے کون سی انوکھی لذت رکھی ہوئی
ہے جس کے تم شیدائی بن سکو۔اور آج تو میں ہڈی کے ڈھانچے کے
سوا کچھ بھی نہیں۔البتہ میرا پیار، میری وفا، میری قدرشناسی اگر کچھ
بھی تم کو ذہنی تشفی بخش سکتی ہے تو یقین رکھو کہ اس سے تم میرے
مرتے دم تک محروم نہ رہو گے۔''

منظرنگاری کے پردہ میں رجائیت کا عنصر بھی دیکھئے۔

''میری جان! تم میری حالت تو آکر دیکھو۔میرا سارا جسم اکڑ کر رہ
گیا ہے، انگلیوں کا یہ حال ہے کہ قلم نہیں پکڑا جاتا۔''

صفیہ اختر کے یہاں تخیل کی بلند پردازی ہے۔وہ شاعرانہ اسلوب اختیار کرتی ہیں۔جذبات کی شدت ان کے شاعرانہ اسلوب میں داخل ہوجاتی ہے۔ان خطوط میں اسلوب کی لطافت سے زیادہ ان کے مافی الضمیر کی رومانیت متاثر کرتی ہے۔صفیہ اختر کے مکاتیب میں زندگی کے حسن وقبح دونوں پہلوؤں پر

روشنی پڑتی ہے۔انھوں نے غم کی تاریکی کا ذکر کرتے ہوئے اس کے خوشگوار پہلو کو دلنشیں انداز میں پیش کر کے حوصلہ مندی کے جذبہ کو ابھارا بھی ہے۔مثلاً اپنے ایک خط میں لکھتی ہیں:

''اختر! میں کبھی کبھی وہ محبت دے سکتی ہوں، جو بچے کو ماں
سے ملتی ہے، تاکہ وہ پروان چڑھ سکے۔''

مختصراً یہ کہ صفیہ اختر کے خطوط میں ان کی شخصیت جلوہ گر ہے۔ایسے خطوط کی اہمیت صرف اس وجہ سے نہیں ہوتی ہے کہ ان میں لکھنے والے کی شخصیت جلوہ گر رہتی ہے بلکہ اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اس میں عام خطوط کی طرح روح عصر ہی نہیں ہوتی بلکہ ابدیت بھی ہوتی ہے۔

صفیہ اختر کا اسلوب منفرد ہے۔تقلید نہ ہوتے ہوئے بھی اس میں تمام لطافتیں موجود ہیں۔انکے جملے صاف ستھرے اور رواں ہوتے ہیں۔ان کی زبان عربی وفارسی سے بوجھل نہیں ہے۔آسان سادہ وسلیس ہے۔لیکن چبھتے ہوئے جملے لکھنے میں انہیں یدطولیٰ حاصل ہے۔جس سے لطافت میں اور زیادہ اضافہ ہوجاتا ہے۔

صفیہ اختر کے خطوط انشا پردازی کا ایسا اعلیٰ نمونہ ہیں جس کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔غالب کے بعد خطوط محفوظ رکھنے اور ان کی اشاعت کا رواج عام ہوگیا۔مشہور اہل قلم کے خطوط کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔لیکن صفیہ اختر کے خطوط میں جو حسن اور بانکپن، اور ان کے اسلوب میں جو لطافت ہے وہ سب سے منفرد ہے۔صفیہ کے خطوط کا موازنہ غالبؔ کے خطوط سے نہیں کیا جاسکتا۔غالبؔ کا حلقۂ احباب وسیع اور ان کے شاگردوں کی تعداد زیادہ تھی۔ان کے خطوط میں علمی وادبی نکات بھی ہیں اور ان میں غالبؔ کی روزمرہ کی زندگی بھی نمایاں ہے۔صفیہ اختر کے خطوط کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے اور نہ ہی ان میں ان کی زندگی کی مکمل تصویر نظر آتی ہے۔لیکن انہوں نے اپنے خطوط میں زندگی کا ایک رجائی نکتۂ نظر پیش کیا ہے۔ایسی زندگی کا خواب دیکھا جو خوشیوں سے بھرپور ہو،غم واندوہ کے اظہار کیلئے انھوں نے جو اسلوب اختیار کیا ہے۔اس میں تصوراتی انداز

کی بھرپور نمائندگی ملتی ہے۔جس کی بنا پر یہ خطوط صفیہ اختر کے غم کے ترجمان بن گئے ہیں۔فکر یہ عنصر کی وجہ سے ان کا ذاتی غم کائنات پر چھا جاتا ہے۔کیونکہ ان کے خطوط میں حیات انسانی کے مختلف پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔کرشن چندر نے صفیہ اختر کے خطوط پر یوں اظہارِ خیال کیا ہے؛

''ان خطوں کے اندر ہی اندر مجھے اپنے پرانے کلچر کی دھیمی دھیمی رَو بہتی ہوئی ملتی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کالی داس کے میگھ دوت کا ہجر، اس کی تمنائے وصال ،اس کی محرومی ، اور ناکامی سینکڑوں برس کے بعد آج بھی زندہ ہے۔اور اسی طرح نازک دلوں کو گرماتی ہیں۔صفیہ کے خطوں میں مجھے نئی ہندوستانی عورت کی جھلک نظر آتی ہے۔وہ عورت جو بیوی بھی ہے، رفیق بھی ہے، ساتھی بھی ہے، وہ عورت جو مرد کے بازوؤں کی زینت ہی نہیں بلکہ خود اس کا بازو بھی ہے، اس کی قوت ہے توانائی ہے۔''

ان خطوط میں ایک ہندوستانی عورت کا کردار اپنی پوری تابناکی کے ساتھ جلوہ فگن ہے۔صفیہ اختر نے زیرلب میں شائع اپنے پہلے خط میں جس ہمت واستقلال کے ساتھ جاں نثار اختر سے علیحدگی کو برداشت کیا ہے، وہ ہمارے گھروں کی عورتوں میں خال خال نظر آتا ہے۔وہ کہتی ہے:

''میں تم سے علیحدگی کے دن پوری ہمت اور استقلال کے ساتھ گزار لوں گی۔کالج کی زندگی، گھر کی دنیا سبھی تو میرے لئے اجڑ چکا ہے، مگر اختر! بہت سے لوگ تو تم سے زیادہ پریشانی اٹھا رہے ہیں ۔ہمیں تو ان کی طرف دیکھنا ہوگا، اپنے غم کو میں طول نہیں دوں گی ..... ۔''

پہلے خط کے اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ صفیہ اختر زندگی کی قدروں کی پرکھ رکھتی ہیں۔

اچھے اور بلند مقاصد کیلئے صدمات اٹھانا جانتی ہیں۔اس خط میں کتابی باتوں کو نہیں دہرایا گیا ہے بلکہ روزانہ کی زندگی نے جو باتیں سکھائی ہیں ان کا حقیقت پسندانہ اظہار کیا گیا ہے۔اس خط میں عزم وہمت اور استقلال کا بار بار استعمال اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے غم کو چھپا کر جاں نثار اختر کو زندگی سے برسرِ پیکار ہونے کا سبق دے رہی تھی۔ظاہر ہے کہ یہ اس وقت کا خط ہے جب جدائی کا زخم تازہ تھا۔اور یادوں کے پھول مہک رہے تھے۔اس حالت میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔وہ کسی معمولی شخصیت کی عورت کا کام نہیں تھا۔اپنے دوسرے خط میں جاں نثار اختر کی یاد کا اظہار ان لمحات کے تحت کیا ہے' جب وہ اختر کے بغیر نینی تال جاتی ہیں تو بھی اختر کی یادیں ان کے ساتھ ہوتی ہیں۔۱۶/جون ۱۹۵۰ء کو نینی تال سے تحریر کردہ خط میں صفیہ اختر کی متوازن شخصیت کے تین پہلو ایک ساتھ ملتے ہیں۔ایک طرف وہ نہایت جذباتی انداز میں اُجاڑ دن اور سنسناتی ہوئی رات کا ذکر کرتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفیہ اختر کی محبت جدائی کے لمبے دنوں اور نیند اڑانے والی کالی راتوں میں شدید اور گہری ہوتی جاتی ہے۔ اور ہجر کی رات انہیں جلائے دے رہی ہے۔دوسری طرف جاں نثار اختر کے پاس سے 150 روپئے پا کر بہت خوش ہوتی ہیں۔اور بہت سی چیزیں خرید لیتی ہیں۔لیکن دوسرے ہی لمحے انھیں خیال آتا ہے کہ ان کا محبوب بمبئی جیسے بے رحم شہر میں پیسے یعنی 150 روپئے گن گن کر خرچ کر رہا ہوگا۔یہاں پر صفیہ اختر (محبوبہ) ایک دردمند بیوی کے روپ میں نظر آتی ہیں جو تھوڑے سے پیسے خرچ کر دینے کے بعد یہ سوچتی ہے کہ کہیں وہ فضول خرچ تو نہیں کر رہی ہے جبکہ اس کا شوہر در بدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہوگا۔اور یہ احساسِ جرم اسے وقتی خوشی سے بھی محروم کر دیتا ہے۔

شخصیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ ایک معصوم عورت کی طرح خائف ہو جاتی ہے کہ کہیں زیادہ محبت کرنے کی بازی بھی جاں نثار اختر نہ لے جائے۔ ہندوستانی عورت کی یہ نمایاں خوبی ہے کہ وہ اپنے محبوب اور شوہر سے اس کے مقابلہ میں زیادہ اور تیز محبت کرتی ہے یہ جذبات کی بہت ہی

نازک کہانی ہے۔جس کیلئے شاعروں اور ادیبوں نے لاتعداد صفحات قلم کی نذر کئے ہیں۔شخصیت کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ جدائی کے غم کو ختم کرنے کیلئے ہر حال میں وہ اپنے محبوب کے پاس رہ کر گزارنا چاہتی ہے۔یہ ایک ساتھی کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے ساتھی کے ہر کڑوے وقت میں مددگار رہتا ہے۔محبت ہی ایسی دولت ہے جو دو افراد کی اتصال سے اور بڑھتی ہے۔جدائی اس کو اور شدید کر دیتی ہے۔مگر بچوں کا مستقبل انھیں مجبور کر دیتا ہیکہ صبر و شکر سے حالات کا مقابلہ کریں۔اسی طرح وہ اپنے خط میں وبالِ جان کہنے کے بعد فوراً یہ بھی لکھتی ہیں کہ اگر ایسے حالات میں یہ ہوتے تو زندگی بھی مشکل ہو جاتی۔یہ خیال بذاتِ خود بہت ہی صحت مند ہے اور اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ ازدواجی زندگی کو زیادہ سے زیادہ بہتر خوش آئند بنانا چاہتی تھیں۔صفیہ اختر کے خطوط کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ان کی شخصیت میں رومانیت کے اچھے عناصر ہیں۔ اور یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ان کے یہاں شوہر اور محبوب کیلئے دو الگ الگ شخصیتیں نہیں ہیں۔یہ خالص ہندوستانی تصور ہے۔کیونکہ ہمارے سماج میں محبوب کو ہمیشہ یا زیادہ تر شوہر کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ محبوب کے خیالی آدرش ہونے کو اس سے الگ کر کے نہیں دکھایا گیا ہے۔جیسے کہ یورپ میں یا رومانوی تحریک کی پوری تاریخ میں ملتا ہے۔ہندوستانی عورت کے محبوب کا تصور اسکے مجازی خدا کا بھیس بدل کر ہی آتا ہے۔یہاں صنعتی انقلاب نہ ہونے کی وجہ سے معاشرہ میں تیزی سے تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔اور کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وقت کی رفتار اس ملک میں آکر نہایت ہی سست ہوگئی ہے۔اس کے باوجود صفیہ اختر کے خطوط میں عورت کی جو شخصیت ابھری ہے وہ ہندوستانی ہوتے ہوئے نئی بھی ہے۔صفیہ اختر کی موت کو ایک عرصہ ہو چکا ہے،لیکن ان کے خطوط کے مختلف جملے آج بھی عمل، جدوجہد اور زندگی سے محبت کرنے کا پیام دیتے ہیں۔ان جملوں کو پڑھتے ہوئے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔اور حالات سے لڑنے کا حوصلہ جاگ اٹھتا ہے،ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک انجانی قوت ان خطوط میں پوشیدہ ہے۔جو آدمی کو بہتر آدمی بننے پر مجبور کرتی ہے۔ان خطوط کے اندازِ تخاطب بھی جاذب نظر ہیں۔زیادہ تر انہوں نے 'عزیز اختر' یا 'میرے اپنے اختر' کا استعمال کیا ہے اور اپنے آپ کو صرف 'تمہاری صفیہ' لکھا ہے۔صرف ایک خط میں

انہوں نے خود کو 'تمہاری دوست، ساتھی اور دلہن' بھی لکھا ہے۔ سجاد ظہیر 'نقوش زنداں' میں لکھتے ہیں:

''ان کے خطوط میں کاروباری خشکی نہیں ، جہاں ایسی حالت
پیدا ہوتی ہے وہ کسی رنگین ترکیب یا اچھے شعر سے اس کا مداوا
کر لیتی ہے، خطوں میں صاف گوئی کے معتقد ہیں، اور ان
لوگوں میں سے ہیں جن کے نزدیک حیاتِ انسانی کا کوئی رخ
گھناؤنا نہیں۔ بشرطیکہ اس کو پیش کرنے والا سلیقہ مند ہو۔''

قصہ مختصر یہ کہ ان خطوں کا سارا لہجہ زیرلب کا نہیں بلکہ فریاد برلب کا ہے۔ ان میں وہ قدرتی جذباتیت ہے جو نسوانیت کے ساتھ اس وقت ضرور وابستہ ہو جاتی ہے جب اس کا ہونٹ اپنی محرومیوں کے خلاف کھل جائے، ان خطوں میں واقعات و معلومات کا عنصر کم ہے، جذباتیت کا زیادہ۔ سادگی، بے تکلفی، اور خلوص یہ سب موجودہ ہیں۔ لیکن ان میں گہری اپنائیت ہے۔ گرم جوشی اور غم کی تپش نے ان کی فضا کو قدرے تلخ بنا دیا ہے۔ یہ خطوط بھی اس لحاظ سے انفرادیت رکھتے ہیں کہ اس سے قبل اس طرح کی چیزیں ہماری زبان میں معدوم تھیں۔

حوالے و حواشی:

۱) زیرلب ۵۱

۲) حرف آشنا

۳) انداز نظر

اکبرالہ آبادی فن خطوط نویسی کے آئینے میں

موجودہ دور سائنس وٹکنالوجی کا دور کہلاتا ہے۔انسان ترقی کے منازل طئے کرر ہا ہے۔اس کی چاندتک رسائی ہوری ہے۔واٹس ایپ ،فیس بک ،ٹوئیٹر ،سوشل میڈیا کا دور رواں ہے۔ترسیل کے نئے ذرائع پیدا ہو چکے ہیں۔ باوجودان تمام کے خطوط کی اہمیت سے انکارنہیں کیا جاسکتا۔خطوط نگاری کی تاریخ صدیوں سے انسانی تاریخ سے وابستہ ہے۔ابتدائی زمانے ہی سے لوگ پیغام رسائی یا ذہنی تسکین حاصل کرنے کے لیے خطوط کا استعمال کرتے تھے۔دنیا کی ہر زبان کی طرح اردو میں بھی خطوط کا خاصہ سرمایہ موجود ہے۔ضروریات زندگی میں اس کی غیر معمولی اہمیت ہے۔خطوط کے ذریعے دوری کو قربت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔اتنا ہی نہیں ان کے ذریعے اس عہد کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے جس دور میں یہ لکھے گئے ۔ساتھ ہی اس دور کی تہذیب معاشرت اور سماج ،رہن سہن ،زبان وغیرہ کا بھی علم ہوتا ہے۔ خطوط ادبی چاشنی ،لطافت ،نزاکت اور سادگی سے سرشار ہوتے ہیں۔اس میں فن کار کی ظاہری اور باطنی تمام باتوں کا عکس آجاتا ہے۔خطوط کی ادبی اہمیت کسی بھی تخلیقی کارنامے سے کم نہیں۔آج بھی اس کی افادیت قائم ودائم ہے۔خطوط نہ صرف شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں بلکہ جذبات ،واقعات اور حالات کی ترسیل کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں۔ادب کی دیگر اصناف کی طرح مکتوب نگاری بھی ایک اہم صنف ہے۔ اردو مکتوب نگاری میں ادب کی قدآور شخصیات نے اہم کردارادا کیا ہے جن میں علامہ اقبالؔ، بابائے اردو مولوی عبدالحق ،مرزا غالبؔ ،مولانا ابوالکلام آزاد،شبلی نعمانی ،الطاف حسین حالیؔ ،مہدی افادی ،سید سلیمان ندوی ،عبدالماجد دریا آبادی ،سرسید احمد خان ،عزیز لکھنوی ،ڈپٹی نذیر احمد،محمد حسین آزاد،اکبرؔالہ آبادی وغیرہ کے نام گرامی شامل ہیں۔جواس بات کا ثبوت ہے کہ اردو میں مکتوب نگاری کی صنف قدیم اور توانا ہے۔

اکبرؔ اردوشاعری کے ایک بہت بڑے ستون تھے۔انُہیں صرف شاعر کہہ کر فراموش کرنا ٹھیک

ڈاکٹر شیخ عمران ،اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، وسنت راؤ نایک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز ،مہاراشٹر

نہیں وہ ہندوستان کے تہذیبی و ثقافتی اقدار کے ایک نمایاں استعارہ اور علامت تھے۔ نظم اور غزل دونوں اصناف میں انہیں قدرت حاصل تھی۔ اردو میں کئی شعرا و ادبا آئے جنہیں اتنی شدت سے یاد نہیں کیا جاتا جتنا اکبر الہ آبادی کو یاد کیا جاتا ہے۔ شاعری تو سبھی کرتے ہیں لیکن ان کا معاملہ اردو کے دیگر شعرا سے قدر مختلف تھا۔ اردو شاعری میں انہوں نے اپنی ایک الگ راہ اختیار کی۔ اردو میں بہت کم شعرا ایسے ہیں جنہوں نے شاعری کے ساتھ نثر کے دامن کو بھی تھامے رکھا۔ اکبر الہ آبادی نہ صرف اردو شاعری کے مینارِ نور تسلیم کیے جاتے ہیں بلکہ نثر میں بھی ان کی خدمات قابل اعتراف رہی ہیں۔ بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ وہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے جس کی نشاندہی اکبر الہ آبادی کے تراجم اور خطوط سے سامنے آتی ہے۔ انہوں نے اردو کے کئی تراجم کیے لیکن خطوط ان کی شہرت کا ضامن بنے۔ اکبر الہ آبادی کے خطوط اُس دور کے حالات کی عمدہ منظر کشی و عکاسی کرتے ہیں۔ طرز معاشرت، رہن سہن، بول چال کا اندازہ ہم ان کے خطوط سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔ اکبر کے خطوط ان کی زندگی کی سچی تصویریں ہیں جس سے ان کے ذہنی گوشوں کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ غالبؔ کے خطوط کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کی انفرادیت سے انکار نہیں لیکن خطوط نگاری کا جو انداز اکبر الہ آبادی نے اختیار کیا اس کے ذکر کے بغیر مکتوب نگاری کی تاریخ نامکمل رہے گی:

> ''اکبر الہ آبادی کے خطوط کا اسلوبیاتی مطالعہ واضح کرتا ہے کہ خطوط کی نثر صاف ستھری ہے۔ فارسی کے ضرب الامثال، محاورات، اشعار اور عربی فقروں کے کہیں کہیں استعمال کے باوجود نثر سلیس محسوس ہوتی ہے۔ القاب و آداب میں جدّت و ندرت کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہے۔ اکثر بغیر القاب کے براہ راست گفتگو بھی شروع ہو جاتی ہے۔ خطوط کے نصف

ملاقات ہونے کا تذکرہ بھی انہوں نے اکثر مکتوب الیہم سے کیا
ہے۔کہیں کہیں ادیبانہ رگ پھڑک اُٹھتی ہے اور تکلف وآرائش کے
حسن پر توجہ دینے لگتے ہیں
مگر یہ رنگ اکبرالہ آبادی کے یہاں فصیح و بلیغ انداز کا درجہ رکھتا
ہے۔''

(اردو مکتوب نگاری، شاداب تبسم، دسمبر ۲۰۱۲، ۳۳۷)

کوئی ادیب یا شاعر خطوط کے ذریعے اپنے فکر وفن کے متعلق علمی مباحث، نئی نزاکتیں، ادبی رجحانات ضبط تحریر میں لاتا ہے۔خطوط صرف ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ہی نہیں لکھے جاتے بلکہ اچھے خطوط ان کو کہا جاتا ہے جس میں مکتوب نگار اپنے جذبات کا اظہار بے ساختگی سے کرتا ہے۔اکبر کے یہاں یہ باتیں آب وتاب کے ساتھ نظر آتی ہیں۔'رقعات اکبر' میں ایسے بے شمار خطوط موجود ہیں جو اکبرالہ آبادی نے اپنوں کو لکھے تھے، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، سید سلیمان ندوی، سید افتخار حسین، مہاراجہ سرکشن پرشاد، شرف الدین احمد، شیخ عبدالقادر، خواجہ حسن نظامی، خان بہادر حسن خاں کے نام ان میں شامل ہیں۔مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ندوۃ العلما چمن ہے تو آپ اس کے پھول ہیں اور اگر زیادہ بامعنی
ہونا چاہوں تو آپ اس کے بلبل ہیں، میں نے آپ کی تصنیف کی
بہت قدر کی نہ صرف اس سبب سے کہ وہ محض انڈکس نہیں ہے جس
میں علماء اور کتب اور دیار وامصار کے نام لکھ دیے گئے ہوں۔جن
سے اگر یہ معلوم ہوتا ہو کہ مولّف مصنف کو بہت سی کتابیں حوالہ
دینے کے لیے میّسر آئیں، اور شاید ورق گردانی میں اس نے محنت
بھی کی لیکن پڑھنے والے کی نہ عقل بڑھے نہ دائرہ معلومات

مفیدہ۔‘‘

(رُقعاتِ اکبر، مرتبہ ساحل احمد، الہ آباد، ص۴۶)

اکبرؔ نے شاعری اپنے دورِ آغاز ہی سے شروع کر دی تھی، خطوط کا جہاں تک معاملہ ہے اس کی ابتدا انہوں نے اس وقت کی جب وہ اپنی عمر کے آخری مرحلے میں داخل ہو چکے تھے۔ بیوی اور نوعمر بچے کی وفات ان کی نظروں کے سامنے ہوئی یہ صدمہ ان کو مرتے دم تک رہا۔اس کا ذکر انہوں نے اپنے خطوط میں کئی جگہ کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو لکھتے ہیں:

’’آپ جب مجھ سے ملے تھے۔اس کے بعد میں شدید مصائب میں مبتلا ہو گیا۔ میرا لڑکا سید ہاشم جو نہایت ذہین۔ ہونہار۔ توانا۔ بالا بلند۔ موزوں طبع عاقل۔ خدا پرست۔ شعر فہم۔ میرا خادم۔ مشیر و مطیع تھا اور جس نے چودھویں سال میں قدم رکھا تھا۔ یکا یک سرسام میں مبتلا ہو کر مجھ سے ہمیشہ کو جدا ہو گیا۔ بی بی پہلے مر چکی تھیں۔ وہی لڑکا دنیاوی زندگی کا سہارا تھا۔ مذہب اور فلسفہ تصوّف نے دیوانگی سے محفوظ رکھا لیکن بے حد افسردہ اور دنیا سے بے تعلق ہو گیا ہوں۔‘‘

(رُقعاتِ اکبر، مرتبہ ساحل احمد، الہ آباد، ص۱۵۲)

جو خطوط اکبرؔ الہ آبادی نے اپنے دوستوں اور عزیزوں کو لکھے ان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اکبرؔ نے تمام حوادث کے باوجود بھی جینے کی بھرپور کوشش کی۔ یہ خطوط ان کی فکری، ذہنی اور قلبی کیفیت کے آئینہ دار ہیں:

’’اکبر الہ آبادی کے خطوط صرف خطوط ہی نہیں بلکہ وقت کا آئینہ ہیں۔ان میں عالمانہ بصیرت اور فکری تونگری کی عمدہ

مثالیں موجود ہیں۔ یہ خط حال سے ماضی تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں۔ان میں علما کا ذکر بھی ہے شہر وقصبات کی تہذیبی وتمدنی زندگی کا عکس بھی موجود ہے۔ بذلہ سنجی اور قوت بیانیہ کی مثالیں ملتی ہیں۔اسلوب سادہ اور انداز بیانیہ ہے۔دوٹوک بات کرنے کا طرز اسلوب کو تازہ وشگفتہ رکھتا ہے۔تاریخی اور معاشرتی حقائق نے ان کے نظریاتی رو یے کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔''

(اردو مکتوب نگاری، شاداب تبسم، دسمبر ۲۰۱۲ دہلی، ص ۳۳۹)

کسی ادیب، شاعر یا اپنے وقت کی اہم شخصیت کو سمجھنے اور اس کے حالات وکوائف اور زمانے سے آگاہی کے لیے اس کے خطوط بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔اکبر الہ آبادی کے خطوط پڑھ کر ہم اس زمانے سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔خطوط کے مطالعے سے ہم ان کے بچپن سے لے کر جوانی اور بڑھاپے تک کے حالات، واقعات اور حادثات کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُس دور کے سارے حالات ہمارے سامنے ہیں اور ہم اُس دور میں جی رہے ہیں۔اپنے دوستوں، شاگردوں اور ہم عصروں کو انہوں نے جو خطوط لکھے ان کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے۔اکبر کو خطوط لکھتے وقت ان کی اشاعت کا خیال کبھی نہیں آیا۔ان کے چاہنے والوں کو ان خطوط کی اہمیت کا احساس بہت حد تک تھا، لہذا وہ انہیں تاریخی ترتیب سے جمع کرتے رہے۔اکبر الہ آبادی کے خطوط کا مجموعہ 'مکاتیب اکبر' (حصہ اوّل) کے نام سے مرزا سلطان احمد نے شائع کیا جب کہ مکاتیب اکبر (حصہ دوّم) عبدالماجد دریا آبادی نے شائع کیا۔

خطوط بنیادی طور پر شخصی نثر کے ذیل میں آتے ہیں۔اس اعتبار سے ان کا دائرہ عمل بھی محدود ہوتا ہے۔لیکن خطوط میں ایسے مقامات اکثر و بیشتر آجاتے ہیں جہاں مکتوب نگار کو کبھی توضیح خیال کی ضرورت پیش آتی ہے اور اُسے اپنے تاثرات کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔''مکاتیب اکبر'' میں موضوعات کا ایسا تنوع اور بوقلمونی ہے کہ ان میں ادائیگی خیالات اور اظہار واحساسات کے تمام اسالیب بڑی آسانی سے

تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ ان مکاتیب میں ادبی مباحث ،شاعری کی اصلاح،اردو نثر کے متعلق تنقیدیں وغیرہ شامل ہیں۔زبان و بیان کا جہاں تک سوال ہے انتہائی سادہ اور بے ساختہ زبان اکبر نے اپنے خطوط میں استعمال کی ہے۔القاب وآداب بالعموم سادہ استعمال کیے ہیں۔وہ جو کچھ لکھتے بے تکلف لکھتے۔خطوط کا انداز ایسا موثر تھا جیسے کوئی اپنائیت سے اپنے دل کی بات کہہ رہا ہو۔اکبرالہ آبادی کے داخلی جذبات کا پرتو ان کی تحریروں میں صاف طور پر نظر آتا ہے۔الفاظ کے انتخاب کی تلاش وجستجو انہوں نے کبھی نہیں کی ۔بے تکلفی اور سادگی سے ان کے خطوط میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہوگئی ایسا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔:

> ’’ سادگی اور بے ساختگی مکاتیب اکبر کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔یہ خطوط نہ تو دل لگا کر لکھے گئے ہیں نہ ہی اشاعت کا خیال اکبر کے ذہن کے کسی کونے میں موجود تھا اس لیے وہ جو کچھ لکھنا چاہتے تھے لکھ ڈالتے تھے۔اور اگر ان میں کسی ذہنی تحفظ کو دخل تھا تو محض اس قدر کہ اکبر کی تربیت ایک خاص فضا اور ماحول میں ہوئی تھی۔اسے سادہ لفظوں میں قدیم تہذیبی ماحول کہا جاسکتا ہے۔چنانچہ اس قدیم شائستہ ماحول کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر کسی کے خلاف کچھ لکھا جاتا تو ایسے شائستہ لہجے میں کہ اسے برا معلوم نہ ہو۔اس لہجے سے گزر کر دیکھیے تو اکبر کے خطوط کی بے ساختگی متوجہ کیے بغیر نہ رہے گی، بلکہ اکثر اوقات خطوط کا ظاہری لب ولہجہ ان کے اشعار سے بہت حد تک الگ تھلگ نظر آتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘

(اکبرالہ آبادی تحقیقی وتنقیدی مطالعہ،ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا،۲۰۰۳،ص۳۲۲)

شناساؤں کو لکھے گئے خطوط میں بعض جگہ انہوں نے اپنی ضعف بدن بینائی اور کثرت امراض کا ذکر بھی کیا ہے۔ بیماری ومصائب میں اکثر انسان مرنے کی باتیں کرتا ہے، ان کے خطوط میں جابجا بیماریوں کا ذکر ملتا ہے، اکبرالہ آبادی کے آخری ایّام جسمانی اور ذہنی تکالیف میں بسر ہوئے۔ لیکن ایسی نازک گھڑی میں بھی وہ اپنے احباب کے خطوط کا جواب دیتے اور اچھے سے دیتے چاہے وہ مختصر ہی کیوں نہ ہو۔ خط کے جواب دینے میں انہوں نے کبھی تاخیر نہیں کی یہ ان کے خطوط کا ایک نمایاں وصف ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی مکتوب نگار ایسا ہوگا جس نے عمر کے آخری وقت تک اس صنف کو اپنے سے لگائے رکھا۔ اکبر اس میدان میں منفرد نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں دنیا سے اس قدر دل برداشتہ ہوگیا ہوں کہ شاید اتنا نہ ہونا چاہیے سبب یہ ہے کہ تعلقات منقطع ہیں، طول امل کا وقت نہیں، عبرت وفنا پیش نظر ہے۔''

دنیا کی کیا حقیقت اور ہم کو کیا تعلق
وہ کیا ہے اک جھلک ہے ہم کیا ہیں اک نظر ہیں

(اکبر کے شب وروز، محمد رحیم دہلوی، ص، ۱۵۳)

اکبرالہ آبادی کے خطوط مختصر بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔ وہ نہ طویل علمی مباحثوں سے معمور ہیں اور نہ ہی طویل خود کلامیوں پر مبنی۔ نہایت اختصار سے مکتوب الیہ تک اپنی بات پہنچانے کا فریضہ وہ جانتے ہیں۔ ان خطوط میں ان کی ادبیت اور اسلوب کا عنصر اُجاگر ہے۔ یہ خطوط انسانی جذبات اور احساسات کے مظہر ہی نہیں بلکہ نجی وادبی ذوق کی غمازی بھی کرتے ہیں۔ زندگی کے در وبام کا اکبرالہ آبادی نے خوب جائزہ لیا، حالات کو قریب سے دیکھا، گردش ایّام کو سمجھنے کی کوشش کی جس کا واضح عکس ہمیں ان خطوط میں نظر آتا ہے۔ اکبرالہ آبادی کے احباب کا دائرہ کافی وسیع تھا، اپنی جاذب شخصیت سے انہوں نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا اور کمال تو یہ ہے کہ تلخ تلخ سے بات کا پڑھنے والے پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ طالب الہ

آبادی اکبر کے اس وصف سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں:

''شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کے خطوط میں زبان کی خوبیاں ہیں اور بے ساختگی کا انداز ہے۔ مرزا غالب کے خطوط میں انتہا درجہ کی سادگی اور بے ساختگی ہے اور جدّت ہے اور فلسفیانہ باریکیاں خاص و دلچسپ انداز سے بیان کی گئی ہیں مگر اکبر کے خطوط میں یہ باتیں بھی ہیں اور ایک خصوصیت سب سے اعلیٰ ہے کہ بہت بڑے مضمون کو دو لفظوں میں ادا کر جاتے ہیں اور کسی بات یا کسی شخص سے اختلاف کرتے ہیں تو ان کی بلاغت ایسا کمال کرتی ہے کہ لطف آ جاتا ہے۔ جس کے خلاف لکھتے ہیں وہ برا نہیں مانتا۔ الفاظ کی بندش ہی اس قسم کی ہوتی ہے کہ ناگوار خاطر نہ ہو۔''

(اکبر الہ آبادی، طالب الہ آبادی، ص، ۳۹۱)

علامہ اقبالؔ سے اکبرؔ کے گہرے مراسم تھے۔ اقبالؔ کو وہ اپنا پیر و روحانی دوست تسلیم کرتے تھے جس کا اظہار انہوں نے کئی خطوط میں کیا ہے۔ ان خطوط میں شاعر کی اصلاح، تبصرے، تنقیدیں وغیرہ پر بات ہوتی تھی۔ ان کا اقبالؔ کے بارے میں یہ خیال تھا کہ 'میں آپ کو اس نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی عقیدت و محبت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔' اقبالؔ بھی اکبرؔ اور ان کے خطوط سے بے حد متاثر تھے۔ وہ اکثر و بیشتر اکبر سے کہا کرتے تھے کہ آپ کے خطوط ادب کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔ یہ خطوط غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں، میں ان خطوط سے متاثر تو ہوں ہی اس سے بھی بڑھ کر ان خطوط کو محفوظ رکھتا ہوں۔ یہ خطوط اپنی انفرادیت کے اعتبار سے نادر ترین خطوط ہیں۔ مذہبی موضوع پر بھی ان خطوط میں تبادلہ خیال ہوتا، شاعری اور فلسفہ

دونوں ان کے خاص موضوعات تھے مگر تصّوف کے معاملے میں خیالات الگ الگ تھے۔اکبرالہ آبادی ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اقبال صاحب کا خط آیا لکھتے ہیں' میں تصوف کے خلاف نہیں ہوں صرف چند مسائل سے اختلاف ہے۔میں نے لکھ دیا، کہ خواہش یہی ہے کہ آپ محبوب قلوب رہیں۔میں تو عبرت وآلام کے ہاتھوں مردہ ہوگیا۔میں ہوں اور ایک دوسرا عالم ہے۔خبر نہیں دینا کہاں ہے اور اصلاح کے لیے کیا کہنا اور کرنا چاہیے۔''

(اکبر کے شب وروز، محمد رحیم دہلوی، ص ۱۹۵)

اکبرالہ آبادی کے خطوط میں حسن زیبائش وآرائش نہیں بلکہ ایک فطری حسن ہے جو ان کی تحریروں میں ہر جگہ نمودار ہوا ہے۔اس کے علاوہ خطوط میں ہر قسم کا سرمایہ علمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی موجود ہے۔ان مکاتیب کے حوالے سے ہم اس دور کے ادیبوں اور شاعروں سے آپ کے تعلقات اور ان کی معاصرانہ چشمک کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔اکبرآلہ آبادی کے مکاتیب میں چند خصوصیات ایسی ملتی ہیں جو غالبؔ کے خطوط کی امتیازی خصوصیات رہی ہیں:

''خطوط میں ایک خاص بات یہ ہوتی تھی کہ ان کا ہر مخاطب یہ خیال کرنے لگتا تھا کہ مجھ پر حضرت کی خاص نظر عنایت ہے۔وہ خالص مشرقی آداب ورکھ رکھاو کے مطابق خطوط لکھتے تھے اور ہر شخص کو اُس کی حیثیت سے زیادہ خوش کرنا چاہتے تھے۔''

(اکبرالہ آبادی، طالب الہ آبادی، ص ۳۹۱۔۳۹۲)

بلبل ہند سروجنی نائیڈو انگریزی کی ایک عظیم شاعرہ، دانشور اور مجاہدہ آزادی تھیں۔اپنی تقریروں وگیتوں کے ذریعے انہوں نے اہل وطن میں آزادی کی لوجلائی۔اکبرالہ آبادی سے ان کے اچھے

مراسم تھے۔ دونوں کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری و ساری رہتا۔ سروجنی نائیڈو اکبرؔ کو ایک خط میں لکھتیں ہیں:

Anand Bhawan,

Allahabad.9th October 1917

Dear Maulvi Akbar Husain Sahib,

Well you let me do myself the honour of

Paying my respects to you tomorrow morning about 10.30,

if that hour be not to inconvenient. Iam leaving for Patna by the afternoon train and I should indeed be sorry to go without meeting the great satirist of our days.

Yours faithfully

Sarojini Naidu

(حیات اکبر، سید عشرت حسین، ص، ۱۲۷۔۱۲۸)

اگر چہ اکبرؔ الہ آبادی کا جو مقام شاعری میں ہے وہ مکتوب نگاری میں نہیں اور اُن کے خطوط میں وہ شگفتگی نہیں جو ان کی شاعری میں ہے اس کے باوجود اکبرؔ نے اپنے خطوط میں جدّت طبع کے جو جوہر دکھائے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اکبرؔ الہ آبادی کو سمجھنے اور ان کے خیالات کی روح سے واقفیت کے لیے ان کے خطوط کا مطالعہ درکار ہے۔ اس کے بغیر ہم اکبرؔ اور ان کے فن کو نہیں سمجھ سکتے۔ اکبرؔ نے نثر نگاری میں جو نقوش چھوڑے ہیں وہ ادب کا ایک اٹوٹ حصہ ہیں۔ اکبرؔ الہ آبادی کے

خطوط ہماری علمی، ادبی، تہذیبی، تاریخی اور سیاسی بصیرت کے محافظ ہیں۔جس کے مطالعے سے نئی نسل کو روشنی اور نئی راہ ملتی رہے گی۔

حوالہ جات:

۱)اردو مکتوب نگاری، شاداب تبسم، دسمبر ۲۰۱۲، ۳۳۷، ۳۳۹

۲)رُقعات اکبر، مرتبہ ساحل احمد الہ آباد، ص ۴۶، ۱۵۲

۳)اکبر الہ آبادی تحقیقی وتنقیدی مطالعہ۔ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا، ۲۰۰۳، ص ۳۲۲

۴)اکبر کے شب وروز۔محمد رحیم دہلوی، ص ۱۵۳، ۱۹۵

۵)اکبر الہ آبادی۔طالب الہ آبادی، ص ۳۹۱۔۳۹۲

۶)حیات اکبر، سید عشرت حسین، ص ۱۲۷۔۱۲۸

سرسید کا خواب اور ان کی کاوشیں
(انگریز افسران کے خطوط کے حوالے سے)

مفکر قوم وملت سرسید احمد خاں سرزمین ہندوستان کی بے نظیر اور عبرت ناک تاریخ کا نام ہے۔ ان کی تعلیمات ہر دور اور ہر عہد کے لیے مشعل راہ بنی اور بنتی رہے گی۔ ان کی شخصیت، ادبی کارنامے، حکومت برطانیہ کی ملازمت، مخالفت اور ہندوستانیوں کے حقوق کے لیے کی جانے والی کاوشوں پر اردو ادب کے ساتھ ساتھ مختلف زبان وادب میں بے شمار کتب، رسائل وجرائد، سیمینار، سمپوزیم وغیرہ شائع ومنعقد کیے جاتے رہے ہیں اور مستقبل میں ان پر تحقیقی وتنقیدی نقطہ نظر سے لکھا اور پڑھا جاتا رہے گا۔ بہر کیف اس تحقیقی مقالہ میں ہم ان خطوط پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے جو انگریز افسران نے سرسید احمد خاں کو ان کی دیرینہ جدوجہد اور ان کی علمی، ادبی اور تعلیمی کاوشوں کے لیے لکھے تھے۔ ان میں چند خطوط وہ ہیں جو حکومت برطانیہ کی جانب سے امداد کے متعلق مطالبات کے جواب میں لکھے گئے، کچھ میں سرسید کی جدوجہد پر مبارک باد پیش کی گئی ہے اور اس فہرست میں وہ خط بھی شامل ہیں جو 'مدرستہ العلوم' کے لیے حکومت برطانیہ سے مدد اور زمین دیے جانے کے جواب میں سرسید کو لکھے گئے تھے۔ یہ وہ خط ہیں جو سرسید کی دیرینہ فکر اور ان کی کوششوں کو ایک نئے پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔

سرزمین ہند اور انیسویں صدی کا رشتہ بڑا ہی عجیب وغریب ہے۔ ہندوستان میں جہاں ایک طرف انقلابی تاریخ رقم ہو رہی تھی وہیں دوسری جانب علم وادب، امن وامان اور انسانیت کا درس بھی دیا جا رہا تھا۔ جہاں ایک طرف آزادی کے لیے بے شمار تحریکیں چلائی جا رہی تھیں، انقلاب کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، وہیں دوسری جانب محبت، دوستی و ہمدردی کے پیغام بھی دیے جا رہے تھے۔ ان سب کے درمیان سرسید احمد خاں کا کردار امید کی روشنی بن کر سامنے آتا ہے اور اپنے منفرد

ڈاکٹر محمد فرحان دیوان، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

انداز میں ہندوستانیوں کی بقا کے لیے پوری زندگی وقف کر دیتا ہے۔ بابائے قوم سرسید احمد خاں کی زندگی ان کی فکر، تعلیم وتربیت، قوم وملت کی ترقی کے لیے ان کی جدوجہد پر بے شمار مضامین لکھے گئے، کتابیں لکھی اور ترتیب دی گئیں۔ بلاشبہ مستقبل میں بھی ان کی تعلیمات کے متعلق خیالات کا اظہار مختلف انداز میں کیا جاتا رہے گا۔

بسیط کینوس پر پھیلی ہوئی سرسید احمد خاں کی علمی، ادبی اور تعلیمی زندگی، ان کی فکر، جدید تعلیم اور ترقی کے لیے ان کی کوششوں کو دانشوران ادب نے اپنے اپنے طور پر برتنے کی کوششیں کی ہے۔ کسی نے ان کی تصانیف کے حوالے سے تصویر کشی کی ہے، تو کسی نے ان کی ملازمت، سیاست اور سوسائٹی کو ذہن میں رکھ کر انھیں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تعلیمی بصیرت، سیاسی فکر اور معاشی ترقی وغیرہ کو سمجھنے کے لیے اُن کی زندگی اور ان کی تصانیف کے علاوہ اُن کے خطوط اہم مقام رکھتے ہیں جو انھوں نے اپنے عزیز واقارب، دوستوں اور انگریز افسروں وغیرہ کو لکھے تھے۔

غدر ۱۸۵۷ کے بعد کے حالات اور ہندوستانیوں کی برطانوی حکومت وحکمرانوں سے نفرت کو سمجھتے ہوئے سرسید نے نہ صرف اہل وطن کی فلاح کے لیے قلم سے انقلاب پیدا کیا بلکہ حکومت برطانیہ کو یہ احساس بھی دلا دیا کہ وہ بے قصور ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں پر ظلم وزیادتی کر رہے ہیں۔ ان کی اس مہم میں ان کے دوست، احباب اور چند انگریز افسر بھی شامل تھے۔

حکومت مغلیہ کے خاتمہ اور برطانوی حکومت قائم ہونے کے بعد ہندوستان میں ہنگامہ خیز ماحول تھا۔ چونکہ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے حاصل کی تھی۔ اسی وجہ سے مسلمانوں میں ان کے خلاف بے انتہا نفرت کا ماحول تھا۔ مذہبی، سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل سر اٹھائے کھڑے تھے۔ دانشورانِ ادب اور مفکران قوم نے اس سخت آزمائش کے دور میں ملک وقوم کی فلاح کے لیے تجاویز پیش کیں اور بعض نے عملی کردار بھی ادا کیے۔ انھیں بزرگوں میں سے ایک مردمجاہد سرسید احمد خاں ہیں۔ انھوں نے نہ صرف ملک وقوم کو تاریکی سے روشنی کی طرف گامزن کیا بلکہ پوری دنیا کو انسانیت کا پیغام دیا۔

سرسید احمد خاں نے حکومت برطانیہ کی آنکھیں کھولنے کے لیے ''اسباب بغاوت ہند'' لکھی۔ملک وقوم کو بیدار کرنے کے لیے اخبارات،رسائل وجرائد جاری کیے،تحریکیں چلائیں، سوسائٹیز قائم کیں،مضامین لکھے اوراپنے دوستوں سے لکھوائے۔اتنا ہی نہیں جدید تعلیمات اور تعلیم کے جدید طور طریقہ کو سمجھنے کے لیے انگلستان کا سفر بھی کیا۔ ہندوستان میں جہاں بھی رہے مثلاً بجنور، مرادآباد، بنارس، غازی پور، مین پوری اور علی گڑھ وغیرہ ہر جگہ صرف وصرف اہل وطن کی ترقی کے لیے کام کرتے رہے۔ بالآخر سرسید احمد خاں علی گڑھ میں ''مدرستہ العلوم'' کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا یہ مدرسہ ''محمڈن اینگلواورینٹل کالج'' بنااور آج ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔سرسید کے اس عملی کارنامہ میں ان کی اثر دار شخصیت کو کافی دخل حاصل ہے جس سے متاثر ہوکر حکومت برطانیہ اور انگریز افسران نے بھی ان کا بخوبی ساتھ دیا،انگریز افسران نے تو ان کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ہر ممکن مدد بھی فرمائی۔مقالے میں شامل پہلے خط کا ایک اقتباس دیکھیں جو سرسید کے دوست اور حکومت برطانیہ کے اعلیٰ افسر 'اے.ڈبلیو.کولِن' A.W.Colvin کا ہے جوانھوں نے سرسید کے کالج میں چندہ کے متعلق لکھا تھا:

''جناب من!

میرا ارادہ تھا کہ آپ کے محمڈن اینگلواورینٹل کالج کے متعلق
مکتوبِ گرامی کا جواب اس سے قبل دیتا۔میں بخوشی پچاس
روپے کا چندہ اس کے لیے بھیج رہا ہوں اورخوش ہوں گا اگر
اس کی مزید امداد کرسکوں...''1

سرسید کی شخصیت کا اثر خط میں صاف نظر آرہا ہے جہاں اے.ڈبلیو.کولِن نہ صرف ان کی مدد فرمارہے ہیں بلکہ اپنے جذبات و خیالات کا اظہار بھی کر رہے ہیں۔اسی خط میں

اے.ڈبلیو.کولِن آگے لکھتے ہیں کہ:

''مجھے اندیشہ ہے کہ مطلوبہ رقم کی فراہمی میں دقتیں پیش آئیں گی جب تک آپ بڑی بڑی اسلامی ریاستوں مثلاً حیدرآباد، بھوپال، خیر پور کی ہمدردیاں حاصل نہ کریں۔لیکن مجھے امید ہے کہ ایسا ہو سکے گا...''.2

اے.ڈبلیو.کولِن کا یہ خط ان کے احساس اور ہمدرد ہونے کی دلیل دے رہا ہے۔کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ سرسید احمد خاں ہی وہ مردمجاہد ہے جو ہندوستان میں تعلیمی انقلاب پیدا کرسکتا ہے۔ان کے مشورے کے بعد سرسید احمد خاں ہندوستانیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''اے میرے عزیزوں! یہ میری آرزو ہے کہ میں اپنی قوم کے بچوں کو آسمان کے تاروں سے اونچا اور سورج کی طرح چمکتا ہوا دیکھوں،ان کی روشنی اس نیلے نیلے گنبد کے اندر ایسی پھیلے کہ سورج، چاند اور ستارے سبھی اس کے آگے ماند ہو جائیں....پس میں چاہتا ہوں کہ میرے تمام بچے جو کالجوں میں پڑھتے ہیں اور جن کے لیے میری آرزو ہے کہ وہ یورپ کے سائنس اور لٹریچر میں کامل ہوں اور تمام دنیا میں اعلیٰ شمار کیے جائیں،ان دو الفاظ ''لا الہٰ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کو نہ بھولیں''3

غدر ۱۸۵۷ء اور اسباب بغاوت ہند کے بعد سرسید کی بالکل منفرد شخصیت ہندوستانی عوام اور حکومت برطانیہ سے روبرو ہوئی۔کیوں کہ سرسید اب وہ راز جان گئے تھے جس میں ہندوستانیوں کی ترقی پوشیدہ تھی۔لہٰذا انھوں نے عوام سے ہم کلام ہونے کے لیے اخبار شائع کیے،سوسائٹیز قائم کیں،رسالے جاری کیے،پمپلیٹ چھاپے اور دانشوران ادب کو خط بھی لکھے تا کہ ہندوستانیوں کو تاریکی سے نکال کر روشنی

کی طرف گامزن کرسکیں۔ تعلیمی ترقی کے لیے انھوں نے جدید تعلیم، مختلف علوم وفنون کو حاصل کرنے کی نصیحت کرنے کے ساتھ ساتھ طریقہ بھی بتایا اور اسے اختیار کرنے کا راستہ بھی دکھایا۔ اُن کی جدوجہد اور بے چینی دیکھ کر ان کے چند دوست بھی ساتھ کھڑے ہو گئے جن میں کچھ انگریز افسر بھی تھے جو صرف سرسید کے دوست ہی نہیں خیر خواہ بھی تھے۔ وہ ہر قدم پر سرسید کی مدد کرتے تھے۔ سرسید کے ایک دوست کلارمونٹ ڈینیل Clarmont Daniell اپنے ایک خط میں سرسید کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بخدمت سرسید احمد خاں،
پرنسپل، صدر امین
غازی پور۔ ۳۰ر نومبر ۱۸۶۳ء
جنابِ من!
مجھے آپ کا وہ پمفلٹ پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی جو آپ نے اہل ہندوستان کو لکھا ہے اور جس میں یوروپین علوم کی اشاعت کا تذکرہ کیا ہے۔ آپ کا یہ منصوبہ ان تمام اشخاص کی امداد کا مستحق ہے جن کے پیش نظر اہل ہندوستان کا مفاد ہے اور جو آپ کے ہاں ہر قوم کے برادرانِ وطن میں احیائے علوم کے خواہش مند ہیں....''4

اسی خط میں کلارمونٹ ڈینیل Clarmont Daniell سرسید احمد خاں کو مزید مشورہ اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''میں امید کرتا ہوں کہ اگر ایسے منصوبے پر مستقل مزاجی کے ساتھ آپ جیسے حضرات عمل کریں جو اس کے بلند مقصد سے

کما حقہ واقفیت رکھتے ہیں تو تھوڑے عرصے میں ہی ذی علم طبقات
پر ان کا نمایاں اثر پڑے گا۔ خاص کر آپ کی اپنی قوم پر جس میں ہر
قابلیت اور درجے کے لوگ بہ کثرت مل جاتے ہیں اور جن کے
متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ ذاتی رجحان مفاد کی خاطر ان شعبہ ہائے
علوم کی طرف کشش محسوس کریں گے....۔''5

کلارمونٹ ڈینیل کے اس مخلصانہ خط کا اثر کہیں نہ کہیں سرسید احمد خاں کی سوچ، ان کی تحریک پر ہوا۔ انھوں نے اہل وطن کی تعلیمی ترقی کے لیے مغرب و مشرق کے مختلف علوم کی کتابوں کا ترجمہ اردو زبان میں کرانے کا ارادہ کر لیا اور دانشوران ادب سے بھی اس میں امداد طلب کی۔ بیش تر حضرات نے سرسید احمد خاں کے خیالات اور سوچ کی تائید کی بلکہ عملی تعاون دینے کا اقرار بھی کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں سرسید احمد خاں کی 'سائنٹفک سوسائٹی' کا قیام عمل میں آیا۔ جس کا واحد مقصد مغرب و مشرق کے اعلیٰ علوم کا ترجمہ ہندوستانی زبان میں کرنا تھا۔ سوسائٹی کے قیام کو چند روز ہی گزرے تھے کہ سرسید احمد خاں کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا۔ لیکن سرسید احمد خاں تنہا علی گڑھ نہیں آئے وہ اپنے ساتھ اہل وطن کی ترقی اور فلاح کا خواب اور سائنٹفک سوسائٹی کو ساتھ لے کر آئے۔ قیام علی گڑھ انھوں نے ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' (۱۸۶۶ء) جاری کیا۔ اس گزٹ کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں شائع ہونے والی ہر تحریر انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ہوتی تھی۔ گزٹ نے پُر آشوب دور میں سماجی، سیاسی، ادبی اور صحافتی میدانوں میں خاص خدمات انجام دیں۔ سرسید کے اخبارات اہل وطن کی بیداری، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قیام اور عوام کی آواز کو حکومت تک پہچانے کا اہم ذریعہ ثابت ہوئے۔

سرسید احمد خاں کی سوسائٹی اور گزٹ کا یہاں ذکر کرنا ضروری تھا کیوں کہ خطوط کی روشنی میں سرسید کی جن خدمات کو روشناس کرانے کی کوشش کی جارہی ہے اس کی تہہ تک جانے میں قاری کو آسانی ہو۔ تا کہ عہد سر سید میں ہونے والی تبدیلیوں اور سرسید کی عملی کاوشوں کو منظر عام پر لایا جا سکے۔ سرسید کی سوسائٹیز اور

اخبارات ورسائل کی کارکردگی پر نظر ثانی سے ان کی زمینی جدوجہد، اہل وطن کے لیے تعلیمی نظام اور روشن مستقبل کی بنیاد رکھتے ہوئے ان کی کوششوں کو دیکھا جا سکے۔ کالج کے نصاب بالخصوص انگریزی نصاب اور سنگ بنیاد کے متعلق ''کے۔ڈیٹن'' K.Deighton خط کے ذریعہ سرسید احمد خاں سے گفتگو کر رہے ہیں کہ:

''شملہ، ۲۸ رمئی ۱۸۷۵ء

جنابِ محترم!

انگریزی کے نصاب تعلیم کی دو سکیمیں بھیج رہا ہوں۔ کتابیں موجود نہ ہونے کی وجہ سے ان کے مرتب کرنے میں تاخیر ہو گئی۔ غالباً کچھ عرصہ بعد میری ان تجاویز میں ترمیم کی ضرورت پیش آئے گی۔ سرِ دست آغاز کے لیے یہ کافی ہیں....''6

خط میں آگے ''کے۔ڈیٹن'' نصاب کی طباعت اور کالج کے اجرا کے متعلق مشورہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''آج رات میں ''سر ولیم میور'' سے ملاقات کر رہا ہوں۔ کالج کا تذکرہ ان سے کروں گا۔ آپ کی اسکیم (میری ترمیم کردہ) زیر طبع ہے۔ آج آخری پروف آجائیں گے۔ آپ کو بھیجنے سے پہلے سر ولیم میور کی رائے بھی اس کے متعلق حاصل کرلوں گا۔

کالج کے اجرا کا کب تک امکان ہے؟ مجھے یہ خیال آتا ہے کہ پرنس آف ویلز بہادر جب موسم سرما میں یہاں تشریف لائیں

تو ان سے سنگ بنیاد رکھوایا جائے۔ یہ تجویز آپ اپنی کمیٹی کے غور
کے لیے تیار رکھیں۔''7

سرسید کے نام اس خط میں 'کے .ڈیٹن' نے انگریزی نصاب، اس کی کتب، کالج کے سنگ بنیاد اور اجرا کے متعلق اپنا تعاون، مشورہ اور ہمدردانہ جذباتوں کا اظہار بخوبی کیا ہے۔ کے .ڈیٹن کے خط سے ایک بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ سرسید احمد خاں نے جو عزم غدر ۱۸۵۷ء کے وقت اٹھایا تھا اسے عملی جامع پہنانے میں وہ کوئی کثر نہیں چھوڑ رہے تھے۔ انھوں نے اپنی کوششوں سے، اخبارات و رسائل کے ذریعہ، سوسائٹیز اور سب سے اہم اپنے عزیز و اقارب کی امداد سے اپنے خواب اور اہل وطن کی ترقی کے لیے منظّم نظام تحریک کو عملی شکل دینے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ یعنی اہل وطن کی تعلیمی ضروریات کے لیے درسگاہ کی بنیاد رکھ لی تھی، جسے حکومت برطانیہ کا تعاون اور خوشنودی حاصل ہو رہی تھی۔

سرسید احمد خاں کی ان کوششوں میں ۱۸۵۷ء کے علاوہ سفر انگلستان کو بڑا دخل حاصل ہے۔ کیوں کہ سرسید نے اہل وطن کی تعلیمی ترقی اور فلاح کے لیے جو منصوبے تیار کیے تھے ان کی داغ بیل انگلستان میں پڑ چکی تھی۔ وہاں کے متاثر کن تعلیمی نظام کے ساتھ ساتھ اخبارات و رسائل نے سرسید احمد خاں کی شخصیت پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ بالخصوص 'ٹیٹلر' اور 'اسپیکٹیٹر' کی تاریخ ساز حیثیت، اس کی اشاعت اور اس سے معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں نے ان کے سامنے اہل وطن کے روشن مستقبل کے بے شمار راستے کھول دیے تھے۔ جس پر چل کر ہندوستانیوں کو تاریک اور پسماندہ زندگی سے نجات ہی نہیں ملے گی بلکہ ان کی زندگی میں ترقی اور خوشیوں کی شمع روشن ہو جائے گی۔ اِسی کا اثر ہے کہ سرسید احمد خاں نے اپنے رسائل و جرائد میں ادبی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی موضوعات کو سرفہرست رکھا۔

سرسید احمد خاں کی کوششوں اور سوسائٹی نے نہ صرف حکومت برطانیہ کی خوشنودی حاصل کی بلکہ وطن کا دانشور طبقہ جو اب تک سرسید کی مخالفت کر رہا تھا ان کو یہ احساس دلا دیا کہ بے قصور ہندوستانیوں کی ترقی اور بقا جدید تعلیمی نظام میں پوشیدہ ہے۔

انگریز افسران اور مستشرقین کے خطوط صاف طور پر اشارہ کر رہے ہیں کہ حکومت برطانیہ کے حکمرانوں میں ظالم حاکموں کے ساتھ ساتھ نیک دل، عدل پسند اور مخلص حضرات بھی موجود تھے۔ جنھوں نے نہ صرف ہندوستانیوں کی ترقی کے لیے کام کیے بلکہ سرسید کی ہر ممکن مدد بھی کی۔ خطوط کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز افسروں نے جس طرح سے روپے، پیسے سے مدد کی یا سرسید کا کوئی کام آسانی سے کرا دیا یا تحریک میں شامل ہونے کی پیش کش کی بلکہ انھوں نے سرسید کو نیک مشوروں سے بھی نوازہ اور وہ راہ بھی دکھائی جس سے حکومت برطانیہ کی خوشنودی اور امداد حاصل کی جا سکے۔ اس نقطۂ نظر سے ''جان مری کنیڈی'' John Murray Kennedy ایک خط میں سرسید احمد خاں کو لکھتے ہیں کہ:

''کلکتہ، ۲۰/اپریل ۱۸۷۳ء

جنابِ من!

میں نے ایک ہزار روپے کے ڈرافٹ کے لیے انگلستان لکھ دیا ہے۔ امید ہے کہ اب سے تقریباً کوئی ساتھ آٹھ ہفتے بعد آپ کو بنارس میں مِل جائے گا....''8

'جان مری کنیڈی' سرسید کو مزید مشورہ دیتے ہوئے خط میں آگے لکھتے ہیں:

''یہ سیکریٹری اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی کو واجب الادا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اگر آپ انگلستان والوں سے یا ان اصحاب سے عطیات حاصل کرنا چاہتے ہیں جن سے ملاقات کا موقع نہیں مل سکتا تو ان لوگوں کے نام ایک گشتی مراسلہ تحریر فرمائیں اس باب میں کہ مسلمانوں کی تعلیمی حالت نہایت پست ہے۔''9

سرسید احمد خاں کی شخصیت کا ہی اثر تھا کہ کالج میں حکومت برطانیہ اوران کے افسر دلچسپی لے رہے تھے۔ کسی نہ کسی بہانے سے ادارے میں امداد کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ وہ صرف نئی تجاویز پیش نہیں کرتے تھے بلکہ کالج کی ترقی کے لیے نئی جماعت Classes اور نئے 'مضمون' Subject کی معلومات بھی فراہم کرتے تھے۔ بلکہ اس کا نصاب اور طریقۂ ترسیل بھی بتاتے تھے۔ ایک انگریز افسر 'جے. بی. فلر' J.B.Fuller نے ۱۸۷۹ء میں سرسید احمد خاں کو ایک خط لکھا جس میں کالج کے لیے 'زراعتی جماعت' شامل کرنے کا مشورہ دیا۔ تاکہ کالج میں صرف نئے درجہ کا اضافہ ہی نہ ہو سکے بلکہ کالج ترقی کی منزلیں بھی طے کر سکے۔ خط کے چند اقتباسات ملاحظہ کریں جس سے سرسید کے تعلیمی ادارے کی اہمیت اور افسران کی دلچسپی ظاہر ہوتی ہے:

''محکمہ 'زراعت وتجارت، صوبہ 'شمال مغربی اودھ

کانپور، ۱۴/ مارچ ۱۸۷۹ء

محترم سید احمد صاحب

یہ خط آپ کو ایم. اے. او. کالج میں زراعتی جماعت کے اجرا کے متعلق لکھ رہا ہوں۔ اس موضوع پر اس سے قبل مختصراً بات چیت بھی ہو چکی ہے... گورنمنٹ کی خواہش ہے کہ زراعتی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ میں اس بارے میں مسٹر بیک کا بالکل ہم خیال ہوں کہ ملکی ضروریات کے مطابق اصلاحاتِ زراعت کے متعلق مواد اور اسباب ہمیں میسر نہیں اور نہ ہی ہم اس قابل ہیں کہ سرِ دست زراعت کی تعلیم کے لیے علیحدہ کالج قائم کر سکیں۔''10

خط کے اس حصہ میں جہاں ایک طرف حکومت برطانیہ کی ہمدردی اور تعاون ظاہر ہوتا ہے وہیں اس کی مجبوری بھی سامنے آتی ہے جہاں وہ سرسید کی مدد طلب کر رہی ہے۔ خط میں جے. بی. فلر آگے لکھتے

ہیں:

''سب سے پہلے آپ کا کالج میرے ذہن میں آتا ہے۔اس لیے آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اور آپ کی کمیٹی ایک قابل استاد کا تقرر کر سکے گی جو کیمیا اور علم نباتات پر لیکچر دے۔ایک استاد محکمے کی طرف سے بھیج دیا جائے گا جو علم زراعت پر لیکچر دے گا اور ان علوم کے اصولوں کو اُن زرعی اصلاحات میں سمونا سکھائے گا جو اس ملک میں کامیاب ثابت ہو چکی ہیں.....گورنمنٹ اس کے لیے امدادی رقم ادا کرے گی.....میرے خیال میں زراعتی جماعت آپ کی تعلیمی سرگرمیوں میں ایک موزوں اضافہ ثابت ہوگی۔''11؎

ہندوستان کی زمین کاشتکاری کے لیے دنیا میں منفرد اور زرخیز مانی جاتی ہے۔لیکن تکنیکی طور پر اور تعلیمی نقطہ نظر سے اس میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکا بلکہ اکثر و بیشتر کاشتکار زمین کی پیداوار بڑھانے کے لیے روایتی طور طریقہ استعمال کرتے تھے۔اسی لیے حکومت برطانیہ نے ۱۸۷۹ء میں سر سید احمد خاں کے ذریعہ زراعتی تعلیم کی ابتدا کے لیے امداد طلب کی تا کہ ہندوستان کے کاشتکاروں کی ترقی کے ساتھ ساتھ ملک میں فصلوں کی پیداوار میں اضافہ کیا جا سکے۔جس سے حکومت برطانیہ اور ان کی فوج کے اناج کم نہ پڑیں۔لہٰذا انھوں نے صرف اضافی مضمون ہی نہیں بلکہ استاد اور ان سب پر خرچ ہونے والی رقم دینے کا وعدہ بھی کیا۔جے.بی.فلر J.B.Fuller نے خط میں 'علم کیمیا' اور 'نباتات' کے ساتھ ساتھ زراعتی جماعت کی تعلیم سے سر سید کے تعلیمی مشن میں پختگی اور فائدہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔پروفیسر ابوالکلام قاسمی سر سید کے تعلیمی مشن میں زراعت اور سائنس کی اہمیت کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''سرسید چاہتے تھے کہ وہ جدید سائنسی علوم، جن کا فروغ اس وقت یورپ میں ہو رہا تھا ان کو معلومات کی سطح کے ساتھ عملی طور پر ہندوستانی عوام سے نہ صرف متعارف کرایا جائے بلکہ ہندوستانی زراعت کے وسیلے سے یہاں کی معاشیات سے ان کا رشتہ استوار کیا جائے۔ سرسید نے بڑی گہرائی کے ساتھ ماضی قریب میں رونما ہونے والے قحط اور زمینی پیداوار میں تخفیف کو دیکھا اور محسوس کیا تھا، اس سے ان کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ جس علم کے ذریعے زمین کی پیداوار میں اضافہ کیا جا سکتا ہے اس سے ہندوستانیوں کو پوری طرح واقف کرایا جائے۔''12

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے سرسید اور مضمون 'زراعت' کے متعلق جو گفتگو کی ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے افتخار عالم خاں اپنی کتاب 'سرسید اور ہندوستانی نظام زراعت' میں فرماتے ہیں کہ:

''سرسید نے علم فلاحت پر کتابوں کے صرف ترجمے کروانے ہی پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ ہندوستانی زراعت کی ضرورت کے پیش نظر طبع زاد کتابیں لکھوانے کی کوشش بھی کی تھی۔ اس سلسلے میں سرسید کا مندرجہ ذیل خط مورخہ ۲۲/جولائی ۱۸۶۴ء خاصہ اہم ہے جو لندن میں مقیم ان کے اپنے ایجنٹ (مسیسر زاسمتھ اینڈ کمپنی) کے نام لکھا گیا تھا جس میں زراعت پر ایک طبع زاد کتاب لکھوانے کے سلسلے میں اپنی ترجیحات کا مفصل بیان قلم بند کیا گیا ہے۔''13

ابوالکلام قاسمی اور افتخار عالم خاں کے بیانات صاف اشارہ کرتے ہیں کہ سرسید احمد خاں مضمون 'زراعت' کا پرچہ اپنے کالج میں ضروری سمجھتے تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ حکومت برطانیہ خود اس کام

میں پہل کرے اور یہی بات جے. بی. فلر J.B.Fuller کے خطوط سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ خود سر سید کے کالج میں درجہ کا اضافہ کرنے پر زور صرف اس لیے دے رہے ہیں کیوں کہ حکومت برطانیہ ابھی اس حالت میں نہیں ہے کہ وہ نیا کالج یا ادارہ 'زراعت' کی تعلیم کے لیے کھول سکے۔ لہٰذا یہاں پر سر سید احمد خاں کی دیرینہ سوچ اور وسعت نظری صاف ظاہر ہوتی ہے کہ کیسے وہ اہل وطن کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش رہے ہیں وہ بھی بغیر کسی غرض اور احسان کے۔ سر سید کی تعلیمی بصیرت اور ان کی عالمانہ شان پر جتنی گفتگو کی جائے کم ہے۔ خطوط کے سلسلہ کی اگلی کڑی میں ان خطوط کو شامل کیا گیا ہے جن میں بالواسطہ طور پر انگریز افسران نے ہندوستانیوں کی تعلیمی ضروریات کو سمجھتے ہوئے سر سید کو ان طریقوں سے روشناس کرایا جن سے سر سید کی کوششیں کامیاب ہوں جائیں۔ 'ایم کیمپسن' M.Kempson کا خط ملاحظہ کریں جس میں انھوں نے ہندوستانی عوام کی تعلیم اور اپنی نیک خواہشات ظاہر کی ہیں:

''بخدمت سید احمد خاں، پرنسپل، صدر امین۔ غازی پور

بریلی، ۳۰ ستمبر ۱۸۶۳ء

ڈیر سر!

ہندوستان کے لوگوں کی تعلیم کے بارے میں آپ کا خطاب میں نے بڑی مسرت کے ساتھ پڑھا اور میں لٹریری سوسائٹی کی تشکیل کے سلسلے میں آپ سے تعاون کا خواہش مند ہوں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ سب سے پہلے آپ اس اہم معاملے کو سامنے لائے ہیں۔ کیوں کہ اس قسم کی تحریک کی کامیابی کی ضمانت جب ہی دی جاسکتی ہے جب یہ ان لوگوں کی طرف سے چلائی جائے جن کو براہ راست اس سے فائدہ

پہنچنے کی توقع ہو۔۔۔اس سلسلے میں آپ کی مقدور بھر امداد کرنے سے
مجھے خوشی ہوگی۔''14؎

سرسید کی زندگی کے ہر ایک قدم پر ان کی شخصیت کا اثر بخوبی دکھائی دیتا ہے۔'ایم کیمپسن' M.Kempson بھی ان سے اس قدر متاثر تھے کہ سرسید کے لیے ہمیشہ راہیں ہموار کرتے رہے لہٰذا اسی خط کے آخر میں 'ایم کیمپسن' M.Kempson نے سرسید کو لکھا ہے کہ:

''میں نے یہاں کے مقامی اخبارات کے ایڈیٹروں کو ہدایت کر دی
ہے کہ آپ کا ایڈریس شائع کر دیں۔ بلاشبہ آپ کی تجویز جب منظر
عام پر آئے گی اور بالغ نظر کمیٹی کے زیر انتظام ہوگی تو یقناً قبول عام
کا درجہ حاصل کرے گی۔''15؎

بلاشبہ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے نہ صرف سرسید کے مشن کو قوت بخشی بلکہ قدم قدم پر رہنمائی بھی فرمائی۔حکومتی امداد کے علاوہ ان حضرات نے ذاتی طور پر بھی سرسید احمد خاں کو تنہا نہ چھوڑا اور مختلف ذرائع سے ہر ممکن امداد کی۔ یہ عام بات ہے کہ جب کوئی شخص معاشرے سے مختلف کچھ ترقی کی راہیں تلاش کرتا ہے یا اپنی منفرد طبیعت کا انکشاف کرتا ہے تو سماج انہیں اپنی تنقید کا نشانہ بناتا ہے،اس کی استعداد کو کسوٹی پر پرکھتا ہے،تمام طرح کے مسائل اس کی راہ میں پیدا کیے جاتے ہیں۔لیکن سرسید کے ساتھ اس سے بھی بڑھ کر مشکلات درپیش تھیں۔انھیں صرف معاشرے کی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا تھا بلکہ تعلیم یافتہ دانشوران طبقہ کا بھی سامنا کرنا تھا۔اپنے خواب اور ہندوستانیوں کی ترقی کے لیے انھیں معاشرے،علمائے کرام اور دانشوان ادب کے ساتھ ساتھ اپنے عزیز دوستوں کو بھی یقین دلانا تھا کہ یہ جو مشن میں نے شروع کیا ہے وہ میرے یا تمہارے لیے نہیں بلکہ ہندوستان کی آنے والی نسلوں کے روشن حال و مستقبل کے لیے ہے۔اپنی بزرگی کی آخری منزلیں طے کرتے ہوئے سرسید احمد خاں نے بالآخر اپنے خواب کی بنیادوں کو مضبوط ہوتے ہوئے دیکھا۔1898ء میں اپنی زندگی کی آخری سانس لینے سے پہلے انھوں نے ہندوستان کو'' محمڈن

اینگلواورینٹل کالج'' کی شکل میں قدیم وجدید تعلیمی ادارہ تحفہ میں دیا۔

انگلستان میں کیمبرج یونیورسٹی کے تعلیمی نظام ،'ٹیٹلر' اور'اسپیکٹیٹر' جیسے جرائد کی طاقت سے سرسید کے مشن کو نئی راہیں دکھائی دیں۔ان کی سوچ ہندوستانیوں کے لیے مشعل راہ بنی،تاریکی میں گم ہندوستانی عوام کو سرسید نے انسانیت اور محبت کا پیغام دیا،دنیاوی علوم وفنون کے ساتھ ساتھ جدید نظام تعلیم سے روبرو کرایا۔بالآخر ۱۸۵۷ء میں'اسباب بغاوت ہند' سے جو سفر سرسید نے شروع کیا تھا اسے ۱۸۷۵ء میں'مدرسۃ العلوم' کی شکل میں پہلی کامیابی حاصل ہوئی اور سرسید احمد خاں کا یہی سفر مندرجہ بالا خطوط کی روشنی میں پائے تکمیل کو پہنچتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔یہاں خطوط کے حوالے سے ایک بات واضح کرتا چلوں کہ یہ تمام خط جو اس مقالے میں شامل ہیں وہ انگریزی زبان میں لکھے گئے تھے جنھیں انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی کتاب'' Letters To and From Sir Syed Ahmad Khan میں شائع کیا گیا ہے۔اسی کتاب کی روشنی میں یہ مقالہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے تاکہ سرسید احمد خاں کی کاوشوں کو ایک مختلف زاویۂ نظر سے دیکھا جاسکے۔

حواشی:

1. Letters To and From Sir Syed Ahmad Khan,Edited By Muhammad Ismail Panipati,Board for Advancement of Litrature Club Road, Lahor Pakistan, 1993, Page no.296-298

2. Letters To and From Sir Syed Ahmad Khan,Edited By Muhammad Ismail Panipati, Board for Advancement of Litrature Club Road, Lahor Pakistan, 1993, Page

no.296-298

3. افکار سرسید کی عصری معنویت، ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی، ص ۱۰۹-از خطبات سرسید، محمد اسماعیل پانی پتی، جلد ۲، ص ۵۷، ۴۷

4. Letters To and From Sir Syed Ahmad Khan,Edited By Muhammad Ismail Panipati, Board for Advancement of Litrature Club Road, Lahor Pakistan, 1993, Page no. 282-284

5. Letters To and From Sir Syed Ahmad Khan,Edited By Muhammad Ismail Panipati, Board for Advancement of Litrature Club Road, Lahor Pakistan, 1993, Page no. 282,283,284,285

6. Letters To and From Sir Syed Ahmad Khan,Edited By Muhammad Ismail Panipati, Board for Advancement of Litrature Club Road, Lahor Pakistan, 1993, Page no. 307,308

7. Letters To and From Sir Syed Ahmad Khan,Edited By Muhammad Ismail Panipati, Board for Advancement of Litrature Club Road, Lahor Pakistan, 1993, Page no. 307,308,309

8. Letters To and From Sir Syed Ahmad Khan,Edited By

Muhammad Ismail Panipati, Board for Advancement of Litrature Club Road, Lahor Pakistan, 1993, Page no. 349-351

9. Letters To and From Sir Syed Ahmad Khan,Edited By Muhammad Ismail Panipati, Board for Advancement of Litrature Club Road, Lahor Pakistan, 1993, Page no. 349-351

10. Letters To and From Sir Syed Ahmad Khan,Edited By Muhammad Ismail Panipati, Board for Advancement of Litrature Club Road, Lahor Pakistan, 1993, Page no. 320-322

11. Letters To and From Sir Syed Ahmad Khan,Edited By Muhammad Ismail Panipati, Board for Advancement of Litrature Club Road, Lahor Pakistan, 1993, Page no.320,321-322,323

سرسیداور ہندوستانی نظام زراعت، پروفیسرافتخارعالم خاں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

12. ،دہلی۲۰۱۴ء،ص۳

سرسیداور ہندوستانی نظام زراعت، پروفیسرافتخارعالم خاں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

13. ،دہلی۲۰۱۴ء،ص۵۹

14. Letters To and From Sir Syed Ahmad Khan,Edited By

Muhammad Ismail Panipati, Board for Advancement of Litrature Club Road, Lahor Pakistan, 1993, Page no.337-338

15. Letters To and From Sir Syed Ahmad Khan,Edited By Muhammad Ismail Panipati, Board for Advancement of Litrature Club Road, Lahor Pakistan, 1993, Page no.337-339

غالبؔ کے خطوط میں زندگی کی کہانیاں

دنیائے ادب میں مرزا اسداللہ خاں غالبؔ اور اُن کے خطوط کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔جس طرح اُن کی شاعری دل و دماغ پر اثر کرتی ہے اُسی طرح سے اُن کے خطوط میں بھی زندگی کی کہانیاں بنتی نظر آتی ہیں۔اِس طرح سے یہ دونوں کی کہانیاں بنتے نظر آتے ہیں۔

غالبؔ نے اپنے خطوط میں اصلیت، واقعیت اور سادگی پر زور دیا ہے۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالبؔ کے خطوط میں زندگی کے جو نشیب و فراز، شکست و ریخت دکھائی دیتی ہے وہ ایک طرح سے عوام کی زندگی کو دیکھنے کی کوشش بھی ہے۔اور اس سے نہ صرف عوام بلکہ خواص بھی ذہنی طور پر بیدار ہو گئے۔اور شاید یہ بیداری زندگی کی حقیقتوں کی طرف زیادہ اثر انداز ہوتی نظر آتی ہے۔

غالبؔ نے اپنے خط ایسے انداز میں لکھے کہ معلوم ہوتا ہے کہ دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں یا اسٹیج پر کوئی ڈرامہ ہو رہا ہے۔اور کردار زندگی کی کہانیاں پیش کر رہے ہیں۔چنانچہ اُن کے خطوط میں اس طرح زندگی پیش ہے۔یوسف مرزا کو لکھتے ہیں۔

یوسف مرزا!!

> ''کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا! اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب صبر کیا کرو۔مگر صبر؟ یہ ایک شیوہ فرسودہ ابنائے روزگار ہے۔تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں۔اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور یہ لوگ اُسے کہتے ہیں تو نہ تڑپ۔بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا۔ صلاح اِس امر میں نہیں بتائی جاتی۔دُعا کو دخل نہیں دوا کا لگاؤ نہیں۔پہلے بیٹا مرا پھر باپ مرا، مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ

ڈاکٹر طاہرہ پروین، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ایس۔ایس۔کھنہ ڈگری کالج، پریاگ راج، 211002

بے سر و پا کس کو کہتے ہیں؟ تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو‘‘۔

یہیں سے غالبؔ اپنے کو دوسروں سے الگ کر لیتے ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ موت کے بعد صرف ایک ہی چارہ رہ جاتا ہے صبر و تسکین اور اکثر لوگ موت کے بعد صبر سے کام لینے کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن غالبؔ زمانے کی قدیم روایات کے برعکس صبر و تسکین اور تعزیت کی صورتِ حال کو ہی بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ اور اُس سچائی کو سامنے لاتے ہیں کہ جہاں پر اصل اور مجبوراً کلیجہ مُنھ کو آتا ہے، بھلا کیوں کر ایسے وقت میں صبر آنے لگے، اور کیوں کر آدمی نہ تڑپے۔ یہ ساری باتیں ضبط سے باہر کی ہیں۔ اور یہی زندگی کی سچائیاں بھی ہیں۔ جن کا سامنا ہر شخص کو کرنا پڑتا ہے۔ غالبؔ نے اپنے خطوط میں زندگی کی جو تصویریں پیش کی ہیں وہ بالکل فطری اور حقیقی ہیں۔ یہ خط اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ غم کسی کا بھی ہو غم تو غم ہے اور غم کے لیے رونا دھونا بیکار ہے۔ غم کو ضبط کر کے غالبؔ ایک نئی دُنیا اور ایک نئی زندگی کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اور بڑی صاف گوئی سے یہ بھی کہہ دینا چاہتے ہیں کہ جب تک زندگی ہے غم بھی ہے اور زندگی کے خاتمے کے ساتھ ہی غم سے نجات ملے گی اِس لیے ہمیں غم کو ختم کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ یہ ایک طرح سے زندگی کی حقیقت بھی ہے اور انسانی زندگی کی دل چسپ کہانی بھی کہ جس کے بغیر زندگی کی تکمیل ممکن ہی نہیں۔

غرض کہ غالبؔ بڑے ضبط کے ساتھ انسانی زندگی کی شکست و ریخت، تباہ ہوے کا غم، زندگی کی شکستوں کا ایک طویل سلسلہ، ان سب صورتوں کو اپنے خطوط کے ذریعے انسانی جذبات، کیفیات اور اخلاقیات ان تمام پہلوؤں کی عکاسی اپنے مؤثر انداز میں کرتے ہیں۔ اِس میں رحم دلی بھی باقی رہتی ہے اور زندگی سے بیزاری کی صدا بھی نکلتی ہے۔ غالبؔ کی یہی خوبی اُن کی عظمت کی دلیل بھی بن گئی ہے۔

ایک اور جگہ روزمرہ زندگی کی بے اعتباریوں اور سماجی ناانصافیوں سے بھی روبرو کراتے چلتے ہیں۔ میر مہدی مجروح کے نام اِس خط میں لکھتے ہیں:۔

’’میری جان تو کیا کیا کہہ رہا ہے۔ بنئے سے سیانا سو دیوانہ، صبر و تحمل

وتوکل ورضا شیوہ صوفیہ کا ہے۔ مجھ سے زیادہ اُس کو کون سمجھے
گا۔ جو تم مجھ کو سمجھاتے ہو۔۔۔۔۔۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ میں شیخ
چلّی کی طرح سے یہ خیال باندھتا ہوں کہ مرغی مول لوں گا اور
اُسی کے انڈے بیچ کر بکری خریدوں گا اور پھر کیا کروں گا اور
آخر کیا ہوگا''۔

سچ بات تو یہ ہے کہ غالبؔ کا خیال ہے کہ حقیقت پسندی کا اندازہ اُس وقت تک نہیں لگایا جا سکتا جب تک اس میں زندگی کی اقتصادی صورتیں معاشی اور معاشرتی طبقات کا فرق ادبی اور سائنٹفک نظریات کی بنیاد پر نہ ہو۔ غالبؔ کو انسان اور اُن کے آپسی تعلقات میں ایک محبت کی تلاش رہتی ہے اور یہ کیفیت اُن کے خطوط اور شاعری دونوں سے معلوم ہوتی ہے اُن کا سارا زور ہوتا ہے 'آدمی پر' دُنیا کی ناانصافیوں پر، اور آدمیوں کی چالاکیوں سے نجات کی طرف دیکھنے میں، اِن تمام صورتوں کو لے کر غالبؔ انسان کے اگلے اقدام کی بہتری کی طرف گامزن نظر آتے ہیں۔

انہیں تمام عناصر کے بیچ غالبؔ کی فکری محور کی جستجو، آدمیت کی متلاشی ہوتی ہے۔ کیوں کہ دُنیا کا سارا کھیل آدمی کی خوبیوں، خامیوں پر ہی منحصر ہے۔ پھر آدمی کی خوبیوں اور خامیوں کو تلاش کرنا، پھر اُن پر دُنیا کا دارومدار ہونا، یہ بڑی چیزیں غالبؔ نے تلاش کی ہیں۔ کیوں کہ غالبؔ سمجھتے تھے کہ انہیں سے بہتر زندگی کے راستے نکل سکتے ہیں۔

جس سے انسان دوستی اور عوام دوستی بھی باقی رہے گی۔ میر مہدی مجروح کے نام ایک خط لکھتے ہیں۔

''واہ حضرت کیا خط لکھا ہے۔ اِس خرافات کے لکھنے کا فائدہ،
بات اتنی ہے کہ میرا پلنگ مجھ کو ملا، میرا بچھونا مجھ کو ملا، میرا نام
مجھ کو ملا، میرا بیت الخلا مجھ کو ملا۔''

آگے اور کہتے ہیں۔

''اُن سے میرے خط کے جواب کا تقاضا کیوں نہیں کرتے۔ حُسن بھی کیا چیز ہے۔ نادر کا اتنا خوف نہیں جتنا حسین آدمی کا ڈر ہوتا ہے۔ برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کے قہر سے قاسم جان کی گلی سادت خان کی ہنر ہے۔''

اس خط میں مخاطبت تو میر مہدی مجروح سے ہے مگر اس سطروں میں جو غالبؔ کی مجبوریاں اور پریشانیاں ہر طرف سے جھانکتی نظر آتی ہیں۔ اُن پر بھی قاری اور سامعین کو نظر رکھنا چاہئے کہ برسات نے غالبؔ پر کیا ستم ڈھایا ہے غالبؔ کی غربت اور تنگ دستی نے انھیں اس طرح مجبور کر رکھا تھا کہ وہ ایسے پریشان کرنے والا مکان اور محلّے کو بدل کر کسی کی رہائش گاہ میں منتقل نہیں کر سکتے تھے۔

اِس عبارت کو دیکھ کر غالبؔ کے خطوط میں مزاحیہ انداز کی جھلک محسوس ہوتی ہے وہ اپنی بات کو کبھی طنز اور کبھی مزاح کی چاشنی میں پرو کر زندگی کی حرارت کو پیش کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا لطف اندوز ہو جاتا ہے۔ بقول خالد عزیز:۔

''غالبؔ کا ذہن زندگی کی حقیقتوں سے باخبر تھا وہ جانتے تھے کہ وقت کی غم پرستی زندگی کو ادھورا کر دیتی ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی تحریروں کو مزاح و شگفتگی دی۔ وہ کبھی شب و روز کی کیفیت میں ہنستے، کبھی رسم و رواج پر مسکراتے۔ مگر اس مزاح کا انداز یہ رکھا کہ وہ مذاق اور مرتبہ کے مطابق وہ اپنی اِس خصوصیت میں شگفتگی اختیار کرتے ہیں۔ ایسے مواقع پر بھی اُن کا مقصد قاری کو دُکھ اور کرب کی فضا سے نکال کر تازہ دم مسرت کی فضا میں لانا ہوتا ہے۔''

(خالد عزیز۔ پاکستان)

غالبؔ حاتم علی کے نام جو خط لکھتے ہیں اُس میں اُن کے غم میں اِس طرح شامل ہوتے ہیں۔ مہر علی کی بیوی کے مرنے پر اُس طرح کا انداز اختیار کرتے ہیں گویا اُن کے غم کو غلط کرنے کا ایک طریقہ اختیار کیا ہے۔

''کسی کے مرنے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے کیسی اشک فشائی کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر بجا لاؤ کہ غم نہ دکھاؤ، اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی، میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے، اس تصور سے بھی گھبراتا ہے اور کلیجہ مُنھ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ اجیرن ہو جائے گی، طبعیت کیوں نہ گھبرائے گی؟ وہی زمردیں کا رخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ چشم بردو! وہی ایک حور بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔''

سچ بات تو یہ ہے کہ غالبؔ اسلامی شان اور اسلامی شرحوں کی باریکیوں سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ زندگی کی حرارت کے انداز میں ایسی کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ جہاں پر شراب حرام ہو اور دُعا کیوں کر قبول ہو، دونوں کو باہم ایسے جوڑتے ہیں کہ اس میں لطف پیدا ہو جاتا ہے اور بات میں صداقت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ دیکھیے کیا کہتے ہیں اس کے لئے۔

''ذرا یہ تو بتاؤ جس کے پاس شراب موجود ہے پھر اُس کمبخت کو اور کون سی دُعاء کی ضرورت ہے۔''

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

''قبلہ حدیث بالکل صحیح ہے مگر بات یہ ہے کہ جہاں شیطان قید رہتا
ہے وہ یہی کوٹھری ہے جہاں میں رہتا ہوں۔''

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالبؔ نے انشا پرداری کا جو انداز اختیار کیا یہ ایک اچھی اور نئی پیشکش ہے۔ غالبؔ کے یہاں ایک نئے انداز سے ملتی ہے کہ لوگ کچھ باتوں اور چیزوں کو پوشیدہ رکھتے ہیں اور چھپ چھپا کر کام کرتے ہیں جو یقیناً غلط اور نامناسب ہے اُس کے انکار اور اقرار کی صورت بھی واضح نہیں کرتے ہیں۔ اِس کے برعکس ہر بات کا اشارہ اس کی خوبی اور خامی کے تمام عناصر کے ساتھ باقاعدہ اعلان کرتے چلتے ہیں۔ اور یہ اعلان اُن کا طنزیہ اور ظریفانہ ہوتا ہے۔ مثلاً شراب نوشی کا ذکر اکثر لوگ چھپاتے ہیں۔ غالبؔ ہر جگہ اُس کا اعلان بے تکلف ہو کر کرتے ہیں۔ ایک جگہ منشی بخش کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''دھوپ بہت تیز ہے روزہ رکھتا ہوں۔ مگر روزے کو بہلاتا رہتا
ہوں۔ کبھی پانی پی لیا۔ کبھی حقّہ پی لیا، کبھی کوئی روٹی کا ٹکرا کھا لیا،
یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں میں تو روزہ بہلاتا ہوں۔ اور یہ
صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھنا اور
چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔''

''سُنّی مسلمان ہوں چار کھڑی دن رہے روزہ کھول دیتا ہوں''

غرض کہ غالبؔ کے خطوط زندگی کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں۔ جس میں ایک پورے دور کی سماجی، معاشی اور کسی حد تک سیاسی زندگی کی کہانیاں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ بقول شمیم حنفی۔

''شاعر غالبؔ کی نظر میں معنی آفرینی کا جو بھی معیار رہا ہو، نثر نگار
غالبؔ کی دلچسپی خیالوں سے اتنی نہیں جتنی کہ انسانوں سے ہے۔
انسانوں سے دلچسپی اس حد کو پہنچی ہوئی ہے کہ نثر نگار غالبؔ کو اپنے

پیرائیہ بیان میں بھی سب سے زیادہ تلاش جن عناصر کی رہتی ہے وہ ادبی اور فنی عناصر نہیں، بلکہ انسانی عناصر ہیں۔ دونوں شخصی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر، ان خطوں میں انسانی زندگی کے سیکڑوں مظاہر بکھرے پڑے ہیں۔ یہ ایک پورے عہد، ایک پورے انسان، ایک پوری روایت کی ہاؤ ہو کا نقشہ ہے۔ اِن خطوں میں ہم غالبؔ کے سوانح پڑھتے ہیں، پھر تاریخ کو بھول جاتے ہیں۔ مگر جس فرد نے اور جس معاشرے نے تاریخ کے اس تجربے کا بوجھ اُٹھایا ہے، یہ سارے عذاب جھیلے ہیں، اِس تمام انسانی صورتِ حال کے پس پشت جو اجتماعی اور انفرادی روح کام کر رہی ہے اسے ہم اپنے سامنے موجود پاتے ہیں اور اُس کی آنچ پوری طرح محسوس کرتے ہیں۔''

(غالبؔ کی اردو نثر)

غالب کے خطوط کی انفرادیت کا خاص پہلو انسانی زندگی کے رشتے ہیں۔ انسان دوستی اور انسانی ہمدردی کی صداقتوں کا جو حسین امتزاج غالبؔ کی نثر میں ملتا ہے وہ شاید کہیں اور نہیں ملتا۔ ایک اقتباس دیکھتے ہیں:۔

''دھوپ میں بیٹھا ہوں یوسف علی خاں اور لالہ ہیرا سنگھ بیٹھے ہیں۔ کھانا تیار ہے خط لکھ کر بند کر کے آدمی کو دوں گا اور میں گھر جاؤں گا اور وہاں ایک دالان میں دھوپ ہوتی ہے اس میں بیٹھوں گا، ہاتھ منھ دھوؤں گا، ایک روٹی کا پھلکا، سالن میں بھگو کر کھاؤں گا بیسن سے ہاتھ دھوؤں گا باہر آؤں گا پھر اُس

کے بعد خدا جانے کون آئے گا کیا صحبت ہوگی؟''

بقول شمیم حنفی:۔

''اِس نثر میں یگانگت کا عنصر نمایاں ہے ہم اسے پڑھتے وقت غالبؔ سے مرعوب نہیں ہوتے، عام انسانی سطح اور غالبؔ کی انسانی سطح کے درمیان فوراً ایک رابطہ ڈھونڈ نکالتے ہیں''۔

(غالبؔ کی اردو نثر)

سچ بات تو یہ ہے کہ غالبؔ اپنی بات جس بے باکی سے کہتے ہیں اس میں بھی ایک مذاق کی چاشنی تو ہوتی ہی ہے، ایک چیلنج بھی نظر آتا ہے اور یہ چیلنج زندگی سے لڑنے کا ہنر اور سلیقہ دونوں سکھاتا ہے۔

ایک جگہ صبر و رضا اور قناعت پسندی کی بات کرتے ہوئے میر مہدی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

''میاں رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا ہے۔ اسی طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا، آگے خدا رزاق ہے کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔''

غرض کہ غالبؔ کے خطوط سے عملی زندگی میں زندہ رہنے کا سلیقہ آ جاتا ہے اور یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ آدمی زندگی کے مشکل لمحات میں بھی مسکرانے اور زندہ رہنے کی للک باقی رکھتا ہے۔

بقول ملک رام:

''مجھے جو اس میں سب سے زیادہ پسندیدہ چیز ہے وہ یہ ہے کہ وہ انسانی جذبات کو اچھے الفاظ میں اچھی ترکیب سے پیش کرتا ہے۔''

(غالبؔ نمبر علم و فن۔ دہلی ص ۸۸)

بقول یوسف حسین خاں:۔

''غالبؔ کو مقبول بنانے میں اُن کی انسان دوستی نے بھی بڑی مدد دی

وہ بڑے وسیع مشرب انسان تھے، اور انسانی عظمت وفضیلت
کو مانتے تھے۔''

سچ بات تو یہ ہے کہ غالبؔ زندگی کی انھیں سچائیوں کے ساتھ اپنی فکری بصیرتوں کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح سے شاعر اپنے سامع کو محسوسات کی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں پر محسوسات اپنے قاری پر اس طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں کہ زندگی درد وغم تو دوسری طرف تشفی اور محبت کی کہانیاں نظر آنے لگتی ہیں۔

غرض کہ غالب کے خطوط زندگی کے مشکل لمحات اور ناممکنات سے لڑنے کا جو ہنر رکھتے ہیں یہی زندگی کی وہ ناقابل فراموش کہانیاں ہیں جو غالبؔ کی شاعری اور اُن کی نثر میں تقریباً کہانیاں ہوگئی ہیں۔

بقول پروفیسر رشید احمد صویقی:۔

''دل کے معاملے میں غالب کو اُن کے اشعار کے انتخاب
نے رسوا کیا ہو یا شاعری میں اُن کی فکر وتخیل جاگتا ہے تو اُن
کے خطوط میں زندگی اور شخصیت کا حُسن اور حرکت ہے۔''

اسِ طرح غالبؔ کی زندگی کا ایک بہترین پیرایہ اُن کے خطوط میں چھپا ہوا ہے جس سے اثر لینے کے لئے اُن کے خطوط کو بار بار پڑھنا چاہئے۔

نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس: پروفیسر محمود الٰہی

اہل قلم حضرات خطوط نویسی کے ذریعے اپنی خلاقی و فنکاری کو بروئے کار لانے میں جس جانفشانی کا اظہار کرتے ہیں اور جس وسیلے کے اظہار کو اپنے پیرائے کے قالب میں ڈھالتے ہیں اس فنکارانہ صلاحیت کو ذوق شناسانِ ادب نے بطور صنف خطوط نویسی یا مکتوب نویسی کے لفظ سے آشکار کیا ہے۔

مکتوب عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی لکھا ہوا یا لکھا گیا کے ہیں۔ اصلاح عام میں مکتوب سے مراد ایسی نثری تحریر ہے جس کے ذریعے انسانی زندگی کے مد و جزر، نشیب و فراز، عروج و زوال، عادات واطوار، اخلاق، نفسیاتی زیر و بم غرض یہ کہ زندگی کے بعض مخفی گوشے اجاگر ہو جاتے ہیں۔

اہل قلم حضرات اپنے خطوط میں الفاظ کا معیار و میزان اور نشست و برخاست پر خاصی توجہ دیتے ہیں۔ خطوط ذاتی یا نجی بھی ہوتے ہیں اور ادبی خطوط بھی۔ مکتوب نگاری کے ضمن میں صدر الدین خاں آزردہ، نذیر احمد، حالی، وقار الملک، محمد علی جوہر، ظفر علی خاں، سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی، منٹو، میراجی، ابن انشاء یعنی کی طویل فہرست ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط جسے ''غبارِ خاطر'' کی شکل میں ہم پڑھتے ہیں اور دوسری کڑی میرے والد محترم پروفیسر محمود الٰہی ہیں جن کی نثر کی شیفتگی و شگفتگی کے اعلیٰ مظہر ان کے وہ خطوط ہیں جو وقتاً فوقتاً اپنے احباب و شاگردوں اور اہل خانہ کو لکھے جس کو فصاحت کے ساتھ ساتھ جذباتیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان کی شخصیت کی اعلیٰ ظرفی اور سلاست و فصاحت کا دریا بہتا معلوم ہوتا ہے۔ مجادلے اور مناظرے سے پاک ان کی اس طرح کی نثری تحریر کا محاکمہ اردو ادب میں خاص اضافہ ہے۔ جو نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی کے خطوط کو صرف کوری جذباتیت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ وہ نثری شاہکار کا ایسا نادر نمونہ ہے جس میں نثر کی اہم خاصیت کے ساتھ ساتھ شعریت بھی ہے جو طنز و تعریض سے پاک ہے اور لطافت سرچشمہ بھی

ڈاکٹر بشریٰ بانو، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو، مہیلا پی جی کالج، لکھنؤ

جس میں ان کے قدم نہیں بھی ڈگمگائے نہیں۔اعلیٰ مصنب پر قائم ہوتے ہوئے بھی ان کے قلم میں ہمیشہ اپنے معاصرین کی حوصلہ افزائی کی ان کی نثر میں ہے وہ ذخیرہ بھی اوراس کی افادیت اس امر میں مسلم ہے کہ ان کی تحریریں آج تک ذوقِ شناسانِ ادب نے محفوظ رکھا ہے آنے والی نسلیں جس کی معترف رہیں گی۔اوراہل قلم انھیں اپنی آنکھوں کا سرمہ بنائیں گی۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ والد محترم کی یہ نثری تحریریں کسی فکشن سے کم نہیں اب کے خطوط کے چند نمونہ پیش ہیں۔

محمود الٰہی بنام آزاد جگن ناتھ

۲۹/مارچ ۱۹۸۳ء

محی محترم!

سلام و نیاز

ایک مدت کے بعد ملاقات کا بہانہ ہاتھ آیا تو نیرنگیِ فلک کے بارے میں جو سنا تھا، وہ ''دیدہ'' کی حیثیت سے سامنے آرہا ہے۔

میں ۲/ اور ۵/اپریل کو مصروف رہوں گا۔ ایک جگہ Viva کرنا ہے اور پھر دوسری جگہ سیلیکشن کمیٹی۔ چھ کو کسی طرح نہیں پہنچ سکتا۔

اپریل میں ۱۶، ۱۷، ۱۸ کے علاوہ کسی دن بھی بلا لیجئے۔

آپ کے خط اور تار کا منتظر ہوں۔

امید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔

نیازمند

محمود الٰہی

......☆......

محمود الٰہی بنام آزاد محمد اسماعیل

۲رستمبر۱۹۹۴ء

سلام وتحیات

رجسٹرڈ ڈاک سے کتاب موصول ہوئی، کرمِ بے پایاں کے ذیل میں اسے شمار کروں گا۔

کتاب کا مقدمہ پڑھا اور بعض مباحث۔ فرض کفایہ سے ارفع کام آپ نے انجام دیا۔ سرورِ کائناتؐ نے سماجی انصاف ومساوات کا جو درس دیا تھا، آج اس کی معنویت اور بھی زیادہ ہے۔ ہم ہوا وہوس کے غلام ہوتے جا رہے ہیں اور اپنے محور سے اعراض کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ خدا ہمیں صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔

اس کا ہمیشہ خیال رہا ہے کہ آپ کو کسی مرکزی جگہ پر ہونا چاہئے لیکن خیال عمل کی صورت میں کیونکر آئے، اس کا راستہ تلاش کرنا چاہئے ابھی امبیڈکر یونیورسٹی کے خط وخال واضح نہیں ہیں۔ بہر حال مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا، ضرور کروں گا۔

فتح پور کی خانگی لائبریریوں میں بعض خطی نسخے ضرور ہوں گے۔ ان میں جو ادبی اہمیت کے حامل ہو، انہیں مرتب کر دیجئے۔ آپ تو عربی اور فارسی بھی جانتے ہیں۔ اب ایڈیٹنگ کا کام کرنے والے مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔

حسب مراتب سلام و دعا

والسلام

محمود الٰہی

.....☆.....

محمود الٰہی بنام اصغر عباس

۷/ مارچ ۱۹۷۶ء

عزیزی ڈاکٹر اصغر عباس

تسلیم

خط ملا، بے حد خوشی ہوئی۔ خدا یہ اعزاز مبارک کرے۔ بس اب مستقبل اور باعزت ملازمت کی منزل بھی قریب ہے۔ علی گڑھ آؤں گا تو مٹھائی کا انتظام کروں گا۔ مجھے اس سے کم خوشی نہیں ہوئی جتنی آپ کے والد محترم کو ہوئی ہوگی۔ میں ہمیشہ اپنے شاگردوں کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہوں اور اللہ کا شکر ہے کہ یہ خواہش پوری ہو رہی ہے۔

آپ کے لیے نکات الشعرا کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ علی گڑھ میں آپ کو مل جائے تو بھجوا سکتا ہوں۔ میں نسخے پر دستخط کر کے آپ کو نذر کرنا چاہتا تھا، علی گڑھ میں چند نسخے گئے ہیں جن پر میرے دستخط نہیں ہیں۔ بہرحال آپ جو کہیں، وہ کروں۔

سب لوگ اچھی طرح ہیں۔ والدہ صاحبہ قدرے بہتر

ہیں۔

والسلام

محمود الٰہی

......☆......

محمود الٰہی بنام اصغر عباس

۷ر ستمبر ۱۹۷۱ء

عزیزی ڈاکٹر اصغر عباس

تسلیم

خط ملا، حالات معلوم ہوئے۔ انھوں نے رسید ابھی تک نہیں بھیجی۔

میں رسید منسلک کر رہا ہوں۔ آپ وقت نکال کر احمد علی صاحب سے ان کے گھر پر ملاقات کیجیے اور اس رسید پر ان کے بھائی زاہد علی سے دستخط کرا لیجیے۔

یہ دو باتیں ذہن میں رکھیے:

۱۔ جو ٹکٹ چسپاں ہے، اس پر ان کی مہر لگوائیے۔

۲۔ دستخط زاہد علی کے ہوں گے کیونکہ میں نے منی آرڈر زاہد صاحب کو ہی بھیجا تھا۔ (منی آرڈر کی رسید میرے پاس ہے)

وہ تو ہمیشہ یہ کہیں گے کہ ابھی کچھ رقم واجب الادا ہے کیونکہ انھوں نے Rs.3.50 فی پرنٹ کا مطالبہ کیا ہے۔ میں نے Rs. 2.30 فی پرنٹ کے حساب سے دیا ہے کیونکہ اس سے زیادہ انہیں

کوئی نہیں دے سکتا۔ یونیورسٹی نے سخت اعتراض کیا ہے کہ Rs.3.50 ریٹ بالکل نامناسب ہے۔

آپ انہیں سمجھا دیجئے کہ وہی ریٹ دیا جائے گا جو بازار بھاؤ کے مطابق ہوگا۔ بہرحال اگر وہ کچھ اور چاہتے ہیں تو میں انہیں اپنے پاس سے ادا کردوں گا۔

رسید لینے کے بعد آپ ان سے اتنی چیزوں کا مطالبہ کیجئے:

۱۔ نکات الشعراء کی مائکروفلم

۲۔ تذکرۂ شورش کے بعض اوراق اور ساقی نامہ کے بعض اوراق کی مائکروفلم جو انھوں نے میرے دیے ہوئے مخطوطے سے تیار کی تھی اور پھر جس سے انھوں نے یہ پرنٹ تیار کیا۔

نوٹ:

یہ دونوں مائکروفلم بھی بے حد اہم ہیں، ان کے پاس نہ چھوڑئے گا۔ یہ مائکروفلم انھوں نے میرے مخطوطے سے میری فرمائش پر تیار کی تھی۔ آپ ان امور کا کسی سے ذکر نہ کیجئے گا۔ آپ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ آپ کی معرفت کسی اور سے پرنٹ کرانا چاہئے تھا مگر اب تو غلطی ہوگئی۔

آپ لکھنؤ کی کانفرنس میں شرکت کر رہے ہیں کہ نہیں؟ میں لکھنؤ آؤں گا، اگر موقع ہو تو ضرور آیئے۔

یہاں حالات بدستور ہیں، کوئی خاص بات قابل ذکر

نہیں۔ بارش سے کافی نقصان ہوا، اللہ رحم کرے۔ آپ کو بار بار زحمت دے رہا ہوں، کچھ خیال نہ کیجئے گا۔

اہلیہ اچھی ہیں اور سلام و دعا کہتی ہیں۔

والسلام

محمود الٰہی

نوٹ:

آپ مائکرو فلم اپنے پاس رکھ لیں۔ جب کبھی گورکھپور آیئے گا تو لیتے آیئے گا۔

.....☆.....

محمود الٰہی بنام اصغر عباس

۷/دسمبر ۱۹۸۳ء

عزیزی!

سلام مسنون

خط ملا۔ اچھا ہے کہ آپ ایک اور کتاب مرتب کر رہے ہیں۔ قاضی عدیل عباسی صاحب پر میں نے دو مختصر مضامین لکھے تھے۔ ایک قومی آواز میں آیا تھا اور دوسرا بستی کے ایک اخبار کے قاضی عدیل نمبر میں۔ اب اختر بستوی صاحب مرحوم پر ایک مجموعۂ مضامین شائع کر رہے ہیں جس میں میرا مضمون بھی شامل ہے۔ کتاب کی کتابت ہو چکی ہے، اختر صاحب پروف بھی پڑھ چکے ہیں، آج کل پروف کی تصحیح ہو رہی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ

۱۵/دسمبر تک وہ پریس میں چلی جائے گی اور اس کے بعد ہفتہ عشرہ میں شائع ہو جائے گا۔ میں یہ کتاب آپ کے پاس بھیجوا دوں گا تا کہ آپ مرحوم پر حسب خواہش کسی مضمون کا انتخاب کر لیں۔

ادھر لاری صاحب سے بس سرسری طور پر ملاقات ہوئی۔ یونین کا الیکشن ۱۲/کو ہے۔ شدید ہنگامے ہیں، آپس میں ہر دم تصادم کا خطرہ رہتا ہے اور پولس کی جان ضیق میں ہے۔ آپ کے چیک کے لئے لاری صاحب کو یاد دلا دوں گا۔ اور حالات بدستور۔ حسب مراتب سلام و دعا۔

والسلام

محمود الٰہی

.....☆.....

محمود الٰہی بنام اصغر عباس

۲۴/اگست ۱۹۹۰ء

عزیزی!

سلام و دعا

خط ملا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے یہ اعزاز بھی بخشا۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ .V.C ہو جاؤں لیکن قسمت کی بات کو کون ٹال سکتا ہے۔

میں نے مختصر مدت کے لئے یہ عہدہ سنبھالا تھا اور برابر

میں اس کی کوشش کررہا تھا کہ باہر کا کوئی آدمی عارضی طور پر یہاں آنے کے لئے تیار ہوجائے۔اب ایک صاحب تیار ہوگئے،جلد ہی آنے کی توقع ہےاور مجھےفرصت مل جائے گی۔

مجھے یونیورسٹی والوں کا تعاون ملا،اسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔صرف میرے نام پر وہ متفق الرائے ہیں،ارباب حل وعقد بھی کسی اور کو یہ عہدہ دینا نہیں چاہتے۔بہرحال باہر کے آدمی کو سب قبول کریں گے،ہرچند یہ تقرر بھی عارضی ہوگا۔

امید ہے کہ آپ سب اچھی طرح ہوں گے۔

والسلام

محمود الٰہی

.....☆.....

محمود الٰہی بنام ڈاکٹر تحریر انجم

۲۹؍دسمبر ۱۹۹۰ء

عزیزی!

دعائیں

آج صبح ایم کوٹھیاری راہی صاحب کو ٹیلی فون کیا تو انھوں نے دوران گفتگو بتایا کہ آپ کے والد صاحب محترم کا انتقال ہوگیا،ان اللہ وانا الیہ راجعون۔

آپ ان کی علالت کا ذکر اکثر کرتے رہتے تھے،آپ نے بڑی خدمت کی لیکن مشیت ایزدی کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔خدا

آپ کو اور دوسرے متعلقین کو صبر عطا کرے۔ دعا کر رہا ہوں کہ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

یہ کہنا آسان ہے کہ صبر کیجئے لیکن صبر کرنا بہت مشکل ہے، میں دعا کر رہا ہوں کہ خدا صبر کرنے کی طاقت آپ کو دے۔

میرے والد محترم کے انتقال پر بیس سال کی مدت گزر گئی ،صبر کرتا ہوں لیکن وہ روزانہ یاد آتے ہیں اور یہ محرومی مجسم سامنے آجاتی ہے کہ میں پدر بزرگوار کے سایے سے محروم ہوں! آپ تو ابھی کم عمر ہیں، آپ کو وہ اور زیادہ یاد آتے رہیں گے مگر اس یقین کو صدمہ نہ پہنچنے دیجیے کہ اللہ کی مرضٰ اور اس کا حکم ہمارے لیے سب کچھ ہے۔

دیگر متعلقین کو بھی میری طرف سے اور میرے گھر والوں کی طرف سے صبر کی تلقین کیجئے۔

محمود الٰہی

.....☆.....

محمود الٰہی بنام خلیق انجم

۳؍جنوری ۱۹۷۳ء

محبی ڈاکٹر خلیق انجم صاحب

تسلیم

تہنیتی کارڈ ملا۔ یہ سب آپ جیسے مخلص احباب کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ میں اس منزل تک پہنچا۔ الفاظ نہیں ہیں

کہ شکریہ ادا کرسکوں۔

سیکولر ڈیموکریسی ادھر نہیں مل رہا ہے۔ براہ کرم دفتر میں تاکید کر دیجئے کہ وی، پی کے ذریعہ میرے پاس بھیج دیا جائے۔

ادھر دہلی آنے کا ارادہ نہیں ہے لیکن جب آؤں گا تو ضرور ملاقات کروں گا۔

امید ہے کہ آپ اچھی طرح ہوں گے۔

آپ کا

محمود الٰہی

.....☆.....

محمود الٰہی بنام لاہوتی، سری نیواس

۱۱ر جولائی ۱۹۸۹ء

لاہوتی صاحب محترم!

تسلیم

گرامی نامہ ملا، تجویز بہت اچھی ہے، اسے اکادمی کی مجلس انتظامیہ کے سامنے پیش کردوں کہ موجودہ مالی سال میں یہ سمینار منعقد کیا جائے، قاضی صاحب کو برابر نظر انداز کیا گیا۔

صورت حال یہ ہے کہ موجودہ اکادمی کی مدت کار ختم ہو رہی ہے۔ ضابطہ یہ ہے کہ جب تک نئی اکادمی کی تشکیل نہ ہو عہدیداران اور اراکین سارے اختیارات کے ساتھ کام کرتے رہیں گے۔

مداخلت بیجا کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا لیکن ایک ذمہ داری

قبول کر لی تھی، اس سے عہدہ برآ ہونا تھا اور آپ حضرات کے تعاون سے مولانا آزاد والا سارا کام پورا ہو گیا۔

آپ نے ایک انگریزی اخبار کا تراشہ بھیجا تھا، اسی طرح کے مضامین لکھنؤ اور دہلی کے اخبارات میں بھی آئے تھے مگر کسی نے ان کا اثر قبول نہیں کیا اور اگر کیا تو اس کا علم نہیں۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اکادمی اور مولانا آزاد کے کام میں جو معاندانہ رویہ اختیار کیا گیا تھا اور جس کی اشاعت جنوبی ہند کے اخبارات میں بھی ہوئی تھی، آپ نے بروقت اس کی اطلاع مجھے دی۔

رسم اجراء کی تقریب دہلی میں ہوئی تھی اور سمینار لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ میں آپ کی خدمت میں رسم اجراء کے بارے میں ''رپورتاژ'' کی دو کاپیاں بھجوا رہا ہوں۔ براہ کرم ایک کاپی سیاست میں اشاعت کے لئے دے دیجئے اور دوسری کسی اور اچھے اخبار میں شائع کرا دیجئے۔ اس موقع پر کچھ تصویریں لی گئی تھیں، وہ لکھنؤ میں ہیں۔ اگر تصویریں مل گئیں تو ان میں سے کوئی نمائندہ تصویر بھی آپ کے پاس بھجوادوں گا تا کہ اخبار میں وہ بھی شائع ہو جائے۔ بس دو چار دن میں۔

لکھنؤ سے ڈاک لے کر جلد ہی کوئی آدمی آئے گا، میں نے سکریٹری کو لکھ دیا ہے کہ بعض تصویریں میرے پاس بھجوادی جائیں۔ مجھے سیاست اور بعض دوسرے اخبارات کا

صحیح پتہ نہیں معلوم ورنہ براہ راست بھجوا دیتا۔

ادھر ایک سال سے ''دو ماہی اکادمی'' کی باقاعدگی ختم ہوگئی تھی۔ میں سارا مواد یہاں لے آیا اور اسے مرتب کر دیا بلکہ کتابت بھی ہوگئی۔ ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر، جنوری، فروری کا چھپ گیا، آج لکھنؤ چلا جائے گا۔ مارچ اپریل کے شمارے میں آپ کا مضمون (نرالا کی شاعری) بھی شامل ہے، وہ زیر طبع ہے۔ مئی جون کا پرچہ ایک ہفتے میں چھپ جائے گا، کتابت ہو چکی ہے۔ اس طرح میں نے چیئرمین کے عہدے سے ہٹنے سے پہلے یہ کام پورا کر لیا۔

کیا فراق گورکھپوری پر اگر کوئی سیمنار اگست کے اواخر میں کیا جائے تو آپ یہاں آسکتے ہیں۔؟ ۲۸/اگست کو فراق کی تاریخ پیدائش ہے۔ سوچتا ہوں کہ ایک سیمنار کر دوں جس میں چار پانچ حضرات مقالے پیش کریں۔

جب رپورتاژ شائع ہو جائے تو متعلقہ اخبار کی دو کاپیاں بھجوا دیجئے گا۔ شکریہ

سیمینار کی رپورتاژ کی اشاعت کے بعد بھجوا دوں گا۔

نیازمند

محمود الٰہی

.....☆.....

محمود الٰہی بنام رضوی، سیّد محمد عقیل

۲۸/ستمبر ۱۹۸۱ء

محبی ڈاکٹر عقیل صاحب

سلام و نیاز

یہ خط میں آپ کو لکھنؤ سے لکھ رہا ہوں۔ یہاں دو تین دن سے پڑا ہوا ہوں۔ اگست تک کا خبر نامہ پریس جا چکا ہے، آج سے ستمبر اکتوبر کے مشترکہ شمارے کی کتابت شروع ہو رہی ہے۔ چھ اکتوبر کو یہ بھی پریس میں چلا جائے گا۔ ۱۲/ اکتوبر سے نومبر کے شمارے کی کتابت شروع ہو جائے گا۔ اس تشبیب کے بعد مدح کو نظر انداز کرتے ہوئے عرض مدعا اور حسن طلب تک آ رہا ہوں۔ ''فانی سیمنار'' پر رپورتاژ کی ضرورت ہے۔ آپ خود لکھیے یا کسی سے لکھوایئے اور جلد از جلد بھجوا دیجئے۔

''رپورتاژ'' طویل نہ ہو تو مختصر سہی لیکن خبر نامہ میں اس کی اشاعت لازم ہے۔ براہ راست سکریٹری کو بھیجئے اور مجھے گورکھپور مطلع کر دیجئے۔ میں تو آپ کا شکریہ اس بات پر بھی ادا کروں گا اگر آپ مجھے رپوتاژ لکھنے کے عزم کا مژدہ سنا دیں گے۔

وسط اکتوبر میں مجلس انتظامیہ ہو رہی ہے۔ ضرور آیئے گا۔ یہ کام میرے مزاج کے خلاف ہے لیکن بخدا ناکامی کے ساتھ رخصت نہیں ہونا چاہتا، کچھ کام ہو جائے تو اس عہدے کو خدا حافظ کہہ دوں۔

امید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔

والسلام

محمود الٰہی

.....☆.....

محمود الٰہی بنام ظہور الدین

۲۶/اکتوبر ۱۹۸۱ء

محبی!

تسلیم و تحیات

افسانوں کا مجموعہ ملا، شکریہ۔ کتاب کو دیکھ کر ایک تجسس سی کیفیت پیدا ہوئی اور سب سے پہلے وہی افسانہ پڑھا جو کتاب کا عنوان ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

آپ محسوس کر رہے ہوں گے کہ اب ہمارے یہاں افسانوی ادب میں جہاں اضافہ ہو رہا ہے، وہاں اس کے معیار کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ آپ کے افسانے قدرت فن اور فن کی پختگی کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔

امید ہے کہ آپ اچھی طرح ہوں گے۔

والسلام

محمود الٰہی

.....☆.....

محمود الٰہی بنام عابد رضا بیدار

۸؍دسمبر ۱۹۸۰ء

برادرم محترم

سلام مسنون

دسمبر کے آخری عشرے میں میرا قیام پٹنہ میں ہوگا۔ کوشش کروں گا کہ زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کروں۔ میرے ساتھ چند ریسرچ اسکالر بھی ہوں گے جو اپنے اپنے موضوعات تعین سے متعلق بھی مواد فراہم کریں گے اور میرا ہاتھ بھی بٹائیں گے۔

۱۹؍دسمبر کو بہار اردو اکادمی نے نصاب کی تدوین کے سلسلے میں مدعو کیا ہے۔ میں نے منظور کا خط لکھ دیا ہے۔

ادارۂ تحقیقات کے ضوابط پر کسی نے غور وخوض کیا۔ میں اس میں ایک بنیادی تبدیلی چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ ادارے کے نام میں قاضی صاحب کا نام شامل کیا جائے۔ اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں۔ جیسے

1-Birla Institute of Technology

2-Tata Institute of Social Sciences

اسی نمونے کے نام ہم لکھ سکتے ہیں۔ جیسے

قاضی عبدالودود اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، قاضی عبدالودود ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف اردو وغیرہ وغیرہ۔

جب نام پر اتفاق رائے ہو جائے گا تو اس کے پیش نظر

ضوابط میں معمولی سا حذف و اضافہ ہو جائے گا۔ باقی ضوابط ٹھیک ہیں۔ آپ کسی اچھے عنوان سے قاضی صاحب سے گفتگو کر لیجئے۔ پہلے قاضی مسعود صاحب کو تیار کیجئے۔ ہمیں نام کے شمولیت کے بارے میں غور کر لینا ہے۔ ہم قاضی صاحب کو مجبور کریں گے کہ وہ اپنے نام کے افسانے کی منظوری دے دیں۔

کل ایک صاحب کی معرفت جمیل اختر صاحب شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی کا ایک علمی تحفہ ملا۔ بے حد خوشی ہوئی کہ میرے پرانے شاگرد مجھے یاد کرتے رہتے ہیں۔ آپ سے صرف علی گڑھ کے رشتے سے یا علم کے رشتے سے خصوصی ربط نہیں ہے، اس میں یہ بھی شامل ہے کہ آپ کا تعلق رام پور سے ہے جہاں سے میں نے اپنی تدریسی زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا۔

اہلیہ محترمہ کو سلام، بچوں کو دعائیں۔

والسلام

محمود الٰہی

نوٹ:

شرمندہ ہوں کہ تقریباً ایک ماہ بعد ضوابط کے بارے میں آپ کو خط لکھ رہا ہوں، بے حد مصروف رہا۔ بار بار باہر رہنا پڑا۔ آج علی گڑھ جا رہا ہوں، پرسوں رات میں واپسی ہوگی۔

.....☆.....

محمود الٰہی بنام عبدالحق

۱۸؍جنوری ۱۹۷۹ء

عزیزی!

سلام مسنون

عرصے کے بعد خیریت معلوم ہوئی۔ سعادت مند اولاد والدین کی خدمت ہر حال میں کرتی ہے۔ اس سے بڑی بات کیا ہوگی کہ خدا نے آپ کو خدمت کا موقع دیا ہے۔ دعا کر رہا ہوں کہ آپ کے والد صاحب روبصحت ہوں۔ جب کسی ایسے شناسا سے ملاقات ہوتی ہے جو آپ سے بھی مل چکا ہے تو آپ کی تعریف وتوصیف میں جو کلمات اس کی زبان پر آتے ہیں، ان سے مجھے دلی مسرت ہوتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری تعریف ہو رہی ہے اور میں زندہ رہنے کا نیا حوصلہ پاتا ہوں۔

ادھر سفر سے پھر گھبرانے لگا ہوں، گزشتہ دو ماہ تقریباً گوشۂ عافیت میں گزار چکا ہوں۔ اب دہلی آ کر پھر سفر کا آغاز کروں گا۔

میں نے رات ٹکٹ خرید لیا مگر قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کس ٹرین سے ریزوریشن ملے گا۔ اسے قطعی شکل دینے کے لئے میں نے یہ سوچا ہے کہ دہلی اسٹیشن پہنچوں یا نئی دہلی۔ آپ سے نو اور ساڑھے نو بجے کے درمیان نئی دہلی اسٹیشن پر ملوں۔

آپ ساڑھے نو بجے قریب اسٹیشن کے (نئی دہلی) اس حصے میں آجایئے گا جہاں رٹائرنگ روم ہیں۔ میں بہرصورت اس کے ارد گرد چکر لگاتا رہوں گا۔ سامان (کپڑا تبدیل کر لینے کے بعد) کلوک روم یا ویٹنگ روم (اور اگر مل گیا تو رٹائرنگ روم) میں رکھ دوں گا۔ ترقی اردو بورڈ میں میٹنگ ساڑھے دس بجے ہے۔ آپ سے ملاقات کے بعد اگلا پروگرام مکمل ہو جائے گا۔ میں رات وہیں گزارنا چاہتا ہوں۔ دوسرے دن آسام میل سے علی گڑھ چلا جاؤں گا تاکہ مشہود میاں کو بھی دیکھ لوں۔

رشید حسن خان صاحب سے عرصے سے وعدہ ہے کہ ایک بار ان کے ساتھ ٹھہروں گا۔ میں اسٹیشن پر رات گزارنے کو ترجیح دوں گا باقی کھانے وغیرہ کا معاملہ، آپ حضرات جو طے کیجئے۔ ویسے مناسب ہے کہ رات کا کھانا رشید حسن صاحب کے ساتھ میں کھاؤں تاکہ ان کی شکایت رفع ہو جائے۔

.....یہ آپ نے بڑا اچھا کیا کہ کتابوں کی اشاعت کا مسئلہ اپنے تعلقات کو کام میں لاتے ہوئے طے کر دیا۔ میں نصف مسودہ ضرور لاتا مگر چاہتا ہوں کہ اسی وقت پیش کروں جب میں اس پر نظر ثانی کر لوں۔ اب چونکہ آپ نے ایک بات طے کرا دی اس لیے میں دہلی سے واپس آکر ایک ماہ کے اندر اندر سارا مسودہ پیش کر دوں گا۔ یہ تو نور علی نور والی بات ہے کہ مجھے یک مشت رقم مل جائے گی۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا، یہ آپ نے برا کام کیا۔

میں پیشگی نہیں لینا چاہتا، جب سارا مسودہ دے دوں، اس وقت وہ مجھے رقم بھیجیں ہاں معاہدے کی ابتداء کی صورت میں وہ مجھے ہزار پانچ سو دے دیں تو اچھا ہے۔ کم از کم میں اس طرح نکلنے نہیں پاؤں گا اور جلد از جلد مسودہ ان کو دے دوں گا۔

باقی تمہید الملاقات۔ امید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔

راقم

محمود الٰہی

.....☆.....

محمود الٰہی بنام عبدالحق

۱۸/اپریل ۱۹۸۳ء

عزیز محترم!

سلام مسنون

آج صبح ڈاکٹر محمد حسن صاحب سے ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی۔ وہ ۲۵ تک باہر رہیں گے۔ اس طرح میرا جموں سے براہ راست دہلی آنا بیکار ہوگا۔

اب آپ تاردیجیے کہ کیا آپ ۲۷، ۲۸، ۲۹ کو وہاں رہیں گے۔؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو Viva ان تاریخوں میں کرلوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک ہی سفر میں آپ کی یونیورسٹی اور نہر یونیورسٹی کا Viva ہو جائے۔ میں ۲۷/اکتوبر

کو آسانی سے آجاؤں گا اور ۲۹ر کو واپسی ہوگی۔

آپ کے تار کا انتظار رہے گا۔

جموں میں دہلی کے ریزرویشن کے لیے لکھ دیا تھا، اب آج تار دے رہا ہوں کہ وہ ٹکٹ منسوخ کر کے لکھنؤ کا ریزرویشن کرا لیا جائے۔

امید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔

والسلام

محمود الٰہی

.....☆.....

محمود الٰہی بنام عبدالماجد دریابادی

۱۱ر جنوری ۱۹۶۵ء

محترم المقام

السلام علیکم

گرامی نامہ ملا۔ آپ مجھے خطاب کریں۔ یہ میرے لیے ہر حیثیت سے قابل فخر امر ہے۔

میرا فرض تھا کہ مرحومہ کو خراج عقیدت پیش کر دوں جیسا تیسا لکھ دیا۔ خوشی اس کی ہے کہ اس سلسلے میں جلد ہی آپ کے الفاظ نظر سے گزریں گے۔ میں کیا کہوں، وہ آپ کا ذکر کتنے احترام کے ساتھ کرتی تھیں۔

انھوں نے وہ خطوط بھی میرے حوالے کر دیے تھے۔ بعض اہل

قلم نے انہیں لکھے تھے۔آپ کے خطوط بھی ہیں اوران خطوط کی نقلیں بھی ہیں جوانھوں نے آپ حضرات کو لکھے تھے۔

میں یہاں ایک بات چھپانا نہیں چاہتا۔آپ کے خطوط پڑھ کر میں بے حد متاثر ہوا۔یوں بھی آپ کا معتقد تھا لیکن حق بات یہ ہے کہ ان خطوط کے مطالعے کے بعد عقیدت اپنے منتہا کو پہنچ گئی ہے۔

مہدی مرحوم کی وفات پر بہت سے لوگوں نے تعزیتی خطوط لکھے مگر آپ کے خطوط میں جو جوہر تھا وہ دوسروں کو کہاں نصیب۔آپ نے تعزیت میں وہ الفاظ لکھے تھے جو ابن قیم کے تقاضوں کو مطابق تھا اور جو درحقیقت مرحوم کے لئے کار آمد تھے۔اور یہ الفاظ آپ نے اس وقت لکھے تھے جب آپ کی مذہبی ثقابت کو اتنا قبول عام نہیں ملا تھا، جتنا پچھلے بیس پچیس برسوں میں ملا ہے۔ان خطوط میں میں نے آپ کو بے نقاب دیکھا اور مجھے خوشی ہے کہ باطن کے لحاظ سے آپ اس وقت بھی وہی تھے، جو آج ہیں۔

مرحومہ نے وہ خطوط مجھے دے دیے تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اس کے استعمال کا حق بھی دے دیا تھا۔اب آپ سے یہ اجازت لینی ہے کہ اگر میں کسی مناسب موقع پر ان کے اقتباسات یا انہیں من وعن استعمال کروں تو آپ خفا تو نہیں ہوں گے۔

دعاؤں کا طالب

محمود الٰہی

.....☆.....

محمود الٰہی بنام فضل امام رضوی

۸/اپریل ۱۹۸۵ء

عزیزی!

دعائیں

میں سمجھتا تھا کہ آپ کو فوراً اطلاع مل جائے گی ورنہ آپ کے ٹیلی فون آنے سے پہلے ہی کسی نہ کسی ذریعے سے آپ کو مطلع کر چکا ہوتا۔

آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا، مبارک ہو۔ مجھے بھی فخر کرنے کا موقع ملا۔

لکھنؤ والا معاملہ چانسلر کو Refer کر دیا گیا ہے، ان کا فیصلہ حتمی ہوگا۔ ویسے شبیہ الحسن صاحب کا خیال ہے کہ چانسلر سلیکشن کمیٹی کے فیصلے کی حمایت کریں گے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔؟

آپ کب تک آ رہے ہیں، مفصل پروگرام لکھیے۔ میں بھی عثمان عارف سے ملنا چاہوں گا۔

انہیں شعبے کی کسی تقریب میں مدعو کرنا چاہتا ہوں۔

بچوں کو دعائیں۔

امید ہے کہ آپ سب مع بخیر ہوں گے۔

والسلام

محمود الٰہی

.....☆.....

محمود الٰہی بنام قاضی عبدالودود

۳؍مئی ۱۹۵۷ء

محترم المقام!

سلام مسنون

میں علی گڑھ میں اپنے زیر ترتیب مقالے کے سلسلے میں آپ سے استفادے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ آپ نے بہت سے مشورے دئے تھے اور فرمایا تھا کہ اپنی مشکلات کے بارے میں آپ کو وقتاً فوقتاً لکھتا رہوں۔ چھٹیوں میں آپ نے پٹنہ آنے کی بات بھی مجھے مرحمت فرمائی تھی۔ میں نے مقالہ تقریباً مکمل کرلیا ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ آپ کی ہدایات کی روشنی میں مجھے نظر ثانی کا موقع مل سکے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے میں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔ کیا ۱۵؍جون اور ۱۰؍جولائی کے مابین آپ میرے لئے کچھ وقت نکال سکتے ہیں۔ اگر یہ تاریخیں مناسب نہ ہوں، تو آپ مجھے ہدایت کریں کہ مجھے پھر کب آنا چاہئے۔

میں وسط مئی تک رہوں گا۔ اس کے بعد دو ہفتہ کے لئے علی گڑھ جاؤں گا۔ اوائل جون میں رام پور کے کتب خانے

سے استفادہ کروں گا۔اس کے بعد آپ کے یہاں آنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کا حکم ہوگا تو اس پروگرام کے منسوخ کرنے میں مجھے تامل نہ ہوگا۔اشرف علی فغاں اور بقاءاللہ بقا کے قصیدے مجھے اب تک نہیں مل سکے ہیں۔فغاں کے قصیدے اور بقا کے دو ایک قصیدے کے اقتباس آپ کے پاس موجود ہے۔اس کے حاصل کرنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے! میر وسودا کے معاصرین میں اب تک قائم چاند پوری اور میر حسن کے قصیدے ملے ہیں! آپ رہنمائی فرمائیں کہ اس دور کے دوسرے شعراء کے قصیدے مجھے کہاں مل سکیں گے؟ ڈاکٹر مختارالدین آرزو کے پاس میں نے خط لکھا تھا۔ان کے جواب سے معلوم ہوا کہ آپ پٹنہ واپس آ گئے ہیں۔ Synopsis کی ایک نقل آپ کے پاس ارسال کر رہا ہوں۔امید ہے آپ اچھی طرح ہوں گے۔

والسلام

محمود الٰہی زخمی

.....☆.....

محمود الٰہی بنام قاضی عبدالودود

۶/اکتوبر ۱۹۶۲ء

محترم المقام!

تسلیم

۲۷/تک میں نے آپ کے خط کا انتظار کیا تھا۔اس کے بعد

ایک ضرورت سے باہر چلا گیا تھا۔ واپسی پر آپ کا خط ملا سب سے پہلے مجھے آپ کی اس توجہ اور عنایت کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جو آپ نے کلیات سودا کا پہلا مطبوعہ نسخہ (شائع کردہ سویرا) بھیج کر فرمائی۔ مجھے افسوس اس کا ہے کہ اس سے قبل میں اپنا مضمون اردو ادب کو بھیج چکا تھا۔ میں اس لائق نہیں ہوں کہ آپ کے مضمون کی تعریف کروں لیکن اس حقیقت کا بہر حال اظہار کرنا ضروری ہے کہ آپ نے کلیات سودا پر کام کرنے والوں کے لیے بہت سی منزلیں آسان کر دیں۔ میرا یہ ایمان ہے کہ اب تک اردو زبان ادب نے آپ سے بڑا محقق نہیں پیدا کیا۔ لوگ یونیورسٹیوں کی کرسیوں پر بیٹھ کر جو بھی بن جائیں لیکن تحقیق کے باب میں انہیں آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا پڑے گا۔ میرے محترم! آپ نے اردو والوں کو تحقیق کرنے کا ڈھنگ سکھایا ہے اور اس صنف کی عزت بڑھادی ہے۔

آپ نے میرے آنے کے لیے جو وقت مناسب سمجھا ہے، اس میں تھوڑی سی ترمیم چاہتا ہوں۔ ۱۵ر تک میرا آنا یہاں کی ضروریات کو دیکھتے ہوئے ممکن نہ ہوگا۔ میں وہاں ۱۶ر کو پہنچ سکتا ہوں لیکن یہاں پھر ۱۸ر کو واپس آجانا ہوگا کیونکہ فیکلٹی کی ایک میٹنگ ۱۹ر کو ہوگی۔ ۲۰ر کو میں علی گڑھ کے لئے روانہ ہوں گا، وہاں ۲۱ر کو ایک میٹنگ میں شریک ہونا

ہے۔

اگر آپ اواخر اکتوبر میں علی گڑھ یا رام پور کا پروگرام بنائیں تو میں دونوں جگہوں میں سے کسی جگہ ملاقات کر سکتا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں ۳۰/ اکتوبر تک علی گڑھ رہوں اور درمیان میں دو ایک دن کے لئے رامپور ہو آؤں۔ اگر آپ ۳۱/ اکتوبر تک پٹنہ سے باہر نہ جائیں تو میں علی گڑھ سے براہ راست پٹنہ پہنچ جاؤں۔ بہر کیف میں آپ کے کہنے پر عمل کروں گا۔

اگر مندرجہ بالا پروگرام میں سے آپ کسی کو مناسب نہ سمجھیں تو نومبر میں رخصت لے کر میں پٹنہ آ سکتا ہوں۔

نوٹ:

مجھے فقیہ دردمند کا پورا ساقی نامہ (قلمی) مل گیا ہے۔ اس پر بڑی حد تک میں نے مواد بھی فراہم کر لیا ہے۔ آپ سے صرف یہ دریافت کرنا ہے کہ آپ کی نظر سے اس مثنوی کا کوئی قلمی نسخہ گزرا ہے یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو یہ تحریر فرمائیں کہ وہ نسخہ کہاں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اشاعت میں دیر نہ ہو اگر اور بھی قلمی نسخے ہوں تو انہیں دیکھ لوں۔ مختلف تذکروں میں ''ساقی نامہ'' کے جو اشعار ملتے ہیں، ان سے میں نے استفادہ بڑی حد تک کر لیا ہے۔

.....

امید ہے آپ اچھی طرح ہوں گے۔

والسلام

محمود الٰہی

.....☆.....

محمود الٰہی بنام کلام حیدری

۲۳ رمئی

حیدری صاحب محترم

تسلیم

آپ نے ہمارے غالب سیمینار کی رپورٹ جس خلوص سے مورچہ میں شایع فرمائی تھی، اس سے میں بے حد متاثر ہوں۔

اردو اساتذہ کا ریفرشر کورس (سمر اسکول) یہاں شروع ہو چکا ہے۔ ہمارے ملک میں اردو والوں کے لیے اپنی نوعیت کی یہ پہلی چیز ہے۔ دعا کیجیے کہ کامیاب رہے۔

خطبۂ استقبالیہ بھجوا رہا ہوں۔ اگر گنجائش ہو تو اس کا متن مورچہ میں شایع کر دیجیے۔

امید ہے کہ آپ اچھی طرح ہوں گے۔

والسلام

محمود الٰہی

.....☆.....

محمود الٰہی بنام گیان چند جین

۲۴ رفروری ۱۹۸۷ء

محترمی!

تسلیم

گرامی نامہ ملا۔ ادھر ہماری زبان میں آپ کا ایک دلچسپ نوٹ شعری مجموعوں کے بارے میں دیکھا تھا۔ جی چاہا کہ اسی کو مراسلت نو کا ذریعہ بنالوں کہ اتنے میں آپ کا خط آ گیا۔ آپ نے خوب لکھا اور ہم سب لوگوں کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا۔

میں نے رپورٹ آج رجسٹری سے رجسٹرار صاحب کو بھیجوادی۔ چونکہ رپورٹ ہاتھ سے لکھی ہے (ٹائپ رائٹر سے کاپیاں نکلوانے میں دیر ہو جاتی) اس لیے آپ کو کاپی نہیں بھیج سکا بہرحال مقالہ اچھا ہے اور میں چاہتا تھا کہ اسی بہانے دو ایک دن کے لئے حیدرآباد آجاؤں مگر ہوائی جہاز کے سفر میں بھی چار دن کی فرصت چاہیے اور وہ ان دونوں نصیب نہیں۔ مجبوراً آپ کے مشورے کے مطابق رجسٹرار کو معذرت کا خط لکھ دیا اور ان سے درخواست کر لی کہ وہ زبانی امتحان کے لیے متبادل انتظام کر لیں۔ اب باقی کارروائی آپ پوری کریں گے۔

دعا کر رہا ہوں کہ توسیع مل جائے اور آپ زیادہ سے زیادہ طلبہ اور ریسرچ اسکالروں کو مستفید ہونے کا موقع دے سکیں۔

صحت کیسی ہے۔؟ مفصل لکھیے کہ اب آپ کا کلام اقبال والی کتاب کس منزل میں ہے۔

۳/مارچ کو یہاں کالرا صاحب آرہے ہیں، ماڈریشن ہیں۔

نیر صاحب بھی آئیں گے۔ میں اکادمی کی انعامی کتب کے سلسلے میں بھی مصروف ہوں اس لیے معذرت قبول کیجیے۔ پھر کبھی ملاقات ہوگی۔

نیازمند

محمود الٰہی

.....☆.....

محمود الٰہی بنام لئیق صلاح

اپریل ۸۰ء

محترمہ!

سلام مسنون

شکر گزار ہوں کہ آپ نے ایک گراں قدر تصنیف سے مجھے نوازا۔ میں ان لوگوں میں ہوں جو کتابوں تک اپنی دوستی محدود رکھتے ہیں اور جب کوئی اچھی کتاب سامنے آتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی نعمت ہاتھ آ گئی ہے۔

حسن اتفاق کہ گزشتہ دو ماہ سے حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کی دو کتابیں زیر مطالعہ ہیں جو ۷۹ء میں طبع ہوئی تھیں، آپ کی زیر نظر تصنیف کو نور علی نور کے زمرے میں رکھتا ہوں۔

میں میر شمس الدین فیض کا شمار زعمائے ادب میں نہیں کرتا لیکن میں اس کا قائل ہوں ایک علمی فضا اور ادبی ماحول کی تعمیر

میں ان کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ آپ نے صرف فیض کو موضوع ہی نہیں بنایا بلکہ ان کے حوالے سے ایک عہد کی تصویر کشی کی ہے۔

میں اس تصنیف کی اشاعت پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ آپ کے قلم سے جلد ہی اس سے بہتر تصنیف ظہور میں آئے گی۔

اب آپ کس موضوع پر کام کر رہی ہیں۔؟

امید ہے آپ اچھی طرح ہوں گی۔

والسلام

محمود الٰہی

.....☆.....

محمود الٰہی بنام مسعود حسین خاں

۲۳/اگست ۱۹۷۸ء

محترم المقام

سلام مسنون

'قومی آواز' کی ایک حالیہ اشاعت سے جامعہ ملیہ کی وائس چانسلری سے آپ کے مستعفی ہو جانے کا حال معلوم ہوا۔ ہر چند آپ کی علی گڑھ واپسی کو لوگ ترقی معکوس کہیں گے مگر مجھے یک گونہ خوشی ہوئی کہ جیسے کوئی اپنا غیروں میں شامل ہو گیا ہو اور پھر سواد اعظم سے آملا ہو۔

میں اُس وقت خوش ہوا تھا جب وائس چانسلری کے لئے آپ کا نام منظور کیا گیا تھا اور آج اس سے زیادہ خوشی ہوئی جب آپ نے یہ عہدہ چھوڑ دیا۔

آپ نے تو اس طوفان میں گھر کر اپنوں اور بیگانوں کی وفاداریوں کو تول لیا ہوگا، میں تو دور سے ہی اس کا کچھ اندازہ کر رہا تھا۔ دراصل جو لوگ شمہ برابر بھی پرانی قدروں کے قائل ہوں گے، وہ موجودہ دنیا میں اپنی آبرو محفوظ نہیں رکھ سکتے یہاں اقبال کے الفاظ میں:

'ہر دم تغیر تھے خرد کے نظریات'

اور اس تغیر حال کے جال میں پھنس کر کوئی کس کا وفادار رہتا ہے۔

میں تو صرف اردو والوں کی شورہ یشتی اور شرانگیزی دیکھی ہے۔ اور وہ بھی بہت دور سے یعنی گورکھپور میں رہتے ہوئے۔ اب میرا یہ حال ہے کہ خدا کی قسم اگر کہیں اور روزی روٹی کا انتظام ہو جائے تو میں اردو کو اور اسکی خدمت کو ہمیشہ کے لئے ترک کر دوں، نائب ہو کر قلۂ کوہ میں پناہ لینا زیادہ اچھا ہے۔ بغض، کینہ، بدگوئی، غیبت، خوشامد، منافقت کون سی خوب ہے جو اردو والوں میں نہیں ہے۔ جو خوبیاں اردو والوں میں ہیں لگ بھگ مسلمان بھی ان کے مالک ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم لوگ اسوۂ رسول کیوں بھولتے جا رہے

ہیں۔ بہرحال آپ نے تو سب کا کلام دیکھا ہے، اچھا ہوا کہ آپ خاموشی سے واپس چلے آئے۔

کیا یہ امید کروں کہ ذرا آپ اطمینان ہو جائے تو آپ پھر ہمارے شعبے سے حسب سابق مربوط ہو جائیں گے۔ کبھی کبھی گورکھپور کا سفر باعث مسرت ہو جاتا ہے۔

آپ کو اپنا مکان خالی مل گیا؟ یا اس میں دقت ہوئی۔

ایک عرض اور جو چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق ہے۔ آپ کی درخواست بہت مفید دلچسپ ہوگی۔ محض اس خیال سے کہ منہ کا مزہ بدل جائے گا۔ اگر ہفتے میں چند گھنٹے آپ اس کام میں صرف کر دیں گے تو ایک سال میں خودنوشت ضرور مکمل ہو جائے گی۔

امید ہے آپ اچھی طرح ہوں گے۔

فقط والسلام

محمود الٰہی

.....☆.....

محمود الٰہی بنام نثار احمد فاروقی

۲۵/ اکتوبر ۱۹۸۴ء

محبی المحترم!

سلام مسنون

گرامی نامہ ملا تھا، ادھر میں علی گڑھ چلا گیا تھا اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی۔ معاف کیجئے۔

سخت کٹ کٹی ہے۔ آپ سے وعدہ کر دیا تھا کہ اکادمی کا حکم نامہ آیا۔ ان جلسوں میں شرکت ضروری ہے۔ ایجنڈے میں ایسے امور ہیں جن پر میرا اظہار خیال کرنا لازم سا ہے۔

اب آپ ہی بتایئے کہ کیا کروں۔ ۷/نومبر کو آپ کے آخری اجلاس میں شرکت کر سکتا ہوں اور وہ بھی اس لیے کہ رات کو لکھنؤ سے چلوں اور صبح دہلی جاؤں۔ مگر یہ کوئی بات نہیں ہوئی کس سے ملوں گا اور کس کو سناؤں گا۔

معذرت قبول کیجیے اور اگر آپ حکم دیں گے تو سات کو تھوڑی دیر کے لیے آ جاؤں گا۔

جواب کا منتظر ہوں، امید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔

سیمینار کی کامیابی کے لیے دعا کر رہا ہوں۔

فقط والسلام

محمود الٰہی

خطوط اقبال میں تصوف کے مباحث

خط ابتدا سے ہی کسی شخصیت یا ذات کو قریب سے جاننے اور سمجھنے کا بہترین ذریعہ رہا ہے۔خطوط نگاری کی روایت پر نظر کریں تو دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں خطوط نگاری نہایت اہمیت کی حامل رہی ہے۔اردو میں بے شک غالبؔ نے مراسلے کو مکالمہ بنانے کا کام کیا،لیکن بعد میں آنے والے دانشوروں نے خطوط کو صرف ذاتی معاملات کے بیان کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ اس کو علمی،فلسفیانہ اور تنقیدی نظریات کے اظہار کا ذریعہ بھی بنایا۔اقبال نے بھی اپنے خطوط میں ذاتی معاملات کے علاوہ مختلف موضوعات کو اپنے خطوط کا مضمون بنایا۔چونکہ موضوع خطوط اقبال میں تصوف کے مباحث سے متعلق ہے لہٰذا یہاں ان ہی مباحث سے گفتگو کریں گے جن کا تعلق تصوف سے ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ خطوط اقبال کلام اقبال کی تفسیر وتشریح ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

کوئی بھی شخص اپنا عقیدہ راہ چلتے ہوئے کسی کو نہیں بتاتا ہے۔علامہ اقبال کی زندگی پر نظر کریں تو ان کے افکار وعمل دونوں میں تصوف کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔اس بات میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ علامہ اقبال کی پرورش و پرداخت صوفیانہ ماحول میں ہوئی۔گھر کا ماحول، اساتذہ کی صحبت وتربیت اور مطالعہ نے ان کے ذہن وافکار کو متاثر کیا،لہٰذا تصوف ان کے افکار وعقیدے کا حصہ ہی نہیں بلکہ رگ وپے میں جاگزیں تھا۔لیکن ان کے خطوط کے حوالے سے بات کریں تو تصوف کے متعلق ان کے زیادہ تر نظریات مثنوی 'اسرار خودی' کے شائع ہونے کے بعد منظر عام پر آئے۔اس کا سب سے بڑا سبب مثنوی کی اشاعت سے علامہ اقبال کے تئیں لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے شکوک تھے،جن کو رفع کرنے کے لیے اقبال نے مضامین،خطوط اور کتاب تخلیق کیے۔اس دور کے اکثر وبیشتر خطوط میں اقبال مثنوی اسرار خودی کے متعلق شرف وقبولیت کی سند و نامے جمع کرتے یا اپنے موقف کے موافق دلائل اور صفائی دیتے نظر آتے ہیں۔علامہ اقبال کے نظریات تصوف کو ہدف تنقید بنانے والوں میں بالخصوص خواجہ حسن

ڈاکٹر طالب اکرام،مئوآئمہ،پریاگ راج

نظامی اور اکبرالہ آبادی کا نام سرفہرست ہے۔ان دونوں حضرات سے اقبال کو بے پناہ عقیدت اور محبت تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کی اس غلط فہمی کا ازالہ کرنے کی علامہ نے حتی الامکان کوشش کی اور کامیاب بھی ہوئے۔

اس بات کو کہنے میں کوئی دریغ نہیں کہ خطوط کے حوالے سے اقبال کے نظریۂ تصوف پر بحث کرتے ہوئے اکثر ناقدین نے تعصب سے کام لیا ہے۔اس کا سبب وہ معمولی سی غلطی ہے جو کاتب سے سرزد ہوئی۔حیرت انگیز وتعجب خیز بات تو یہ ہے کہ کسی نے بھی یہ کوشش نہیں کی کہ کیا واقعی علامہ اقبال نے یہ بات کہی ہے۔شاید کسی نے بھی اصل متن تک رسائی حاصل کرنے کی سعی نہیں کی جبکہ سب کو معلوم ہے کہ اس جملہ کا مطلب کیا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی کے نام ایک مکتوب مورخہ ۱۳/نومبر ۱۹۱۷ء میں اقبال فلسفۂ وحدت الوجود کے متعلق اپنے نظریہ کے متعلق لکھا کہ:

> ''اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف وجودی سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔''

(کلیات مکاتب اقبال، جلد اول، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۶۷۳)

لیکن کاتب کی غلطی کے سبب 'تصوفِ وجودی' 'تصوف کا وجود ہی' ہو گیا اور جملہ یوں ہو گیا کہ:

> ''اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ کہ تصوف کا وجود ہی سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔''

بہرکیف یہ تو کاتب کی غلطی تھی جس کے سبب ناقدین کو یہ مغالطہ پیدا ہوا کہ اقبال صریحاً

تصوف کے مخالف ہیں، جب کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ آگے اسی خط میں لکھتے ہیں:

''میں خود سلسلۂ قادریہ میں بیعت رکھتا ہوں اور حالانکہ محی الدین شیخ عبد القادر جیلانی کا مقصد اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک رکھنا تھا۔''

(کلیات مکاتب اقبال، جلد اول، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۶۷۵)

لیکن اقبال کے دور میں ان کے معاصرین کو اقبال کے نظریات سے اختلاف اس وقت ہوا جب انھوں نے مثنوی 'اسرار خودی' میں حافظ کی رنگ شاعری پر تنقید کی۔ اس کا سبب انھوں نے اپنے ایک خط بنام اکبر الہ آبادی میں بیان کیا ہے:

''چونکہ حافظؒ ولی اور عارف تصور کئے گئے ہیں اس واسطے ان کی شاعرانہ حیثیت عوام نے بالکل ہی نظر انداز کر دی ہے اور میرے ریمارک تصوف اور ولایت پر حملہ کرنے کے مترادف سمجھے گئے۔ خواجہ حسن نظامی نے ایسا سمجھ کر اخباروں میں لکھا۔ اس واسطے مجھے مجبوراً تصوف پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا پڑا۔

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کون تصوف میرے نزدیک قابل اعتراض ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ کوئی نئی بات نہیں۔ حضرت علاء الدولہ سمنانیؒ لکھ چکے ہیں، حضرت جنید بغدادیؒ لکھ چکے ہیں۔ میں نے تو محی الدینؒ اور منصور حلاجؒ کے متعلق وہ الفاظ نہیں لکھے جو حضرت سمنانیؒ اور جنیدؒ نے ان بزرگوں کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں ہاں ان کے عقائد اور خیالات سے بیزاری ضرور ظاہر کی ہے۔ اگر اسی کا نام مادیت ہے تو قسم بخدائے لایزل، مجھ سے بڑھ کر مادہ

پرست دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔معاف کیجئے گا مجھے آپ کے خطوط سے یہ معلوم ہوا ہے (ممکن ہے غلطی پر ہوں) کہ آپ نے مثنوی اسرارخودی کے صرف وہی اشعار دیکھے ہیں جو حافظؒ کے متعلق لکھے گئے تھے۔ باقی اشعار پر نظر شاید نہیں فرمائی۔کاش آپ کو ان کے پڑھنے کی فرصت مل جاتی تا کہ آپ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محفوظ رہتے۔ عجمی تصوف سے لٹریچر میں دلفریبی اور حسن تو پیدا ہوتا ہے مگر ایسا کہ طبائع کو پست کرنے والا ہے۔اس کے برعکس اسلامی تصوف دل میں قوت پیدا کرتا ہے اور اس قوت کا اثر لٹریچر پر ہوتا ہے میرا تو یہی عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا لٹریچر تمام ممالک اسلامیہ میں قابل اصلاح ہے۔قنوطی لٹریچر کبھی دنیا میں زندہ نہیں رہ سکا۔قوم کی زندگی کے لئے اس کا اور اس کی لٹریچر کا ہونا ضروری ہے۔اسرارخودی میں حافظؒ پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو خارج کر کے اور اشعار لکھے ہیں جن کا عنوان یہ ہے ''درحقیقت شعر واصلاح ادبیات اسلامیہ'' ان اشعار کو پڑھ کر مجھے یقین ہے کہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی اور میرا اصل مطلب واضح ہو جائے گا۔''

(کلیات مکاتب اقبال، ج،۱، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۰ء، ص،۲۴۷۔۲۵۷)

اقبال نے ان نظریات مثلاً قدم ارواح کملا، تنزلات ستہ،، وجودیت کی شدید مخالفت کی ۔اول تو یہ کہ اقبال ان نظریات کو اسلامی تصوف کا حصہ نہیں گردانتے بلکہ انھیں وہ فلسفہ قرار دیتے ہیں

جوتصوف کے ارتقائی سفر میں مختلف مذاہب کے اثرات کے سبب تصوف میں داخل ہو گئے ۔یہی وجہ ہے کہ اقبال نے جہاں بھی ان نظریات سے بحث کی ہے ان کے لیے الگ الگ اصطلاح وضع کی ہیں مثلاً ایرانی تصوف، مسیحی تصوف، یہودی تصوف، ہندوستانی تصوف وغیرہ ان اصطلاحات کا وضع کرنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ ان مذاہب میں روا تصوف کو غیر اسلامی تصور کرتے ہیں ۔ علامہ کے نزدیک تصوف اسلامیات کا جزو لاینفک ہے۔وقت کے ساتھ اس میں تصوف کے نام سے ایسی بہت سی باتیں شامل ہو گئیں یا شامل کر دی گئیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔اقبال اسی نام نہاد تصوف کے مخالف اور اس کے مضر اثرات سے فکرمند تھے۔اس سلسلے میں ان کے بیانات ملاحظہ ہوں:

''میرا تو عقیدہ ہے کہ غلو فی الزہد اور مسلۂ وجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ (سمنبت) مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔''

(کلیات مکاتب اقبال، ج،۱، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۰ء ص ۶۷۴)

''مسلمانوں میں یہ مذہب حراں کے عیسائیوں کے تراجم کے ذریعہ سے پھیلا۔اور رفتہ رفتہ مذہب اسلام کا ایک جز بن گیا۔میرے نزدیک یہ تعلیم قضا غیر اسلامی ہے اور قرآن کریم کے فلسفے سے اسے کوئی تعلق نہیں۔تصوف کی عمارت اسی ایرانی بیہودگی پر تعمیر کی گئی۔''

(مطالعات ومکاتیب اقبال مرتبہ سید اختر الاسلام، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء، ص ۲۲۹)

ابتدا میں اقبال کا رجحان بھی فلسفۂ وجود کی طرف تھا،لیکن یورپی فلسفہ کے مطالعہ کے بعد ان پر یہ بات روشن ہو گئی کہ تصوف میں بعض چیزیں غیر اسلامی سرایت کر گئی ہیں جن کا اسلام سے قطعی تعلق نہیں ہے،جس کا اپنے خطوط میں برسبیل سلسبیل تذکرہ کیا ہے اور ان سے برأت بھی ظاہر کی ہے۔چنانچہ خواجہ حسن نظامی کے نام ایک خط ۳۰ر دسمبر ۱۹۱۵ء میں نظریۂ وحدت الوجود کے بعض پہلوؤں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میری نسبت بھی آپ کو معلوم ہے۔ میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی تیز ہو گیا تھا کیونکہ یورپین فلسفہ بحیثیت مجموعی وحدت الوجود کی طرف رخ کرتا ہے مگر قرآن میں تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا اور اس مقصد کے لئے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔''

(کلیات مکاتب اقبال ،جلد اول ،مرتبہ سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۰ء، ص، ۴۴۸_۴۴۹)

اقبال نے تصوف میں رہبانیت کی آمیزش اور تصوف کے نام پر جمود و سکوت، تعطل، بے رغبتی اور بے عملی کی بڑی شد و مد کے ساتھ مخالفت کی ہے۔ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور اسے عجمی تصوف کی اصطلاح دیتے ہیں۔ وہ سر الوصال کے مخالف اور سر الفراق کے قایل نظر آتے ہیں یعنی پیوستن سے برات ظاہر کرتے ہیں اسے رہبانیت، ایرانی تصوف اور غیر اسلامی تصوف گردانتے ہیں اور اس نظریۂ تصوف کو وجودی تصوف سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کے برعکس گسستن کو عین اسلام قرار دیتے ہیں اور اس کے مقلد اور ترجمان نظر آتے ہیں۔ اسے اسلامی تصوف اور نظریۂ وحدت الشہود کے اسم سے موسوم کرتے ہیں۔ چناں چہ علامہ ایک خط میں وحدت الوجود کی تردید اور وحدت الشہود کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی نے مکتوب میں ایک جگہ

یہ بحث کی ہے کہ گسستن اچھا ہے یا پیوستن؟ یعنی فراق اچھا ہے یا وصال؟ میرے نزدیک گسستن عین اسلام ہے اور پیوستن رہبانیت یا ایرانی تصوف اور میں اسی غیر اسلامی تصوف کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں۔ گذشتہ علمائے اسلام نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ اور اس بات کی تاریخی شواہد موجود ہے۔

آپ کو یاد ہوگا جب آپ نے مجھے سرالوصال کا لقب دیا تھا تو میں نے آپ کو لکھا تھا کہ مجھے 'سرالفراق' کہا جائے۔ اس وقت بھی میرے ذہن میں یہی امتیاز تھا جو حضرت مجدد الف ثانی نے کیا ہے۔ آپ کے تصوف کی اصطلاح میں اگر میں اپنے مذہب کو بیان کروں تو یہ ہوگا کہ شان عبدیت انتہائی کمال روح انسانی کا ہے اس سے اور کوئی مرتبہ نہیں ہے یا ابن عربیؒ کے الفاظ میں عدم محض ہے یا بالفاظ دگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ حالت سکر منشائے اسلام اور قوانین حیات دونوں کے خلاف ہے اور حالت صحو جس کا دوسرا نام اسلام ہے قوانین حیات کے عین مطابق اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء بھی یہی تھا کہ ایسے لوگ پیدا ہوں جن کی حالت کیفیت صحو ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے صحابہ میں ہمیں صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ تو ملتے ہیں لیکن حافظ شیرازی کوئی نظر نہیں آتا۔

اسی خط میں مزید فرماتے ہیں:

شیخ ابن عربی کے ذکر سے ایک بات یاد آ گئی جس کو اس لئے بیان کرتا ہوں کہ غلط فہمی نہ رہے۔ میں شیخ کی عظمت وفضیلت

دونوں کا قائل ہوں اور ان کے اسلام میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔ کیونکہ جو عقائد ان کے ہیں (مثلاً قدم ارواح اور وحدت الوجود) ان کا انہوں نے فلسفہ کی بنا پر نہیں جانا۔ بلکہ نیک نیتی سے قرآن حکیم سے استنباط کیا ہے پس ان کے عقائد صحیح ہوں یا غلط، قرآن کی تاویل پر مبنی ہیں ۔ یہ دوسری بات ہے کہ جو تاویل انہوں نے پیش کی ہے وہ منطقی یا منقولی اعتبار سے صحیح ہے یا غلط؟ میرے نزدیک ان کی پیش کردہ تاویل یا تفسیر صحیح نہیں ہے ۔ اس لئے گو میں ان کو ایک مخلص مسلمان سمجھتا ہوں مگر ان کے عقائد کا پیرو نہیں ہوں ۔ اصل بات یہ ہے کہ صوفیہ کو توحید اور وحدت الوجود کا مفہوم سمجھنے میں بڑی غلطی ہوئی ہے ۔ یہ دونوں اصطلاحیں مترادف نہیں ہیں۔ مقدم الذکر کا مفہوم مذہبی ہے اور موخر الذکر مفہوم خالص فلسفیانہ ہے۔ توحید کی ضد کثرت نہیں ہے جیسا کہ بعض صوفیا سمجھتے ہیں بلکہ شرک ہے۔ ہاں وحدت الوجود کی ضد کثرت ہے اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے وحدت الوجود یا زمانہ حال کے فلسفہ یوروپ کی اصطلاح میں توحید کو ثابت کیا وہ موحد تصور کئے گئے حالانکہ ان ثابت کردہ مسئلہ کا تعلق مذہب سے بالکل نہ تھا بلکہ نظام عالم کی حقیقت سے تھا۔

آگے مزید رقم طراز ہیں:

''چونکہ صوفیا نے فلسفہ اور مذہب کے دو مختلف مسائل (وحدت الوجود اور توحید) کو ایک ہی سمجھ لیا۔ اس لئے ان کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ توحید کو ثابت کرنے کا کوئی اور طریق ہونا چاہئے جو عقل و ادراک کے قوانین سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ اس غرض کے لئے حالت سکر ممد و معاون ہوتی ہے اور یہ ہے اصل مسئلہ حال و مقامات کی۔ مجھے حالت سکر کی واقعیت سے انکار نہیں ہے، انکار صرف اس بات سے ہے کہ جس غرض کے لئے یہ حالت پیدا کی جاتی ہے وہ غرض اس سے مطلق پوری نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ صاحب حال کو ایک علمی مسئلہ کی تصدیق ہو جاتی ہے نہ کہ مذہبی مسئلہ کی (یعنی حالت سکر یا جذب و مستی میں سالک کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ واقعی کائنات میں اللہ کے سوا اور کسی کا وجود نہیں ہے) صوفیا نے وحدت الوجود کی کیفیت کو محض ایک مقام لکھا ہے اور شیخ اکبر کے نزدیک یہ انتہائی مقام ہے۔ اور اس سے آگے عدم محض ہے لیکن یہ سوال کسی صوفی کے دل میں پیدا نہیں ہوا کہ آیا یہ مقام حقیقت نفس الامری کو بھی واضح کرتا ہے یا نہیں؟ اگر کثرت حقیقت نفس الامیری ہے تو یہ کیفیت وحدت الوجود جو سالک پر طاری ہوتی ہے محض دھوکہ ہے اور مذہبی فلسفیانہ اعتبار سے اس کی کوئی وقعت نہیں ہے نیز اگر یہ کیفیت وحدت الوجود محض ایک مقام ہے اور کسی حقیقت نفس الامری کا اس سے انکشاف نہیں ہوتا تو پھر اس کو معقولی طور پر ثابت کرنا بھی بے سود ہے۔ جیسا کہ ابن عربیؒ اور ان کے متبعین نے

کیا ہے اور نہ اس کے مقام ہونے کی بنا پر ہمیں روحانی زندگی میں کوئی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ کیونکہ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں یا اس کے رو سے وجود فی الخارج (کائنات) کی ذات باری کے ساتھ اتحاد عینیت کی نسبت نہیں ہے بلکہ مخلوقیت کی نسبت ہے (یعنی خدا خالق ہے اور کائنات مخلوق ہے اور خالق و مخلوق کے مابین مغائرت ہوتی ہے) اگر قرآن کی تعلیم یہ ہوتی کہ ذات باری تعالیٰ کثرت نظام عالم میں دائر وسائر ہے تو کیفیت وحدت الوجود کو قلب پر وارد کرنا مذہبی زندگی کے لئے نہایت مفید ہوتا بلکہ یہ کیفیت مذہبی زندگی کی آخری منزل ہوتی مگر میرا عقیدہ یہ ہے کہ یہ قرآن کی تعلیم نہیں ہے (یعنی قرآن کی رو سے خالق اور مخلوق یا عابد اور معبود میں مغائرت کلی ثابت ہوتی ہے) اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ میرے نزدیک یہ کیفیت قلبی یا مذہبی اعتبار سے کوئی فائدہ نہیں رکھتی اور علم الحیات کی رو سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اس کیفیت کا ورود ملی اعتبار سے بہت مضر ہے مگر علم الحیات کی رو سے اس پر بحث کرنا بہت فرصت چاہتا ہے۔''

(کلیات مکاتب اقبال، جلد اول، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۰ء، ص، ۴۵۰۔۴۵۷)

دراصل علامہؒ کے قلب وجگر میں ملت اسلامیہ کا ایسا جذبہ جوش مار رہا تھا کہ وہ جہاں بھی جمود وسکوت دیکھتے تھے فوراً مخالفت کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے جب دیکھا کہ تصوف بھی عجمی رنگ میں رنگ گیا ہے تو وہ علی الاعلان اس کی مخالفت کرتے نظر آئے۔ مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ

علامہ موصوف تصوف کی مخالفت کررہے تھے بلکہ علامہ موصوف تصوف میں جوعنصر غیر اسلامی سرایت کر گئے تھے،اس کی مخالفت کررہے تھے۔ وہ عجمی تصوف، مسیحی تصوف یا ہندی تصوف کے قائل نہیں تھے۔تصوف میں بھی وحدت الوجود، قدم ارواح،غلو فی الذہد اور تنزلات ستہ وغیرہ کا بڑی شدومد کے ساتھ مخالفت کرتے تھے۔ان کے مطابق نظریۂ وحدت الوجود میں بھی دوسرے مذاہب کی بعض چیزیں داخل ہوگئی ہیں جو رہبانیت کی طرف لے جاتی ہیں اور اللہ کے رسول ﷺ نے رہبانیت اور گوشہ نشینی سے گریز و اجتناب کی سخت تاکید کی ہے۔علامہ اقبالؔ کو مسلمانوں کے اندر جمود وسکوت، تعطل وکم ہمتی اور پستی کے عناصر نظر آئے تو اس کی سخت مذمت کی جس کے باعث انھیں سرے سے تصوف کا ہی مخالف سمجھا جانے لگا۔حالانکہ وہ تصوف کو رہبانیت سے پاک کرنا چاہتے تھے جوانھیں گوشہ نشینی اور بے عملی کا درس دیتا ہے ۔ان کے نزدیک تصوف کے اصل کو سمجھنے میں بعض حضرات سے مغالطہ لاحق ہوا ہے۔غالب گمان ہے کہ وہ وحدت الوجود اور توحید کے امتیازی پہلوؤں کو سمجھنے میں قاصر رہے ہیں۔جس کے باعث وحدت الوجود اور توحید کے معنی ومفہوم میں فرق واضح نہ کر سکے اور مغالطہ کے شکار ہوگئے جب کہ یہ دونوں اصطلاحیں الگ الگ ہیں۔جیسا کہ علامہ اقبال ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''اصل بات یہ ہے کہ صوفیا کو توحید اور وحدت الوجود کا مفہوم سمجھنے
> میں سخت غلطی ہوئی ہے ۔ یہ دونوں اصطلاحیں مترادف نہیں ہیں
> ۔مقدالذکر کا مفہوم مذہبی ہے اور موخرالذکر کا فلسفیانہ۔۔۔۔''

(مقالات اقبال،مرتبہ سید عبدالواحد معینی،شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور،۱۹۶۳ء،ص،۴۴۸)

اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ علامہ تصوف کے منکر نہیں ہیں بلکہ اس میں شامل عجمی رنگ کے مخالف ہیں۔یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال کو جہاں بھی تصوف میں غیر اسلامی چیزیں نظر آئیں وہ اس کے بر عکس آواز بلند کی۔وہ ہر جگہ حرکت وعمل کو دیکھنے کے قائل ہیں۔جو چیز حرکت وعمل میں رخنہ ڈالتے دیکھے وہ فوراً اس چیز کو جڑ سے مٹا دینے کی بات کرتے تھے۔انہیں وحدت الوجود میں بھی بعض چیزیں سکوت وجمود

نظر آئیں، جس کے باعث انہوں نے وجودی نظریہ سے بیزاری ظاہر کی۔ علامہ اقبال ۱۹/جولائی/ ۱۹۱۶ء کو بنام سراج الدین پال کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا اور قرآن کی تفسیر میں محاورہ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معنی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان میں ہرگز نہیں ہیں۔ کل میں ایک صوفی مفسر قرآن کی ایک کتاب دیکھ رہا تھا لکھتے ہیں ''خلق الارض والسمٰوات فی ستة ایام'' میں ایام سے مراد تنزلات ہیں یعنی فی ستہ تنزلات ہیں۔ کمبخت کو یہ معلوم نہیں کہ عربی زبان میں یوم کا یہ مفہوم قطعاً نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے تخلیق بالتنزلات کا مفہوم ہی عربوں کے مذاق اور فطرت کے مخالف ہے۔ اس طرح ان لوگوں نے نہایت بیدردی سے قرآن اور اسلام میں ہندی اور یونانی خیالات داخل کردئے ہیں۔''

(کلیات مکاتب اقبال، جلد اول، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۵۲۲)

لہٰذا علامہ اقبال نے مندرجہ بالا فلسفہ و تصورات کے مضر اثرات کے تدارک کا اور اپنے موقف کی وضاحت کا منصوبہ بنایا جس کے نتیجے میں مثنوی 'رموز بے خودی' وجود میں آئی۔ اس سلسلے میں ۴/اکتوبر ۱۹۱۵ء کو بنام منشی سراج الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے مسلمان صدیوں سے ایرانی تاثرات کے

اثرات سے ہیں۔ان کو عربی اسلام اور اس کے نصب العین اور غرض
وغایت سے آشنائی نہیں۔ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں
اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں
حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں۔جس کی اشاعت رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے منھ سے ہوئی۔ صوفی نے اسے تصوف پر حملہ
تصور کیا۔اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے انشاء اللہ دوسرے
حصہ میں دکھاؤں گا کہ تصوف کیا ہے اور کہاں سے آیا ہے اور صحابہ
کرام کی زندگی سے کہاں تک ان تعلیمات کی زندگی سے کہاں تک
ان تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے۔جس کا تصوف حامی ہے۔''

(کلیات مکاتب اقبال، جلد اول، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۰ء، ص، ۴۱۵)

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ اقبال کی تحریروں میں تصوف سے متعلق نظریات اس وقت زیادہ نمایاں ہوئے جب ان کے معاصرین نے ان پر تصوف کا منکر ہونے اور تنقید کرنے کا الزام لگایا۔تاریخ تصوف کی تالیف بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔۱۵/جنوری ۱۹۱۶ء کو علامہ اقبال نے ''وکیل'' اخبار میں ''اسرار خودی'' کے نام سے ایک مضمون قلمبند کیا، جس میں تحریک تصوف، اسرار خودی کی تخلیق کے اغراض و مقاصد اور تصوف و متعلقات تصوف سے متعلق اپنے نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر وقت نے مساعدت کی تو تحریک تصوف کی ایک مفصل تاریخ
لکھوں گا انشاء اللہ ایسا کرنا تصوف پر حملہ نہیں بلکہ تصوف کی خیر
خواہی ہے کیونکہ میرا مقصد یہ دکھانا ہوگا کہ اس تحریک میں غیر اسلامی
عناصر کون کون سے ہیں اور اسلامی عناصر کون کون سے ہیں۔اس
وقت صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہوگا کہ یہ تحریک غیر اسلامی

عناصر سے خالی نہیں اور میں اگر مخالف ہوں تو صرف ایک گروہ کا جس نے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر بیعت لے کر دانستہ یا نادانستہ ایسے مسائل کی تعلیم دی ہے جو مذہب اسلام سے تعلق نہیں رکھتے۔ حضرات صوفیا میں جو گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راہ پر قائم ہے اور سیرت صدیقی کو اپنے سامنے رکھتا ہے اس گروہ کا خاک پا ہوں اور ان کی محبت کو سعادت دارین کا باعث تصور کرتا ہوں۔ مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ میں ایک عرصہ تک ایسے عقائد و مسائل کا قائل رہا جو بعض صوفیا کے ساتھ خاص ہیں۔ اور جو بعد میں قرآن شریف پر تدبر کرنے سے قطعاً غیر اسلامی ثابت ہوئے مثلاً شیخ محی الدین ابن عربیؒ کا مسئلہ قدم ارواحِ کملا، مثلاً وحدت الوجود یا مسئلہ تنزلات ستہ یا دیگر مسائل جن میں بعض کا ذکر عبدالکریم جیلیؒ نے اپنی کتاب' انسان کامل' میں کیا ہے۔ مذکورہ بالا تینوں مسائل میرے نزدیک مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ وہ میں ان کے ماننے والوں کو کافر نہیں کہہ سکتا۔ انہوں نے نیک نیتی سے ان مسائل کا استنباط قرآن شریف سے کیا ہے۔ مسئلہ قدم ارواح افلاطونی ہے۔ بوعلی سینا اور ابونصر فارابی دونوں اس کے قائل تھے چنانچہ امام غزالی نے اس وجہ سے دونوں بزرگوں کی تکفیر کی ہے۔

مزید لکھتے ہیں:

''مسئلہ وحدت الوجود یا مسئلہ تنزلات ستہ کی فلسفیانہ تکمیل ہے بلکہ یوں کہئے کہ عقل انسانی خود بخود تنزلات سے وحدت الوجود تک پہنچی ہے۔ اکثر صرف اس مسئلے کے قائل ہیں بعض اس طرح کہ وحدت الوجود ایک حقیقت نفس امری ہے اور بعض اس طرح کہ یہ محض ایک کیفیت قلبی یا مقام کا نام ہے۔ میرا مذہب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نظام عالم میں جاری وساری نہیں بلکہ نظام عالم کا خالق ہے اور اس کی ربوبیت کی وجہ سے یہ نظام قائم ہے۔ جب وہ چاہے گا اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔''

(مقالات اقبال، مرتبہ سید عبدالواحد معینی، شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۱۶۲۔۱۶۹)

اقبال فقر غیرت، فعالیت، ترقی اور تعلیمات قرآنی کے حامی تھے، ان کی نظر میں اصل تصوف یہی ہے۔ وہ منفی تصوف کے قائل نہیں، جو فقر تو ہے مگر اسی کے ساتھ ناداری، آرام طلبی، بے کاری، سستی اور بے توجہی بھی ہے۔ اقبال انسان کو مجبور اور بے دست و پا نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ انسان جدوجہد اور حرکت وعمل میں آزاد ہے، البتہ بعض مسائل میں وہ مجبور و پابند ہے۔ علامہ اقبال تصوف کے نام پر رہبانیت، سستی، کاہلی، بے کاری اور آرام طلبی وخودغرضی کے خلاف تھے۔ مختصر یہ کہ اقبال نے جن فلسفہ ونظریات کی مذمت وتنقید اپنے کلام میں کی ہے ان ہی مسائل ومباحث سے اپنے خطوط میں بھی بحث کی ہے۔

غالب کے فارسی خطوط کا مختصر تذکرہ

دنیا کی زندہ جاوید زبانیں سادگی سے مشکل پسندی کی جانب مسلسل رواں دواں رہتی ہیں اور اگر ان میں صلاحیت و استعداد ہوتی ہے تو پھر دشوار پسندی سے سادگی و آسانی و روانی کی جانب سفر آزما ہو جاتی ہے، فارسی نے یہ سفر تقریباً کئی صدیوں میں پورا کیا اور پھر دائرہ میں نقطۂ آغاز تک پہنچ کر دوبارہ اپنی گردش میں لگ گئی۔ مرزا اسداللہ خاں غالب کی دور بینی نے اچھی طرح یہ سمجھ لیا تھا کہ آنے والے وقت میں ماضی کے سہارے نہیں رہا جا سکتا بلکہ مستقبل میں اپنے وجود کو قائم و دائم رکھنے کے لیے مشرق و مغرب کے زیادہ افکار اور نئے نئے تجربات کو اپنانا بے حد ضروری و لازم ہے۔ یہ غالب کا استادانہ مزاج تھا۔ انھوں نے فارسی اور اردو میں جو بھی سرمایہ چھوڑا ہے اس کی حیثیت کم درجہ کی نہیں ہے۔ فارسی میں ان کا سرمایہ صرف کمیت کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ کیفیت کے لحاظ سے بھی اردو سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ 'مراسلہ کو مکالمہ' بنانے کا دائرہ غالب کے یہاں صرف اردو تک محدود نہیں ہے بلکہ فارسی میں کئی صدیوں کی روایت کے برخلاف غالب نے القاب و آداب کو کم کیا۔ زبان کو عربی کے غیر ضروری اور مشکل الفاظ سے پاک کیا۔ سادہ و رواں عبارت کو ترجیح دی جبکہ مرزا غالب کے لیے اردو میں یہ کام نسبتاً آسان تھا کیونکہ وہ اردو مکتوب نگاری کے بانی بانیوں میں سے ہیں لیکن فارسی میں روایت کو توڑنا صرف و صرف مرزا اسداللہ خاں غالب کے بس کی بات تھی۔ اس لیے ایک صاحب نظر میں ہی ایسی کمال کی ہمت اور جرأت ہوتی ہے جو روایتی ڈگر سے ہٹ کر اپنے لیے نئے نئے راستے تلاش کرتا ہے۔

ہندوستانی ادیبوں میں مرزا اسداللہ خاں غالب یقیناً یگانۂ روزگار شخصیت ہیں کہ وہ دو مختلف زبانوں یعنی فارسی و اردو اور نظم و نثر دونوں میدانوں میں یکساں شہرت و مقبولیت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر زمانہ میں دلچسپی و توجہ کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ بنیادی طور پر تو غالب غزل کے شاعر ہیں

ڈاکٹر شبانہ عزیز، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، پریاگ راج

اوراس میں کوئی شک وشبہہ نہیں کہ اگر ایک طرف ان کی فارسی غزل ہندوایرانی تمدن کی بہترین نمائندہ ہے تو دوسری طرف اردوغزل ان کی بدولت فکروفن کی انتہائی بلندیوں تک پہنچی ہے۔اسی طرح جہاں انھوں نے اردونثر میں اپنے خطوط کے ذریعہ مکتوب نگاری کی ایک طرز جدید اور انشاپردازی کے ایک سدابہار اسلوب کی بنیاد رکھی وہیں فارسی نثر میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ غالب کے فارسی خطوط، ان کے دیباچے اورتقریظیں بھی انھیں صاحب طرز انشاپرداز کی حیثیت سے ایک بلند مقام عطا کرتی ہے۔ یہ منتشر تحریریں جونصابی نوعیت کے دوزبانوں اورمنتخب فارسی اشعار کے ایک مختصر مجموعہ کے ساتھ ''پنج آہنگ'' میں یکجا کردی گئی ہیں۔ پنج آہنگ کے شروع میں ہی انھوں نے ''نامہ نگاری'' کے اصول سے بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ مکتوب نگاری کی بنیاد کا مقصد مکتوب الیہ کے خیالات کی ترسیل وابلاغ ہے۔ غالب اپنی فارسی نثر کوفارسی زبان کے لیے قانون کا درجہ دیتے ہیں اوراپنی پنج آہنگ کا ان الفاظ میں تعارف کراتے ہیں:

''نسخۂ پنج آہنگ کہ اگر نہ ازمن بودے، گفتے فارسی را قانونے است خرد پسند، بسانکتہ ہای ژرف درآن بکار رفتہ است وفراوان ترکیب ہای شگرف ولغت ہای نغز بہ نگارس درآمدہ۔''

ترجمہ۔''اگر پنج آہنگ میری تصنیف نہ ہوتی تو کہتا کہ یہ کتاب فارسی کے لیے قانون کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں دقیق و نازک نکات، نادرترکیبیں اورفصیح وشیریں الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔''[۱]

(پنج آہنگ مرتبہ سیدوزیرالحسن عابدی،ص ۵۶۸)

فارسی کے اس پنج آہنگ کا بیشتر حصّہ فارسی خطوط پر مشتمل ہے۔ غالب نے فارسی خطوط نگاری کے بارے میں یہ وضاحت کی ہے:

''نامہ نگار را آن باید کہ نگارش را از گزارش شہر نبردہ نسبتن را رنگِ گفتن دہد ومطلب را بدان روش گزارد کہ دریافتن آن دشوار نبود و

اگر مطلبے چند داشتہ باشد در تعدیم و تاخیر ژرف نگہی بکار
بردوازان پرہیز دکہ سخن گردہ درگرہ گردد واجزای مدعا بہمد گرفر
وخورد۔ زنہار استعارہ ہای دقیق ولغات مشکلۂ نامانوس در
عبارت درج نکند ودر ہرنور ورعابت رشبۂ مکتوب الیہ درنظر
دارد، تاتواند، سخن رادرازی ندہد واز تکرارِ الفاظ محترز باشد بیشتر
بہ مذاقِ اہل روزگار حرف زند واز احاطۂ قواعد وقوانینی کہ قرار
دادہ این مردم است بدرنرود، امّا اندازۂ خوبی زبان نگہدارد و
این پارسی آمیختہ بہ تازی رادرکشاکشِ نصرفاتِ بندی زبانانِ
فارسی نویس ضایع نگزارد ولغاتِ عربی جز بقدر بایست صرف
نمایدوہیوستہ دران کوشد کہ سادگی ونغزی شعارِ اوبود۔''

(پنج آہنگ، ص۶، ۷)

غالب نے خطوط نگاری کے جورہنما اصول بیان کیے ہیں وہ اس طرح ہیں جیسے طرزِ تحریر کو گفتگو کے انداز سے زیادہ قریب رکھا جائے، اگر مطلب زیادہ اور مختلف ہوں تو ان کو بیان کرنے میں تقدیم وتاخیر کا مناسب خیال رکھا جائے۔ تحریر میں پیچیدگی پیدا نہ ہونے دی جائے اور بات کو طول دینے سے پرہیز کیا جائے۔ مشکل استعارے اور نامانوس الفاظ سے اجتناب کیا جائے۔ انداز بیان کی خوبی پر توجہ دی جائے۔ فارسی میں بقدر ضرورت عربی کے الفاظ استعمال کیے جائیں اور بہتر الفاظ کا استعمال کیا جائے۔ آگے چل کر فارسی کو عربی سے پاک رکھنے کی تلقین کرتے ہیں اور خاص طور سے ہندوستان کے فارسی دان جن کے لیے فارسی دوسری اور عربی تیسری اکتسابی زبان ہوگی غالب فارسی کو ہندوستانیوں کی اس دست برد سے بچانا چاہتے ہیں۔

''و این پارسی آمیختہ بتازی را در کشاکش تصرفات بندی

زبانان پارسی نویس صنایع نگزارد و و لغات عربی جز بقدر بایست صرف نہ نماید۔''

آخر میں ان کی ہدایت سادگی اور آسانی کے لیے ''ونرم گوید وآسان گوید۔''

غالب زمانہ کے چلن کے خلاف مختصر بامعنی کہنے کو ترجیح دیتے ہیں اور طوالت کلام سے گریز کی نصیحت کرتے ہیں۔

(کلیات نثر غالب، ص ۵)

مکتوب الیہ کا مرتبہ خطوط نگاری میں ملحوظ خاطر رہے۔

''بندہ نوازا! فارسی میں خطوط کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری وضعف کے صدموں سے محنت پژوہی وجگرکاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارتِ عزیزی کو زوال ہے۔''

(اردو خط بنام عبدالرزاق)

اگرچہ غالب کا شمار سبک ہندی کے شاعروں اور ادیبوں میں ہی ہوتا ہے جس میں پیچیدگی، گہرائی اور حسن بیان کی طرف زیادہ زور دیا جاتا تھا لیکن غالب کے باتیں کہنے کے لیے تو اتنے نکتے تھے کہ ان کی زبان و بیان کی آرائش وزیبائش میں اپنے مخاطب کو مبہوت کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، وہ بہت ہی سادہ اور رواں زبان میں باریک نکتے بیان کر سکتے تھے اور پڑھنے سننے والے کو آرام سے اپنی طرف متوجہ کر سکتے تھے۔ فارسی مکتوب نگاری میں آج بھی تکلفات کی رعایت کی جاتی ہے یعنی القاب و آداب سے مخاطب سے راقم کے تعلقات کا اندازہ پہلی نظر میں نہیں ہوتا مگر غالب نے اس دور والے راستے کو ترک کر کے سیدھا وسادہ راستہ اپنانے کی کاوش کی۔ مثلاً:

''حضرت سلامت من کہ مرزا زبان درستایش بے قرار''

''مخلص نواز والا نامہ رسید۔''

بلاشبہ اس سادگی میں غالب کا خلاقانہ ذہن طرز ادا کی پرکاری بھی کرتا جاتا ہے۔ غالب نے اپنی تحریر کو سجایا اور سنوارا ہے اس کا ایک ایک لفظ سوچ سمجھ کر لکھا ہے۔ اسے مسجع و مقفیٰ شکل دی ہے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کے مسجع و مقفیٰ جملے رواں ہیں۔ ان میں ظاہر ہے تصنع سے کام لیا گیا لیکن مناسب الفاظ کے انتخاب نے کسی قسم کی پیچیدگی اور ابہام کو پیدا نہیں ہونے دیا ہے۔ غالب کی عبارت آرائی باوجود ان کے بقول سخن آرائی پڑھنے والے اور سننے والے کے لیے بار خاطر ہونے کے بجائے ذہنی انبساط کا باعث ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ غالب نے اپنی عبارت آرائی سے اپنی فارسی دانی، زبان فارسی پر قدرت اور تسلط کا اظہار کیا ہے اور خواہش کی ہے کہ اہل نظر ان کی اس ادبی کاوش کی داد دیں اور اسے سراہیں۔ انھوں نے اپنی جرأت مندی سے اپنی اس خواہش کو ان الفاظ میں اقرار بھی کیا ہے کہ:

''گرفتم کہ سخن آرائی خودنمائی است، نہ آخر چشمی و دلی دارم۔''

(پنج آہنگ، ص ۵۱۱)

''پنج آہنگ'' جیسا کہ نام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پانچ باب نامہ نگاری سے متعلق ہیں اور ان کے پہلے تین آہنگوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا البتہ آخری دو میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ پانچویں آہنگ میں غالب کے ابتدائی دور کے خطوط ہیں۔ پنج آہنگ میں ان کے بیشتر خطوط ایک، دو یا تین صفحات سے زیادہ پر مشتمل نہیں۔ ان کا انداز بیان بھی واضح ہے۔ غالب نے اپنے بیشتر خطوط سے محض کار برآری کا کام لیا ہے۔ غالب نے سخن آرائی اور عبارت آرائی ضرور کی ہے لیکن الفاظ، جملے وغیرہ کی تکرار سے اجتناب کیا ہے۔ ایک ہی بات کو مختلف انداز اور الفاظ و عبارات میں پیش کرنا جو فارسی کے بیشتر نثر نگاروں کا طریقۂ کار اور منشیانہ طرز تحریر کی دین تھا، غالب نے اس اسلوب سے صرف نظر کیا ہے۔ پنج آہنگ میں غالب کا ایک خط سات صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ خط مولوی سراج

الدین احمد کے نام ہے۔اس میں غالب نے مکتوب الیہ کے اصرار پر قبل از اسلام ایرانی تاریخ اور فارسی زبان کی نوعیت وغیرہ کے بارے میں مختصر طور پر روشنی ڈالی ہے۔قابل توجہ پہلو اس خط کا یہ ہے کہ ''قاضی محمد صادق اختر'' کی فرمائش پر خود اپنے حالات زندگی بھی لکھتے ہیں۔قاضی محمد صادق اختر قتیل کے شاگرد تھے وہ اپنا تذکرہ آفتابِ عالم تاب مرتب کر رہے تھے غالب کے حالات اس میں شامل کرنا چاہتے تھے۔قتیل ان کے شاگردوں اور غالب کے درمیان ناخوشگوار تعلقات کا انھیں علم تھا۔اس لیے انھوں نے غالب کو حالات زندگی لکھنے اور اپنے تذکرہ شامل کرنے کے لیے براہ راست نہیں لکھا بلکہ کلکتہ میں غالب کے دوست مولوی سراج الدین احمد سے، جن کی غالب سے خط و کتابت بھی تھی، اس ضمن میں درخواست کی۔ غالب نے اسے خط میں قاضی محمد صادق اختر کی فرمائش بھی پوری کی ہے اور اپنے حالات زندگی کو بھی لکھا ہے۔غالب کے ذہن میں رہا ہوگا کہ خطوط میں اختصار سے کام لینا چاہئیے اس لیے اپنے اس خط کے آخر میں وہ درازنفسی پر معذرت خواں ہیں اور لکھتے ہیں:

''نامہ بہ پایان رسید وشرم پراگندہ گویی و درازنفسی برمن استلم کرد دیدہ وران دانند کہ گفتنی فراوان بود و افسانہ پریشان، تا کجا تا کجا اندک گفتمی و گفتار را از درازی نگاہ داشتمی۔مرادر آنچہ افت، گنابی نیست واگر خود گناہ است دوست کریم است۔

ترجمہ: خط ختم ہوا۔اہل نظر کو اندازہ ہوگا کہ یہ افسانہ پریشان اس سے مختصر نہیں ہوسکتا تھا۔بہرحال جو کچھ لکھا ہے وہ تعمیل ارشاد میں ہے اور اس میں میرا کوئی تصور نہیں۔اگر ہے بھی تو دوست کریم ہے۔''

غالب نے جہاں عربی سے پاک رکھا وہیں چند ایسے فارسی الفاظ بھی اپنی تحریروں میں استعمال کیے ہیں جو ایران کے جدید فارسی نثر لکھنے والوں کی نظروں سے تقریباً اوجھل رہے۔مثلاً ویژہ: یہ لفظ خاص،

مخصوص کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور جدید فارسی لکھنے والوں میں رائج ومقبول ہے۔ غالب دراصل شاعر تھے جب وہ نثر لکھتے تھے تو ان کا شاعرانہ ذہن اور رویّہ اپنا جدا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہتا تھا۔ مثلاً دلکش اور نئی تراکیب ان کے اسی شاعرانہ مزاج کی پیداوار ہیں۔ ''لاابالی پوی: بےفکر؟ صہبائی التفات، دودسواد'' فارسی میں وفات اور انتقال کے لیے بےشمار تراکیب استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً: رحلت کردن، بہ عالمِ لاشتافتن، بجست خرامیدن، واصل بحق شدن، وغیرہ وغیرہ لیکن غالب کی جدّت پسند طبیعت نے اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بھی نئی اور دلچسپ تراکیب وضع کی ہیں۔ جیسے جامہ گزاشتن یا بہ آغاز جا خرامیدن۔

غالب حساس طبیعت کے مالک تھے۔ میر سید علی خان بہادر عرف حضرت جی نے غالب کی تعریف میں چند جملے لکھے ہوں گے اور ان سے ملاقات کی آرزو ظاہر کی بس اتنے میں ہی غالب خوش ہو گئے ان کے قلم نے ان کی اس بے پناہ خوشی کے اظہار نے اس طرح ان کا ساتھ دیا کہ:

> ''کیستم تا بدیں التفات ارزم ومرا در نکوبی این پایہ باشد کہ کس مرا تواند ستود وارزومندِ دیدن من تواند بود وآن گاہ این چنین گرانمایہ ووالا پایہ کسی کہ گوہرش آبروی ہفت دریاست وگلشن رنگ وبوی ہشت گلش شیلی با آن ہمہ، قطع نظر ہا از ماسویٰ اللہ درصومعہ بہ تمنای قدومش چشم براہ ومنصور با این ہمہ ترانۂ انا الحق در ہنگامہ بہ آرزوی گفتارش گوش بر آواز سبحان اللہ! آن کہ تجلّی طور بہ پروانگی شمع جمالش ارزو با من ارنی گوست وانکہ دیدارش تابِ ہر نظر نبود از من دیدار جوست۔''
>
> (پنج آہنگ، ص۴۴۴)

غالب نے امیر حسن خان کو اور اسی خط میں وہ اخر میں مکتوب الیہ اور مولوی محمد مسیح الدین

خان دونوں کوسلام لکھ رہے ہیں۔ایک خط میں دو دوستوں کوسلام اس طرح لکھتے ہیں:

''و بہ دو قبیلہ نماز گزار دنِ مرا از بدعت ہای حسنۂ کیش یگانگی دانند۔''

غالب نے نواب حسام الدین حیدر کو خط لکھا۔اس میں نواب موصوف سے کہا کہ آپ بیتی بڑی طویل ہے لیکن میں نہیں چاہتا کہ تفصیل میں جاؤں اور دردسر کا باعث بنوں۔ یہ بات غالب نے اس دلچسپ پیرائے میں:

''سخن ایست کہ نفس در بادیہ پیمائی درنگ ندارد۔فراوان خون خوردہ و جہاں جہان پارۂ دل بہ دامن ژمردہ می شود۔ اگر خود ہم ہمۂ آنرا بہ ورق اندر آرم، نامہ از دازی بہ کلکتہ رسد ورقم انجام گری نگردد۔''

مولوی سراج الدین نے کلکتے سے غالب کو خط لکھنے میں دیر کردی۔غالب ان کے خط کا انتظار کررہے تھے۔جھنجھلا کر مگر محبت آمیز انداز سے اپنے خط میں گلہ کیا۔

''اگر نہ اندوہِ سترگ بند ہر دلم نہادہ بودی، من دانم ودل کہ درشکوہ چہ روشہا ایجاد وو در گلہ چہ عربدہ ہا بنیاد کردمی۔صرفۂ شما درنا کامی من است ورنہ اگر تاب وتوان داشتمی، آن قدر باشما در آویختمی کہ شمارا دامن و گریبان بہ زبان رفتی ومرا سرورو شکنی۔آخراز خدا ترسید واز روی داد بسنجید کہ کارِ من وشما بدان رسد کہ روزگار ہا بگزارد و بہ نامہ یاد نگردم۔''

(پنج آہنگ،ص۳۲۳)

غالب کا انداز بیان نرالا وانوکھا اور منفرد ہے۔ان کی ظرافت طبع، شاعرانہ مزاج، مطالب کو صراحت سے بیان کرنے کا عزم، عربی الفاظ کے مقابلے میں فارسی الفاظ کو ترجیح دینا، دلکش تراکیب، فارسی محاورات کے استعمال وغیرہ پر ان کی توجہ اور مزید برآن اپنے اور دوسرے فارسی شعرا کے اشعار کے برمحل استعمال کو ترجیح دیتے تھے۔ان کے خیال میں نثر میں اشعار کی پیوند کاری نثر کی قسموں میں افزائش

دیتی ہے۔ان تمام خصوصیات نے غالب کی نثر کوانفرادیت بخشی ہے۔غالب اپنے اس منفرد اسلوب تحریر کوترک کرنے پر آمادہ بھی نہیں تھے۔وہ اس اسلوب کو ناموس سخنوری قرار دیتے تھے۔غالب کا گمان تھا کہ ان کے طرز تحریر کی پیروی ممکن نہیں اس ضمن میں ایک واقعہ پیش ہے جو غالب نے اپنے ایک خط میں بیان کیا ہے اور جس سے ان کے اس یقین کا علم ہوتا ہے کہ ان کا طرز منفرد اور اس کی تقلید مشکل ہے۔منشی امان اللہ خان دیوانِ راجا الور نے غالب کی طرف سے ایک عرضداشت راجا الور کی خدمت میں پیش کی اور راجا سے غالب کی ستائش وسفارش کی غالب نے یہ عرضداشت خود نہیں لکھی تھی اور انھیں اس عرضداشت کے راجا کی خدمت میں پیش کیے جانے کا علم بھی نہیں تھا۔کچھ وقت گزرنے کے بعد جب اپنی طرف سے عرضداشت کے لکھنے کا اور راجا کی خدمت میں پیش کیے جانے کا علم ہوا تو انھوں نے منشی امین الدین کے بھائی فضل اللہ خان کو لکھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی میری طرز تحریر کی پیروی کر سکے۔اس ضمن میں غالب کے الفاظ پیش ہیں:

''اگر چہ از گزرانندۂ عرضداشت یعنی مُطاعی منشی امین اللہ خان سپاس پذیرفتم و برآن ستایش کہ بہ فرمانِ مہر و مہربانی بود، آفرین گفتم، لیکن بہ شگفتی فرو ماندم کہ عرضداشتی کہ من ننوشتہ باشم تا بہ مُطاع کہ رساند و مخدوم کرم پیشہ بی آن کہ من گفتہ باشم، چگونہ در آن انجمن از من سخن راند من خود بہ شنیدنِ ایں آفرین بر خود نفرین و جیب و دامن بہ خونابۂ چشم رنگین کردہ ام کہ ہیہات قدرِ دوست نشناختم و دیدہ روشناس کفِ پایش نساختم۔ کاش غالب بیوا خود حوصلۂ بندگی خود از دوست درخواستی تا منّتِ غم خواری آن عریضہ سپار ناشناسا کہ ہنوزش ندانستہ ام کہ کیست از میان برخاستی۔ یارب آن فرشتہ کہ مرا

بهنجاری کہ من ندانم کہ ازمن بُرد ہنجار من درنگارش از کجا آورد۔ چہ سرکردنِ این سرہ روش اندازۂ ملک نیست و دراین کہ من می گویم ہیچ گونہ شک نیست۔''

(پنج آہنگ، ص۴۸۲)

خط نویسی نثر نگاری کی ایک مستقل صنف ہے اور یہی وہ صنف ہے جس میں کاتب تحریر اپنا مافی الضمیر اپنا کردار اپنے اخلاق و عادات دوسروں کے متعلق اپنی حقیقی رائیں، اپنی سوسائٹی کا سچا واقعہ، غرضکہ ہر وہ چیز جو اس کے قلم سے نکل کر منظر عام پر آجاتی ہے صحیح طور پر دنیا کے سامنے ظاہر کر دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ غالب کی تحریر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مرزا کے خطوط ہی ان کی نثر ہے کے بڑے بڑے کارنامے ہیں ان کی خطوط نویسی کا انداز جس نے ان کو نثر نگاروں کی صف اوّلین میں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان سب سے آگے پہونچادیا اور ان کا کوئی مقابل نہ کبھی تھا بہ بالفضل ہے اور نہ آئندہ ہونے کی امید ہے۔ غالب کی تحریروں کا ایک ایک لفظ اہل نظر کی آنکھ کا سُرمہ ہے۔ ان خطوط کا مطالعہ تو ان کی شخصیت مزاج کردار حالات اور ادبی ذوق کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے۔ ان خطوں میں وہ بے تکلفی اور سنگت ہے جس کی وجہ سے غالب آج پوری دنیا میں سب سے زیادہ ممتاز و محبوب ہیں۔

ذیل میں مرزا غالب کے چند فارسی خطوط کا فارسی سے اردو میں ترجمہ:

''ھمانا این عبودیت نامہ راقماش سلام روستائی است و دائرۂ ہر حرفش پرواز کاسۂ گدائی۔ لختی شکم بندہ ام وقدری ناتواں۔ ہم آرایش خوان جویم وہم آسایش جان۔''

(پنج آہنگ، ص۲۰۳)

ترجمہ:۔ بہرحال یہ نیاز نامہ ایک طرح کا سلام روستائی اور اس کا ایک ایک حرف کاسۂ گدائی ہے۔ پیٹ کا بندہ ہوں اور قدرے

ناتوان مگر کم بخت دل ہے کہ دستر خوان کی رونق اور آرائش
جان دونوں کا خواہشمند ہے۔

(ترجمہ محمد عمر مہاجر، ادارہ یادگار غالب، کراچی، ص ۱)

مرزا غالب کے لیے پنشن کا قضیہ زندگی کا اہم عنوان بن گیا تھا۔ اسی وجہ سے ان کے خطوط کا اچھا خاصہ وقت پنشن کے ذکر سے معمور ہے۔ ایسے ہی ایک خط میں وہ مولوی سراج الدین احمد کو لکھتے ہیں:

''اکنوں مرا گرہی چند بہ سر رشتۂ خیال افتادہ، یکی از دیگری سخت تر و محکم تر نخیست اینکہ سرجان ملکم، چنانکہ این نامۂ فارسی بی نام ونشان را باور داشت، رپورٹ انگریزی را کہ جگر گوشۂ دفتر سرکاری است غلط وانمودہ است یا نہ۔''

(پنج آہنگ، ص ۳۱)

ترجمہ:۔ اس سے میرے رشتۂ خیال میں چند گرہیں پڑ گئیں ہیں، جن میں سے ہر ایک دوسرے کے مقابلے میں زیادہ سخت اور زیادہ مضبوط ہے۔ پہلی بات یہ کہ سرجان ملکم نے اس بے نشان کے نامۂ فارسی کو باور نہیں کیا اور رپورٹ انگریزی کو کہ زادۂ دفتر سرکاری ہے غلط ٹھہرایا ہے۔

(اوراق معانی، مترجمہ تنویر احمد علوی، ص ۱۰۲)

مرزا غالب کے ایک اہم و خاص مکتوب الیہ مولوی سراج الدین احمد ہیں۔ فارسی میں غالب کے جو خطوط سب سے زیادہ ملتے ہیں وہ سراج الدین احمد کے نام سے ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے خط میں مرزا غالب سے پارسیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہی۔ سراج الدین

احمد تحریر کرتے ہیں جس کا جواب غالب نے اپنے ایک خط میں دیا۔ لہٰذا غالب خط میں سراج الدین احمد کو پارسیوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں۔

''ونگارندۂ 'دبستان مذاہب' بااین ہمہ لاف آشنا روئی انچہ میگوید نہ ہمہ است ونہ ہمہ برجای خوداست۔''

(پنج آہنگ، ص ۳۶۸)

ترجمہ۔''مذاہب کی تاریخ لکھنے والوں نے اپنے ادّعاے آگہی کے باوجود کچھ لکھا ہے وہ سب ادھورا اور غلط ہے۔''

(پنج آہنگ، مترجمہ محمد عمر مہاجر، ص ۳۷)

یعنی 'دبستان مذاہب' کے مصنف نے اپنے علم و آگہی کے دعوے کے باوجود لکھا ہے وہ نہ تو کامل ہے اور نہ ہی اپنی جگہ درست۔ اسی ضمن میں 'دبستان مذاہب' کے مصنف کی پارسیوں کے بارے میں اطلاعات سے عدم رضایت کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ مرزا غالب ایک خط میں اپنے مکتوب الیہ سے یوں مخاطب ہیں:

''مرا کہ پیک خیال در بدر است وسر رشتۂ گفتار گرہ در گرہ، دلی با ہزار غصّہ درستیز بھی بایں زمزمہ در خروش، بمقتضای فطرت پیمانۂ آفرینش رادردم وباعتبار حالت ناصیۂ بینش راداغ۔''

(پنج آہنگ، ص ۲۳۶)

ترجمہ:۔''میرا پیکر خیال در بدر بھٹک رہا ہے اور سر رشتۂ گفتار گرہ در گرہ ہے۔ میرا دل ہزار غم وغصّہ کے ساتھ ستیزہ کاری میں مصروف ہے اور میرے لب ہزار نغمہ سنجیوں کے ساتھ محوِ خروش۔ میں اپنے مقتضای فطرت کے مطابق پیمانۂ آفرینش کے لیے دردتہہ جام ہوں

اوراپنے احوال کے اعتبار سے میرا وجود پیشانی بینش کے لیے
ایک داغ کا حکم رکھتا ہے۔''

(اوراق معانی، مترجمہ تنویر احمد علوی، ص ۵۶)

ایک خط میں غالب اپنے روحیۂ درونی کو اپنے مکتوب الیہ سے یوں آشکار کرتے ہیں:

''داستان درماندگی جز بہ گفتن راست نیاید ونوشتن آشوب این
ہنگامہ را برنتابد۔ یارب زود باشد کہ بند دوری از ہم بگسلد و
دل بہ پیوند ہمزبانی آرامش پذیرد۔''

(پنج آہنگ، ص)

ترجمہ۔''درماندگی کی داستان اب اسی طرح بیان ہوسکتی ہے
کہ اسے بیان نہ کیا جائے۔ اس ہنگامے کی آشفتہ سری کو اسی
طور پر سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ تحریر میں نہ آئے، خدا کرے جلد ہی
وہ وقت آئے کہ دوری ومہجوری کے رشتے منقطع ہو جائیں اور
دل ہمزبانی و ہمدمی سے آسودہ ہو یعنی درماندگی کی داستان
سنائی تو جاسکتی ہے لکھی نہیں جاسکتی۔ دل ہمزبانی کا آرزومند
ہے۔''

(اوراق معانی، مترجمہ تنویر احمد علوی، ص ۱۶۰)

(بنام جان جاکوب صاحب)

''اے سردار فرخندۂ خو پرسوں کہ منگل کا دن اور فروری کی
اٹھائیس تاریخ تھی ایک خط بذریعہ ڈاک آپ کی خدمت میں
بھیجا گیا۔ قطعات اور تاریخ کو درست وصحیح کر کے جو ٹھیک تھا

اس کو اسی طرح رہنے دیا ہے اور وہ کاغذ کہ جو آپ نے بھیجا تھا اس کو اس خط کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ اپنے وقت پر آپ کی نظر سے گزرے گا۔ غزلوں کو ابھی فکر تیز رو کی پرکار پر نہیں ناپا۔ (ان کو بھی) یقیناً چند دن میں دیکھ لوں گا۔

اس خط کے کہ جو آپ کو لکھ رہا ہوں خاص طور پر دو مقاصد ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ قصیدہ کہ جو اس بار [آغاز سال ۱۸۴۲ء] میں نے نواب گورنر جنرل بہادر (LORD EDWARD LAW ELLEN BROUGH) کو پیش کیا ہے اور جس کا مطلع ؎

ای بر تراز سپہر بلند آستان تو　　تو پاسبان ملک و ملک پاسبان تو

ہے، تین مطلعوں اور چالیس اشعار پر مشتمل ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ اگر ہے تو مژدۂ اطلاع ارسال کریں ورنہ سید الاخبار (اخبار دہلی) سے دیوان میں نقل کر لیں۔

دوسرے یہ کہ یہ خط آپ کے پاس ہیرالال لے کر آ رہے ہیں جو اس شہر کے شرفا و محبوبان عہد میں سے ہیں۔ انہوں نے ایک عمر [بڑودے کے] حکیم کاظم علی خاں کی رفاقت میں گزاری ہے۔ اس کے بعد وطن کی محبت سے مجبور ہو کر دہلی آ گئے اور یہاں بے بسی سے عاجز ہو کر چار و ناچار بالآخر گوالیار جا پہنچے۔ ان کا خط صاف ہے اور وہ اصول تحریر سے واقف ہیں۔ اگر وہ آپ کے کام آ سکیں تو اپنے پاس رکھ لیں اور ان سے کتابت کا کام لیں اور اگر مزید گنجائش ہو

تو (COLARTHUR SPEARS) رہی۔
(غرض) ہم تو روزگار کے تباہ کئے ہوئے ہیں کس سے دادرسی مانگیں اور منصفی کے لئے کس در پر جائیں۔
آسمان کے مارے ہوئے غالبؔ نے حدادب کا خیال نہ رکھتے ہوئے اپنی ایک غزل میں اس طرز کی دہائی دی ہے ؎

سپہر را تو بتاراج ما گذاشتہ ای
نہ ہر چہ دزددما بردد رخزانہ تست

ترجمہ۔ آسمان کو تو نے ہماری لوٹ مار کے لئے مامور کیا ہوا ہے (تو کیا) ایسا تو نہیں کہ قزاق جو ہم سے لوٹ کر لے گیا ہے تیرے ہی خزانے میں موجود ہو۔
صبر کریں اور مقوی دماغ کوئی دوا کھائیں اور ایسا سرمہ لگائیں کہ آنکھوں کا دھند دور ہو اور غم (ہرگز) نہ کریں چونکہ غم کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ درونی اور بیرونی قویٰ ہم نے رقم دے کر نہیں خریدے یہ تو ہمیں مفت ملے ہیں سو اگر واپس بھی لے لیں تو ظلم نہیں ہے۔ منجانب اسد اللہ محررہ اتوار ۱۹ دسمبر ۱۸۵۲ء‘‘

(منشی نبی بخش مرحوم کے نام)

’’صبح کا وقت ہے ایوان کے پردے گرے ہوئے ہیں انگیٹھی میں آگ روشن ہے اور میں انگیٹھی کے پاس بیٹھا ہاتھ تاپ رہا ہوں۔ مشرق کی جانب پردہ اٹھا ہوا ہے اور کمرے میں

دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ میں نے کہا ایسے اچھے وقت میں کس سے بات کی جائے اچانک دل میں آیا کہ (تیرا تو) کول [علی گڑھ] میں ایک برادر گرامی [حقیر] ہے اور اسی شہر میں ایک محبت کرنے والا دوست (تفتہ)۔ ان دو عزیزان روشن گہر کے گوش حق نیوش میں، صریر خامہ پھونک اور قلم کی زبان بے آواز کے ذریعے ان سے باتیں کر۔ دل نے کہا جواب کہاں سے ملے گا۔ جواب ملا کہ دو تین گوش بر آواز رہنا پھر سننا۔ دو ورق کہ جڑے ہوئے تھے ایک دوسرے سے جدا کئے ایک پر تمہارے اور دوسرے پر تفتہ کے اسم گرامی کے نام (خط تحریر کر کے) ڈاک کے سپرد کر دیے۔ اللہ اللہ جنون میں کیسے کیسے گن ہوتے ہیں۔

ان برادر گرامی کی بصارت کم ہو جانے (کی خبر پر) دل کا دکھ بڑھ گیا۔ وہ (کارکنان قدرت) کہ جنہوں نے جمشید سے اس کا کام اور سلیمان سے اس کی انگوٹھی چھین لی یقیناً قزاقی میں مشاق ہیں۔ جب تک راہزنی نہ کریں اور مال لوٹ کر نہ بھاگیں چین سے نہیں بیٹھتے۔ ہمارے قافلہ (زیست) کی (ساری) راس ہی سننا دیکھنا، بات کرنا اور چلنا ہے، بھلا کیوں نہ لٹے۔ ایک اونچا سنتا ہے تو مشین کیا بات کرے اور ایک کی آنکھ (کم نظری کے باعث) کھلی ہوئی ہے کہ (نجانے) کون آ رہا ہے، کیسے دیکھے) ایک کے پاؤں چلنے پھرنے سے رہ گئے ہیں تو ایک میں چلنے پھرنے کی سکت نہیں اور اپنے سے بہتر (شخص) کے سپرد کر کے اپنے آپ اور اس پر بھی

میں نے احسان کیا ہے۔غرض یہ کہ اس ضمن میں (آپ کی) خوش خلقی کی سپاس گزاری میں رائے صاحب کا ہمنوا ہوں اور نورچشمی منشی جواہر سنگھ کے مقصد کے نقش کے درست اترنے (حصول مدعا) میں ان کا شریک غالب ہوں۔اس ذیل میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔سورج کو تابانی اور دریا کو روانی سکھائی نہیں جاسکتی۔ع۔کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند۔ ترجمہ۔ چونکہ آقا خود طرز بندہ پروری جانتا ہے۔ والسلام بہ ہزار احترام۔

☆☆☆

مجاہدین آزادی کے کچھ اہم تاریخی خطوط

خطوط نویسی ایک فن ہے جس سے خط لکھنے والے کی شخصیت، احساسات اور اس کے خاندانی حالات کی ہی عکاسی نہیں ہوتی بلکہ ملکی حالات وواقعات، سیاسی ماحول اور معاشراتی پیچیدیوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ جن کو پڑھنے سے تحقیقی اور تاریخی نتائج برامد کئے جاسکتے ہیں۔ کسی ملک کی تاریخ وتدوین میں خطوط کا بھی اہم کردار ہوتا ہے کیونکہ یہی خطوط کسی بھی جگہ رونما ہونے والے واقعات کی نشان دہی کرتے ہیں جن سے تاریخ، دن، شخصیات اور جگہ کا صحیح تعین ہوتا ہے۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی ایک ناقابلِ فراموش باب ہے۔ تحریکِ آزادی ہند میں شامل ہونے والے لاتعداد مجاہدین کے ذریعہ لکھے گئے خطوط ہمارے ملک کی قیمتی وراثت ہیں۔ ہندوستان کی جنگ آزادی کے مختلف ادوار میں مختلف تحریک وقوع پزیر ہوئیں۔ ان ہی تحریکوں میں 'تحریک خلافت'، 'تحریک عدم تعاون'، 'تحریک سول نافرمانی'، بھارت چھوڑو تحریک' اور دیگر' انقلابی تحریکوں' میں ہندوستان کی عوام نے پورے جوش وخروش کے ساتھ حصّہ لیا۔ اسی درمیان ملک کہ مختلف صوبوں سے خواتین نے عوامی تحریک میں اہم کردار ادکیا۔ ان خواتین نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ اپنے گھر کے مردوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کے شانہ بہ شانہ مختلف تحریکوں میں شریک ہوکر اپنی قربانیوں کی زندہ مثال پیش کی ہیں۔

ان مجاہد خواتین کے قلم سے لکھے گئے خطوط اس تحقیقی مقالہ کا حصہ ہیں۔ خلافت کمیٹیوں کے جلسوں مظلومین سمرنا کی اپیلوں تلک سوراجیہ فنڈ کے جلسوں میں ہندو مسلمان عورتوں نے اپنے زیورات دے کر اس کی عمدہ مثالیں پیش کر دی تھیں۔ تحریک آزادی ہند میں حصہ لینے والی خواتین شریمتی لکشمی جی دھرم پتنی شریمان بھولا ناتھ جی ایم اے (کلکتہ) نے اپنے طلائی کڑے تلک سوراجیہ فنڈ کے لئے معہ ایک خط کے لالہ لاجپت رائے جی کے نام ارسال کئے تھے۔ چونکہ خط سے جذبہ حب الوطنی کا اظہار ہورہا ہے اس لئے وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

ڈاکٹر نزہت فاطمہ، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ تاریخ قرون وسطیٰ، حمیدیہ گرلس ڈگری کالج، پریاگ راج

''سیوا میں نویدن ہے کہ بھارت ماتا کے اودھار ارتھ بھارت
رتنوں کی جو شٹریہ اگنی پر پکشا ہو رہی ہے۔ اس مہا یگیہ کے
نمت میں اپنے ہاتھوں کے دو سونے کے کڑے بھیجتی ہوں۔
مانیہ بھی جو آبھوشن تھے وہ بھی میں سیوا میں ارپن کر دیتی
۔کِنتو (لیکن) وے بہت چھوٹے چھوٹے ہیں۔ جن کو بیچنے
سے شاید ایک سو روپیہ بھی پراپت نہ ہو۔ اس خیال سے ان کو
نہیں بھیجتی۔ یہی میرے پاس بڑا زیور تھا۔''[۱]

'تحریک عدم تعاون' نے جب زور پکڑا تو خواتین ہند بھی پورے عزم کے ساتھ اس تحریک کا حصہ بن گئیں اور اپنے باپ، شوہر، بھائیوں اور بیٹوں کی حوصلہ افزائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس سلسلہ میں شریمتی سیتا دیوی کی سہیلی کے بھائی اور خود سیتا دیوی اور اس کے بھائی نرائن دیو کے اصل خطوط ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

''میرے پرم پیارے ویر (بھائی) نارائن دیو جی نمستے! میری
ایک سہیلی شیلا دیوی نے اپنے چھوٹے بھائی پریم دیو کو جو لاہور
کے کالج میں تعلیم پاتا تھا۔ اور امسال اس نے آخری امتحان
دینا تھا۔ چٹھی لکھی کہ جس قدر ظلم و ستم سندھ و پنجاب پر ہوئے
ہیں۔ ان کو ہٹانے اور ہند کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی
خاطر مہاتما گاندھی جی کو پرماتما نے آمادہ کیا ہے ان کے اعلان
و فرمان پر عمل کرنا دھرم میں داخل ہے۔ اب ملک کی سچی سیوا کا
وقت ہے۔ کیا اچھا ہو کہ تم 'نان کو پریشن' پر عمل پیرا ہو کر کالج
چھوڑ دو۔ اور مہاتما جی کے پروگرام کے مطابق ملک کی سیوا کر

و۔جس سے تمہارا اور تمہارے پتروں کا جنم سدھریگا۔''[۲]

آگے وہ لکھتی ہیں کہ اس چھٹّی کا جواب میری سہیلی کے نام آج حسب ذیل موصول ہوا :

''بہن جی نمستے !

میرا ارادہ پہلے ہی سے ایسا تھا۔جیسے آپ نے تحریر فرمایا۔صرف آپ سے اجازت مطلوب تھی۔آپ میری والدہ کی بجا ہیں مجھے آپ کا حکم سر آنکھوں پر منظور ہے۔اس لئے آپ کا خط پہنچتے ہی میں نے کالج چھوڑ دیا اور نان کو پریشن کانگریس میں نام درج کرالیا ہے۔عمر بھر ملک کی سیوا کر کے آپ کی منشاء کو پورا کرونگا۔(آپ کا خادم پریم دیو)''[۳]

بھائی کے اس خط کے جواب میں سیتا دیوی خوش ہوکر رقم طراز ہیں:

''آپ میرے چھوٹے بھائی ہو اور ہمارے خاندان میں صرف تم ہی روشن چراغ ہو۔کیا اچھا ہوا گر تم فورتھ ایر کلاس گورنمنٹ کالج کو خیر باد کہہ کر منحوس ڈگری سے منہ موڑ کر مہاتما جی کی سیوا میں پہنچو۔اور ان کے پروگرام کے مطابق آٹھ ماہ سیوا کر کے سچی ڈگڑی حاصل کرو۔اور عملی طور پر روشن چراغ بن کر خاندان کا نام روشن کرو۔میں بھی تمہاری والدہ کی بجا ہوں اور تمہاری پرورش میں کافی حصہ لیا ہے۔اگر میری منشاء کے مطابق عمل کروگے تو میں سمجھوں گی کہ تم نے اپنا فرض ادا کیا اور مجھے خدمات کا حق مل گیا۔(سیتا دیوی)''[۴]

ان خطوط سے 'تحریک عدم تعاون' میں خواتین کا فعال کردار نظر آتا ہے۔

الہ آباد کے مشہور قوم پرست اخبار 'انڈی پینڈنٹ' کے پرنٹر اور پبلشر جناب سی۔ایس۔رنگا ائیر

کو جب گرفتار کیا گیا تو انہوں نے پہلے انتہائی صبر وتحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے انگریزوں کے جبر و تشدد کو برداشت کیا۔ لیکن گورنمنٹ سے معافی نہیں طلب کیا کہ کہیں قومی خدمات اور حب الوطنی کے جذبہ پر آنچ نہ آجائے۔ اس لئے اس قوم پرست نوجوان نے ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ نہایت دلیری کے ساتھ کیا۔ اور کسی قسم کی کمزوری ظاہر نہیں کی اور نہ ہی معافی کی خواہش ظاہر کی بلکہ سزا کا حکم نہایت صبر اور حوصلہ اور اطمینان کے ساتھ سنا۔ اور اس کو اپنی قومی خدمات اور حب وطنی کا صلہ تصور کیا۔ ان کی چچازاد بہن آر چیلا امال ۵؎ نے لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند کے نام انصاف کرنے کے لئے ایک کھلی چٹھی لکھی ہے۔ جس کا ضروری حصہ یہاں بھی درج کیا جاتا ہے :

''میں حضور کو یہ چٹھی اس لئے لکھتی ہوں کہ آپ میرے شہنشاہ کے قایم مقام ہیں۔ اور اس لئے بھی کہ آپ نے اپنے تقرر کے وقت سے جو تقریریں انگلستان میں کیں اور جن میں آپ نے انصاف کا صاف اعلان کیا۔ اُن سے آپ کی انصاف کرنے کی خواہش معلوم ہوتی تھی۔ حضور انور! میرے چچازاد بھائی مسٹر سی۔ ایس۔ رنگا ائیر پرنٹر اور پبلیشر 'انڈی پینڈنٹ' کو انصاف کے نام پر جیل میں ڈال دیا گیا ہے چونکہ آپ نے اکثر پبلک میں کہا ہے کہ آپ واقعات کو نہایت توجہ اور غور سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ان حالات سے واقف ہوں گے، جن میں ان کو قید کیا گیا ہے اور نیز آپ کو اس دلیری کا بھی علم ہوگا۔ جس سے انہوں نے اس قید کا سامنا کیا ۔حضور انور جیسے نکتہ رس ہیں۔ ویسے ہی تجربہ کار بھی ہیں۔ اس لئے آپ کو ایک سیدھی سادھی ہندوستانی لڑکی کے جو خانہ

داری کی ذمہ داریوں سے دبی ہوئی ہے۔ کسی لیکچر کی ضرورت نہیں۔ تاہم میں اتنا کہنا ضروری سمجھتی ہوں کہ جو گورنمنٹ اس کام کی اسپرٹ کو دبانا چاہتی ہے۔ وہ اس کو اور بھی ترقی دینے کا موجب ہوتی ہے۔

مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں ہندوستان کے وائسرائے سے جس نے ہمارے ساتھ انصاف کرنے کا وعدہ کیا ہے، انگلستان کے سابق لارڈ چیف جسٹس سے جو انصاف کرتا رہا۔ اور سلطنت برطانیہ کے سابق سفیر سے جس نے امریکہ اور انگلستان کے درمیان اتحاد کی زنجیروں کو مضبوط کیا ہے، دریافت کروں کہ کیا پولیٹکل مصلحت اس اندھیر کی کوئی تشریح کر سکتی ہے۔ جو اس وقت صوبجات متحدہ میں پھیلا ہوا ہے! کیا ایک اخبار نویس کو یہ بھی حق حاصل نہیں کہ وہ کسی واقعہ پر کچھ رائے زنی کر سکے؟ حضور انور آپ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ایک خود دار شخص سے کسی قیاسی زیادتی کے لئے معافی طلب کرنے اور پھر اگر وہ اپنی خود داری سے کام لے تو اسے جیل میں دھکیل دینے کے طریق عمل میں پیٹ کے بل رینگانے کے حکم کی اسپرٹ جھلکتی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ سب کچھ آپ کے یہاں ہوتے ہوئے بھی اس انصاف کے نام پر ہو رہا ہے۔ جس کی حمایت کرنے کا آپ خود بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔

حضور انور! اگر ہمیں جلا وطن کر دیا جائے، گولی مار دی جائے، مارشل لاء اعلان کر دیا جائے اور سول آبادی کا مقابلہ کرنے کے لئے

ڈائر جیسوں کو مسلح کر دیا جائے تو انسانوں کی وحشیانہ بے رحمی اور زیادتی کی یہ باتیں جرمنوں کی بدولت ہماری سمجھ میں آسکتی ہیں۔لیکن آپ کے صریح اور صاف وعدوں کی آواز ابھی تک ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے۔اسی لئے آپ آزادی کے سرچشمے کو اس طرح غلیظ کئے جانے کی اجازت نہ دیں۔آپ اسے عروج خیال کرتے ہیں یا تنزل؟ کیا آپ کی قوت تخیل آپ کی نظروں کے سامنے اس نفرت آمیز نگاہ کا نقشہ نہیں کھینچ سکتی جس سے ہندوستانی برطانی انصاف کو دیکھتے ہیں اور یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہی وہ اصلاح شدہ گورنمنٹ ہے اور یہ سلوک ایسی اصلاح شدہ گورنمنٹ کے ہاتھوں ایک اخبارنویس کے ساتھ روا رکھا جارہا ہے۔جس میں ایک سابق اخبارنویس بھی شریک ہے۔آہ! کیسی صداقت ہے۔جس کا اظہار ہورہا ہے۔''[۶]

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے یہ خاتون مجاہدہ ملکی حالات وواقعات پر گہری نظر رکھتی تھیں اور تحریر وتقریر میں اس کو ملکہ حاصل تھا۔

شہید وطن اشفاق اللہ خاں کی قربانی اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔اشفاق اللہ کا نام تاریخ ہند میں اس لئے بھی شہرت کا حامل بنا کہ وہ پہلے مسلمان تھے جو کسی انقلابی پارٹی کے رکن تھے۔۱۹۲۲ء میں جب مہاتما گاندھی جی نے 'عدم تعاون تحریک' واپس لے لی تب عوام میں مایوسی چھا گئی اسی وقت ملک کے کچھ جوشیلے نوجوانوں نے انقلاب کے راستے کو اپنایا اور اسی 'انقلابی تحریک' کے تحت ۹/اگست ۱۹۲۵ء کو لکھنؤ کے نزدیک کاکوری میں اشفاق اللہ اور رام پرساد بسمل کے ساتھ دیگر

نوجوان انقلابیوں نے سرکاری خزانہ سے لدی ہوئی ٹرین کا خزانہ لوٹ لیا۔ اس واقعہ کا شدید ردِعمل یہ ہوا کہ ان سب نوجوانوں کو گرفتار کر کہ مقدمہ چلایا گیا۔ جن میں سے کچھ انقلابیوں کو کالا پانی کی سزا دی گئی، کچھ سرکار کے ذریعہ دی گئی لالچ میں آ کر ان کے گواہ بن گئے اور جیل سے چھوڑ دئے گئے۔ لیکن اشفاق اللہ خاں کسی طرح کی لالچ میں نہ آئے اور ان کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ اس سزا کو سن کر بھی ان کے پائے استقامت میں ذرہ برابر بھی لرزش نہیں آئی۔ بلکہ وہ بہت مسرور و شاداں تھے کہ ان کو اپنے وطن کی خاطر قربان ہونے کا سنہرا موقع مل رہا ہے۔ ایسے ہی محبّ وطن کی ماں مظہر النساء بھی یقیناً بہت عظیم شخصیت رہیں ہوں گی جن کی گود میں ایسے ہونہار سپوت کی پرورش ہوئی تھی۔ یقیناً یہ اندوہ ناک خبر ان کے گھر والوں کے لئے زبردست صدمہ کا باعث رہی ہوگی۔ اشفاق اللہ اپنی موت سے ایک ہفتہ قبل اپنی ماں کے نام طمانیت کے جذبہ سے لبریز آخری خط لکھتے ہیں جس میں ماں کو تسلی کے الفاظ بھی ہیں اور ان کی ہمت و جرأت، اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان وایقان اور استقلال کا بھی مظاہرہ ہوتا ہے۔ ان کا یہ طویل خط تاریخِ ہند کا ایک شاہ کار خط ہے جو ان کی لازوال قربانیوں کا مظہر ہے۔ ان کا یہ خط ہفت روزہ الجمعیۃ دہلی میں ان کی شہادت کے بعد میں شائع ہوا تھا :

از زندان فیض آباد

پھانسی کی کوٹھری

۱۵/دسمبر ۱۹۲۷ء

دکھیا اور بوڑھی ماں کی خدمت میں اس کے مرتے ہوئے فرزند کا سلام پہنچے جو اسی ہفتہ میں اس فانی دنیا کو الوداع کہہ کر اس ملک جاودانی کو جائے گا۔

فنا ہے سب کے لئے ہم پر کچھ نہیں موقوف
بقا ہے ایک فقط ذات کبریا کے لئے

آپ بھی بخوبی واقف ہیں اور تعلیم یافتہ ہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ بوڑھی سن رسیدہ دکھیا کے لئے

یہ صدمہ ضرور بڑا ہے کہ ان کا جوان بیٹا نامراد دنیا سے اٹھ جائے اور وہ اس کی نعش پر دو آنسو بھی نہ ڈال سکے یا اس کی مری ہوئی صورت دیکھ سکے۔ مگر یہ تو بتاؤ یہ حکم کس کا ہے؟ کیا دنیا کے کسی انسان کا حکم ہے؟ کیا کوئی مجھے اس کے حکم کے بغیر مار سکتا ہے؟ اس نے روز ازل سے ایسا ہی لکھا تھا کہ اشفاق تجھ کو پھانسی پر مرنا ہے اور جب تو مرے گا تو کوئی تیرے پاس تیرے اعزا و اقربا و احباب میں سے نہ ہوگا۔ پس خداوندی حکم پورا ہو کر رہے گا اور ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ میں یہ لکھ دینا چاہتا ہوں کہ میں بہ اطمینان اور پرسکون موت مر رہا ہوں۔ حکم خدا ایسا ہی تھا اور وہ اٹل ہے اور ہو کر رہے گا۔ موت سب کے لئے ہے اور سب مریں گے۔ دنیاوی تکالیف، مادی بندشیں اور انسانی قیودات سب پیر کے روز ختم ہو جائیں گی اور میری روح قفس عنصری سے آزاد ہو جائے گی۔ اب دوسری منزلیں سامنے ہے دیکھئے وہاں کیسے گزرے۔ یہ اس کی بخشش و کرم پر منحصر ہے۔ سفر درپیش ہے۔ زادِ راہ پاس نہیں۔ بس اسی کے امید کرم پر خوش خوش جا رہا ہوں۔ میں تو آپ سب کو الوداع کہتا ہوا آپ سب کو اور خصوصاً آپ کو بقیہ زندگی میں وقف نوحہ و بکا کر کے اس طرف جا رہا ہوں جہاں سے آیا تھا اور پھر واپس جانے کا وعدہ تھا۔ وعدہ پورا کرنا ہے۔ آپ سب کے سامنے راہ عمل کیا ہے۔ میں نے برا کیا تھا یا اچھا۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میری زندگی کی اتنی برسیں گمراہی، جھوٹ، سیاہ کاری اور گنا ہوں میں گزری، اس کے لئے میرے دوست، میرے عزیز و اقارب، میرے بھائی اور مختصر یہ کہ ہر ہمدرد دعائے مغفرت کرے اور آپ سب لوگ صبر کیجئے ''صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد۔'' مجھے ڈر ہے کہ آپ گھبرا نہ اٹھیں اور یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ جس کی جوان اولاد مر جائے وہ کیسے صبر کرے۔ تو سنئے میری ماں، خدا نے مجھ کو آپ کے شکم سے پیدا کیا تھا۔ میری پیدائش پر خوشیاں منائی گئیں۔ شکرانے ادا کئے گئے، اور قصہ مختصر یہ کہ مجھ کو آنکھوں کا نور، دل کا سرور سمجھا جاتا تھا۔ آپ نے اس صلہ میں خدا کو کیا دیا کہ اس نے آپ کو ایک انسان کی شکل میں اولاد دی۔ آپ سے جو بھی پوچھتا تھا آپ یہی کہتی تھیں کہ خدا کا بندہ ہے، خدا نے دیا ہے، اسی کی امانت ہے اور میں امانت دار ہوں۔ پس اب مالک

اپنے غلام کوطلب کرتا ہے۔امانت رکھانے والا اپنی امانت طلب کرتا ہے۔آپ خیانت نہ کریں، نہ آپ کی چیز تھی نہ آپ سے چھینی گئی۔اتنے دنوں کے واسطے آپ کو دی گئی تھی کہ رکھو، بعد کو ہم واپس لے لیں گے۔ اب واپس لیا جارہا ہوں۔پھر آپ کو کیا حق ہے کہ ردوقدح کریں۔کیا آپ نے ہمیشہ سے یہ سوچا تھا کہ مجھے موت کبھی نہ آئے گی۔ارے تم بھی جانتی تھیں اور مجھے بھی معلوم تھا کہ ہم سب مریں گے۔کوئی آگے کوئی پیچھے۔یا تو مجھ کو رونا پڑتا تمھارے لئے یا تمھیں میرے لئے۔اس کا منشا یہ تھا کہ بوڑھی ماں جوان اولاد کے لئے روئے گی اور بقیہ تین بھائی اپنے چھوٹے بھائی کا ماتم کریں گے۔تو کیا آج اس دنیا میں کوئی اتنی طاقت والا ہے کہ اس خداوندقدوس کے احکام کو پلٹ دے؟ کوئی نہیں۔اپنے خاندان ہی میں کتنی ایسی مائیں ہیں جو بڑھاپے میں جوان اولاد کا داغ کھائے بیٹھی ہیں، اور کتنے ہی ایسے بھائی ہیں جو اپنی آنکھیں اپنے بھائی کے لئے سرخ کر چکے ہیں، اور کتنی ہی بہنیں، بھاوجیں، بھتیجی، بھتیجے، بھانجی، بھانجے ہیں جو اپنے بھائی، دیور، چچا اور ماموں کے لئے سینہ کوبی کر چکے ہیں۔دنیا کا یہی دھندا ہے۔

دنیا نام ہی اس کا ہے۔اگر مرنا نہ ہوتا تو زندگی کا فائدہ ہی کیا تھا۔اگر رات نہ ہوتوں دن میں لذت ہی کیا، اگر غم نہ ہوتو شادی بمنزلہ غم ہیں غرض کہ دنیا معجون مرکب پر جس میں سب ذائقے ہیں۔عیش و مسرت، غم واندوہ آرام وتکلیف، غفلت، بیداری، نیکی، بدی، موت ابدیت، غرض کہ ہر چیز یہاں ملے گی۔پس خوش قسمت ہے وہ جس نے اچھی باتیں قبول کیں اور برائیوں سے پرہیز کیا۔غفلت پر ہوشیاری کو ترجیح دی اور خدا کی یاد میں لگا اور ہوشیار رہا۔اپنے فرائض کی ادائیگی میں نیکی کو قبول کیا اور بدی کو ٹھکرا دیا۔ابدی آرام کی خاطر نفس پر تکلیف برداشت کی اور عبادت میں مصروف رہا۔موت کو پیش نظر رکھا اور زیست ہی میں سامان آخرت جمع کر دیا۔عیش ومسرت میں پڑ کر غفلت نہیں کی اور پیش آنے والے غم واندوہ کا کھٹکا محسوس کرتا رہا۔بس جس نے ان باتوں کو اختیار کیا اور ہر مصیبت وآرام کو من جانب اللہ تصور کیا اور اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کیا، مصائب تکالیف پر صبر کیا اور کہا کہ یہ سب من جانب اللہ ہیں۔''ہر چہ از دست میرسند نیکوست۔'' دوست کا دیا ہوا زہر ہر ہلاہل بھی شہد مصفیٰ خیال کیا اور صبر کیا، شکر کیا۔پس راضی

کرلیا اسے جو کونین کا ملک اور مشرق ومغرب کا رب ہے۔ کیا تم اس کی خواہش مند نہیں ہو کہ خدا تمہارا پیدا کرنے والا ہے اور جس کے سامنے تمہیں جانا ہے تمہیں اپنا دوست کہہ کر پکارے۔ ارے دنیا اس کی متمنی ہے کہ وہ اپنا دوست کہے۔ آج موت کے سامنے بیٹھا ہوا اشفاق کچھ بھی خواہش نہیں رکھتا، مگر ہاں وہ کہہ دے کہ اشفاق میں تجھ سے راضی ہوں اور تو میرا بندہ ہے۔ میں نے بندگی میں قبول کیا۔ وہ کہتا ہے اے ایمان والوں مدد لو صبر اور نماز سے، بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ دوسری جگہ فرماتا ہے، یعنی خوش خبری سنا دو ان صبر کرنے والوں کو کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ بیشک ہم اللہ ہی کے ہیں اور بیشک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ پھر فرماتا ہے، یعنی یہ ہی ہیں جن پر برکات ہیں ان کے رب کی طرف سے اور رحمت ہے۔ یا یہ لوگ ہدایت والے ہیں۔ یہ قول آپ کو جناب باری کے لکھ دئے ہیں۔ اب سمجھنا نہ سمجھنا آپ کا کام ہے۔

آپ کا صبر وشکر آپ کو اس کے دربار میں مقبول ومقرب کرے گا اور خدانخواستہ آپ حد سے بڑھ گئیں تو آپ خود سمجھدار اور پڑھی لکھی ہیں۔ آپ کا نالہ وشیون، آہ وزاری، سینے کوبی مجھ کو زندہ نہیں کرسکتی نہ موت سے بچا سکتی ہے۔ ہاں، صبر کرنا، کلمہ درود پڑھنا اور بخشنا میرے لئے کچھ سودمند ثابت ہو سکتے ہیں۔ پس میری اچھی ماں میری خطائیں معاف فرما کر مشغول بہ خدا ہو جاؤ۔ اس کی مرضی یہی تھی، اور کون ہے جو اس کے حکم کو ٹال سکے۔ آپ کو دکھ پہنچا۔ آپ کا بڑھاپا برباد کیا۔ آپ کی زندگی ضیق میں ہوگئی۔ میں نے کی۔ ہاں ظاہر اسباب میں سے ایک میں بھی ہوں۔ مگر مولا کی مرضی اور اس کا حکم پوشیدہ رہتا ہے۔ سمجھدار من جانب اللہ ہر بات کو سمجھتے ہیں، اور ناسمجھ انسانوں کی طرف خیال دوڑاتے ہیں۔ اس سے قبل ایک کارڈ فیصلے کے متعلق ملا ہوگا، کیسے مزے کی بات ہے کہ میں اپنے قلم سے اپنی موت کی خبر آپ کو بھیج رہا ہوں۔ میں نے ایک کتاب لکھنا شروع کی تھی اور وہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ خیر مالک کی مرضی ہی نہ تھی جس میں میرا مقصد بچوں کے لئے نصیحت کرنا تھا، نیز ان کے لئے جو میدان عمل ہے اور جو سامنے آئے اس پر گامزن ہو۔ مجھے جو لکھنا ہے تھوڑا تھوڑا سب کو لکھ

دوں گا کیوں کہ اب وقت میرے پاس مضمون نگاری وقلم فرسائی کا نہیں ہے۔ مختصر مختصر سب کو لکھ دوں گا۔ سب اپنا اپنا مطلب نکال لیں۔ مجھے تو سب سے ضروری آپ کو لکھنا تھا، اور یوں تو یہ مضمون واحد تصور کیا جائے۔ سبھوں سے صبر کی گزارش ہے، اور صبر ہی خوشی کی کنجی ہے۔ مجھے بوبو کی بھی پریشانیوں کا علم ہے اور آپ سب کی کوفت میں ایسے وقت میں اضافہ غم ہے۔ مگر کیا مولیٰ کی مرضی ٹالی جا سکتی ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ ہر صورت سے آزمائش کر رہا ہے۔ تم صبر کو ہاتھ سے نہ دو، جو دوست کی طرف سے خوشی وغم سے مسکراتے ہوئے چہرے اور مطمئن دل کے ساتھ قبول کرو کہ فلاح دینی و دنیوی حاصل کر سکو میں کوشش کرونگا، یہ خط تم کو میری موت سے پہلے ہی مل جائے تا کہ تمھارے دکھ میں کمی ہو جائے اور تم سوچ سکو کہ مرنے والا، کیا بات ہے کہ مرتے ہوئے بھی مطمئن وخوش ہے۔

آدم علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک کون ایسا ہے جو مرا نہ ہو جس نے بساط عالم پر زندگی کے مہرے بسائے، موت کے ہاتھوں ضرور مات کھایا۔ پس اس کا غم بے کار ہے، اور آنے والی اور ضرورت آنے والی بات کے لئے پریشان ہونا سراسر غلطی ہے۔ اب رہا محبت، ڈاہ، موہ، پریم یہ سب دنیاوی دھندے ہیں۔ خدا سے محبت کرو، اس کو پوجو، جو ہمیشہ زندہ وقائم رہے گا۔ تمہیں اپنی بقیہ زندگی میں کبھی اس کے لئے رونا نہیں پڑے گا۔ بس اسی سے محبت کرو اور اسی کو اپنا سمجھو۔ عقلی دلائل، مذہبی مسائل، فلسفیانہ بحث، دکھے ہوئے دل پر نمک مرچ کا کام کرتے ہیں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ آپ سوچیں گی کہ میں نے اپنے کرتوتوں سے آپ کا بڑھاپا خراب کیا ان بھائیوں اور دیگر اعزاء کی زندگی دکھ کی زندگی بنا دی۔ میں نے کیا کیا؟ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اس کا حکم روز ازل سے ایسا ہی تھا، سو ہو کر رہا۔ جو بات ہونے والی ہوتی ہو اسباب اس کے پیشتر سے ہونا شروع ہوتے ہیں، اور اسباب جب پایہ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں بات پوری ہو جاتی ہیں۔ پس میرے لئے یہ موت اور یہ دن تھا، سو مجھے ملا اور تمھارے لئے دکھ، بڑھاپے کا کا دھکا اور سینہ کوبی لکھی تھی وہ تمہیں مل رہی ہے۔ جو جس کے لئے اس نے مناسب سمجھا وہ اسے تقسیم کر دیا۔ پس کون ہے جو شکوہ کرے اور لب شکایت کے واسطے کھولے۔

ہم رضا کار ہیں ہم پر ہے بہر حال یہ قرض
شکر حق لب پہ رہے ، شکوہ اعدا نہ کریں
مان لیں فیصلۂ دوست کو بے چون و چرا
فکر امروز ہی رکھیں غم فردا نہ کریں

تم سب کو غم اٹھانے کے لئے انتخاب کیا اور مجھے منصور وقت بنانے کے لئے چن لیا۔ اگر تم کو گریۂ یعقوب عطا کیا تو مجھ کو سنّت یوسفی ادا کرنے کے لئے پکارا۔ اگر تم کو ماتم کناں مثل خاندان نبوی بنانا ہی چاہا بنا دیا اور مجھے متبع حسین شہید تیغ جفا کے خطاب سے نوازا۔ اس کی شان نرالی، اس کی ادا انوکھی۔ ہر جگہ نئے رنگ میں، ہر طرف نئے روپ میں جلوہ گر ہے۔ جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہوگا اور ہو رہا ہے اس کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ پس کون ہے جو سرتابی کرے اور کون ہے جو اس کے حکم سے باہر جا سکے۔ پس اسی پر نظر رکھو اور صبر و قرار ہاتھ سے نہ دو۔ شکر کرو اس کی امانت اس کی طرف جا رہی ہے اور صانع اپنے مصنوع کو بگاڑنا چاہتا ہے۔ پھر تم کون رونے والی؟ تم کون تڑپنے والی؟ اس کی چیز تھی اس کا اختیار ہے۔ صبر کرو اور بقیہ زندگی کا بیش بہا وقت میرے لئے رونے میں نہ صرف کرو، بلکی اس سفر کی تیاری میں لگاؤ جو ایک دن درپیش ہے۔ عبادت میں مغفرت ہے۔ گناہوں میں وقت نہ گزارو یہی کام آئے گا۔ غفلت چھوڑو، اس کو پکڑو۔ دنیا فنا ہونے والی ہے، اور تمھارا بھی بڑھاپا ہے۔ اچھا، میری خطائیں معاف کرو اور مجھے اپنے حقوق سے سبک دوش کرو۔ تم کو خدا کی امان میں دیا۔ وہ تمھیں نیک بی بی اور صابرہ بی بی بنائے۔ آمین۔''[۷]

اشفاق اللہ خاں نے اپنے بھائی بھاوجوں کے نام بھی ایک مختصر خط لکھا :

''بھائیو، الفراق بینی وبینکیم۔ تم آپس میں مل جل کر رہنا اور دکھیا بدقسمت ماں کی خدمت میں لگی رہنا، اور بقیہ زندگی کو سکون سے گزارنے کا موقع دینا۔ اگر تم لوگ ایسے ہی آپس

میں شکوہ شکایت کرتے رہے اور شکر رنجی تمھارے درمیان رہی تو کچھ لطف نہیں ۔ شیر وشکر بن کر رہنا اور جدا نہ ہونا۔ میری تو یہی خواہش ہے اور مجھے معافی دینا۔ خدا کی مرضی یہی تھی۔

بھائیو، تم نے انتہائی کوشش کی مگر موت اور خدا کا حکم ٹالے نہیں ٹلتا اور پورا ہو کر رہے گا۔ تم بھی مجبور ہو رہے۔ صبر وشکر کرنا۔ خدا کی مرضی ہی یہ ہے۔ میں بتائے دیتا ہوں کہ میں ایک پرسکون موت مر رہا ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کون خیال مجھے مست وخوش بنائے ہوئے ہے۔ دل اندر سے پھولا چلا آ رہا ہے۔ مجھے قطعی خیال ہی نہیں گذرتا کہ مجھے پھانسی دی جائے گی۔ مریں گے تو سب ہی، کچھ میں ہی نہیں مر رہا ہوں۔ تم خدا پر نظر رکھو اور بجائے رونے دھونے کے میرے لئے ایصال ثواب میں لگے رہنا کہ وہاں کام آئے۔ اب زیادہ کیا لکھوں۔ خدا تم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مجھے گنہگار بندے کو جوار رحمت میں جگہ دے۔''

اشفاق اللہ خاں کے یہ تمام خطوط جو انھوں نے لکھے ہیں ادبی اور تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ جس میں اس محبّ وطن کی طبیعت میں ولولہ، جوش اور عالی ہمتی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ ایک ایک لفظ ان کی قابلیت اور ان کے بہترین مضمون نگار ہونے کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ قرآنی علوم سے ان کی واقفیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور مرد مومن کی جھلک ان کردار میں نظر آتی ہے۔

فقط اشفاق اللہ ۸

اشفاق اللہ خاں کے ان خطوط سے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے کہ وہ نہ صرف ایک دلیر مجاہد تھے، بلکہ ایک بہت ہی ذہین اور قابل انسان بھی تھے۔ جنہیں زبان و بیان پر عبور

حاصل تھا اور وہ ایک منجھے ہوئے مصنف اور شاعر بھی تھے۔ وہ اپنی ماں کو جس طرح صبر کی تلقین کرتے ہیں ایسا معلوم پڑتا ہے کی دنیاوی علوم کے ساتھ ساتھ انہیں قرآنی علوم سے بھی اچھی واقفیت تھی۔ ان کے یہ خطوط ادبی دنیا اور ہندوستانی تاریخ میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

رانی جھانسی رجمنٹ کی ایک سپاہی عورت اپنے ایک خط میں میدان جنگ کا منظر اس طرح پیش کرتی ہے:

''۲۱ر مئی ۱۹۴۴ء

محاذ پر جو کچھ مجھ پر بیتی اس کے متعلق میں نے کچھ بھی نہیں لکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے سر اور ہاتھ میں جو کچھ چوٹیں آئی تھیں وہ اب تک مزاحم حال رہیں۔ وہ دن بڑے ہیجان آور تھے میں ان کو یاد کرنے کی کوشش کرونگی اور میں پہاڑ کی کے دامن کی طرف بڑی تیزی سے قدم بڑھا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام اردگرد کی پہاڑیوں پر ہمارے سپاہی گھنے جنگلوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ہمارے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ جے ہند، آزاد ہند، زندہ باد کے پر زور نعروں سے فضا گونج اٹھی یکا یک مجھے ایک ضرب آنے کا احساس ہوا۔ میرے پاؤں لڑکھڑائے میں گر پڑی اور بیہوش ہوگئی۔ بعد میں جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ مجھے چارپائی پر اٹھا کر محاذ کے پچھلی طرف لے جا رہے تھے۔ لیکن میں نے دانتون کو بند کر رکھا تھا کہ کہیں میری چیخ نہ نکل جائے۔ میرا سر درد کے مارے چکرا رہا تھا۔ لیکن میرے غرور کے سامنے

میرے درد کی کوئی وقعت نہ تھی۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اٹھانے والوں نے مجھے ایسے ہچکولے دئے کہ ایک وقت تو مجھے خیال آیا کہ بڑے بے رحم ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کو مجھے اٹھائے ہوئے ایک مدت گزر چکی۔ تب کہیں جا کر مجھے نیچے اتارا گیا۔ اس جگہ ایک فیلڈ اسپتال تھا جہاں مجھے داخل کر دیا گیا۔ اب تو میرے زخم اچھے ہو گئے ہیں اور میں چل پھر سکتی ہوں۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سنگینوں سے ہمارے حملہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ دشمن نے ہتھیار ڈال دئے۔ گو ہمارے بہت سے آدمی کام آئے لیکن ہم نے ایک بڑی اہم فتح حاصل کی۔ ہم واقعی ہندوستان اور برما کی سرحد پر سبھاش لڑ رہے تھے اور اس روز کی کامیابی سے ہم نے یہ سرحد پار کر لی تھی۔''[۹]

صحافی امداد صابری سبھاش چندر بوس کے رفیقوں میں سے تھے اور ۱۹۴۲ء میں دہلی صوبہ 'فارڈ بلاک' کے صدر تھے۔[۱۰]

انھیں ۱۳/اگست ۱۹۴۲ء میں نیتا جی کو ایک خط پہنچانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اپنے جرم کو قبول نہ کرنے کی پاداش میں پولیس کے ذریعہ ان کی دونوں ٹانگوں کو کچلا گیا تھا اور ان کو اس وقت بالکل معذور کر دیا گیا تھا ان حالات میں ان کی والدہ کے دل پر کیا گزری ہوگی؟ اس بات کا اندازہ کوئی بھی کر سکتا ہے۔ ایسے وقت میں لوگ منتظر رہتے ہیں۔ اس وقت بھی ان کی والدہ ماجدہ کو ڈرایا گیا خوفزدہ کیا گیا اور طرح طرح کے مشورے دئے گئے لیکن انہوں نے کسی مشورہ پر توجہ دی اور نہ خوفزدہ ہوئیں۔ اپنے اللہ سے لو لگائے رہیں۔ امداد صابری کو جب بھی چٹھی لکھی ان کی ہمت بندھانے والے مشورہ دیئے غالباً اسی

زمانہ کی ایک چٹھی ان کے بیٹے کے پاس محفوظ رہ گئی تھی جس میں انھوں نے لکھا ہے:

''بیٹے صابری تم پر اللہ کا کرم ہو

میں روزانہ تمہاری تکلیفوں کے بارے میں سنتی ہوں اور یہ بھی سنا ہے کہ تم اب چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے ہو۔ پریشان مت ہونا اللہ تمہاری ٹانگوں میں پھر طاقت دے گا۔ مسلمانوں پر ایسی پریشانیوں کے مواقع بہت آئے ہیں وہ صابر و شاکر رہے تم بھی صبر کرو اور شاکر ہو کہ تم زندہ ہو اور ملک وقوم وملت کی خدمت کر رہے ہو۔ غلامی کے خلاف جہاد کر رہے ہو۔ تمہارے دادا اور تمہارے والد بھی اسی راہ پر چلے تھے بیٹا اللہ کے ہاں اس کا بڑا اجر ہے گھبرانا نہیں کہیں اپنے ارادوں پر مضبوطی سے قائم رہو۔ گھر میں خیریت ہے گھر کا انتظام اچھی طرح چل رہا ہے ذرہ برابر گھر کی فکر نہ کرنا تمہائے گھر میں سے کہہ رہی ہیں۔ ان کی بھی وہی رائے ہے جو میری رائے ہے۔

تمہاری والدہ اللہ بندی''[۱۱]

یہ تاریخی خطوط مورخین اور محققین کے لئے اصل دستاویز ہیں جن کے ذریعہ ہندوستانی تاریخ کے روپوش واقعات، مجاہدین کی سرگرمیوں اور لاتعداد گمنام مجاہدین آزادی کے کارناموں کو اجا کیا جا سکتا ہے۔ تاریخی اور ادبی دونوں لحاظ سے ان خطوط کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ یہ خطوط تاریخ میں ایک نئے باب کی شروعات ہیں۔ مستقبل کے مورخیں ان جیسے لاتعداد خطوط سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

حواشی :

۱۔محمد الدین فوق، 'بھارت کی دیویاں یعنی محبِّ وطن خواتین ہند'، ظفر برادرس تاجرانِ کتب لاہور، اگست ۱۹۲۱ء، ص۔۳۶

۲۔ایضاً ص۔۴۲۔۴۳

۳۔ایضاً ص۔۴۳

۴۔ایضاً ص۔۴۸

۵۔ایضاً ص۔۹۴

۶۔ایضاً ص۔۹۴ تا ۹۶

۷۔میوارام گیث ستوریا، 'شہید وطن اشفاق اللہ خاں' (بشکریہ ہفت روزہ الجمعیۃ، دہلی، خط عطیہ شری بنارسی داس چترویدی)، 'یادگار اشفاق'، ص۵۳۔۶۰

۸۔ایضاً ص۔۶۰۔۶۱

۹۔امداد صابری، 'سبھاش بابو کے ساتھی' ۱۹۴۶ء، ص۹۸۔۹۹

۱۰۔امداد صابری، 'سیاسی رہنماؤں کی مائیں اور بیویاں'، طباعت ممبران اقراء یونیورسٹی، پبلشر احسان احمد صابری، ۱۹۸۶ء، ص۳۱۷

۱۱۔ایضاً ص۔۳۱۸۔۳۱۹

اردو میں خطوط نگاری کی روایت

انسان کو سماجی حیوان (Social Animal) کہا جاتا ہے، وہ اپنی ضروریات پوری کرنے اور زندگی کو خوش گوار بنانے کے لیے دوسروں سے رابطہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ قریبی لوگوں سے روبرو ہوکر اپنی ضروریات کو پورا اور اپنے ذہن و دل کو ہلکا کر لیتا ہے لیکن دور کے لوگوں سے رابطہ قائم کرنے کے لیے مختلف ذرائع کا سہارا لیتا ہے۔ آج الکٹرانک میڈیا نے تمام دنیا کو ایک خاندان میں تبدیل کر دیا ہے اور ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرنا آسان ہو گیا ہے۔ پرانے زمانے میں رابطہ کا ذریعہ خط ہی تھا۔ لوگ نجی ضروریات کے تحت یا کاروباری معاملات نپٹانے کے لیے خطوط کا سہارا لیا کرتے تھے، خطوط کے ذریعے مختلف اغراض کے تحت رابطہ قائم کیا جاتا ہے۔ وہ ضروریات نجی بھی ہوسکتی ہیں اور غیر نجی بھی۔ اغراض ہی کے پیش نظر خطوط کی مختلف قسمیں وجود میں آئی ہیں جیسے نجی خطوط، کاروباری خطوط اور سرکاری خطوط وغیرہ۔ نجی خطوط بھی مختلف طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو عام لوگوں کے خطوط ہوتے ہیں جن کا مقصد عام طور پر وقت گزاری یا اپنے جذبات واحساسات میں مکتوب الیہ کو شریک کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہ خطوط بڑے ہلکے پھلکے انداز میں لکھے جاتے ہیں۔ اکثر ان خطوط کا دائرۂ اکثر مکتوب نگار اور مکتوب الیہ تک محدود رہتا ہے۔ بعض نجی خطوط ایسے ہوتے ہیں جن کا دائرہ بڑا وسیع ہوتا ہے جو لکھے تو جاتے ہیں کسی مخصوص وقت اور زمانے میں لیکن وہ مکتوب الیہ کے ساتھ ساتھ آنے والی نسلوں کے لیے بھی قیمتی اثاثہ ثابت ہوتے ہیں۔ یہ ادیبوں، دانشوروں، صوفیوں اور سیاسی رہنماؤں کے خطوط ہوتے ہیں جن میں ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جو آنے والی نسلوں کے لیے روشنی کا سرچشمہ ثابت ہوتی ہیں۔ علمی و ادبی سطح پر جب خطوط نگاری کی بات ہوتی ہے تو ان سے عام طور پر یہی خطوط مراد ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ مکتوب نگاری ایک اہم نثری صنف ادب ہے۔ منظوم خطوط بھی ملتے ہیں مگر قافیہ و ردیف اور دوسری

ڈاکٹر عبدالحفیظ، اسسٹنٹ پروفیسر اور ہیڈ انچارج، شعبۂ اردو، سدھارتھ یونیورسٹی، کپلوستو، سدھارتھ نگر

پابندیوں کی وجہ سے ایسے خطوط میں بے تکلفی اور بے ساختہ پن کو باقی رکھنا ممکن نہیں، جو مکتوب نگاری کے لیے لازمی ہے۔ خط مکتوب نگار کی شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں جس میں اس کے اصل خدوخال دیکھے جاسکتے ہیں کیونکہ ان خطوط میں وہ نجی باتیں بھی سامنے آجاتی ہیں جن کے اظہار میں عام طور سے تکلف برتا جاتا ہے۔

خط دراصل عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی لکیر یا سطر کے آتے ہیں رفتہ رفتہ یہ لفظ اردو میں مکتوب نگاری کے لئے استعمال ہونے لگا۔ اس کے علاوہ اسی کا ایک متبادل لفظ ''نامہ'' بھی رائج ہوا۔ خط لکھنے والے کو مکتوب نگار اور جس کو خط لکھا جارہا ہے اسے مکتوب الیہ کہنے لگے۔ یعنی ایک ایسی تحریر جو مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے بیچ وسیلۂ اظہار بنتی ہے، خط یا مکتوب یا نامہ کہلاتی ہے۔ بعض دانشوروں کے نزدیک مکتوب کی تعریف کچھ اس طرح ہے:

شیلے کے خیال میں:

> ''خط عام طور پر مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے بیچ تبادلۂ خیال کا ذریعہ ہے۔''

خورشید الاسلام کے نزدیک:

> خط حسن اتفاق کا نام ہے اور حسن اتفاق ہی سے یہ ادب کی ایک صنف ہے۔ اچھے خط ادبی کارنامے ہوتے ہیں۔...خط چھوٹی چھوٹی باتوں سے بُنے جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں دنیا کا لطف ہے۔''

مولوی عبدالحق کہتے ہیں:

''مکتوب دلی خیالات وجذبات کا روزنامچہ اوراسرارحیات
کاصحیفہ ہے،اس میں وہ صداقت وخلوص ہے جودوسرے کلام
میں نظرنہیں آتا۔''

رشیداحمدصدیقی کے خیال میں:

''خط لکھا نہیں جاتا بلکہ لکھ جاتا ہے اور لکھنے والے کومجبور کرتا
ہے کہ وہ اسے لکھے۔''

عام طور پر خط میں مکتوب الیہ کا نام اور پتا،تحریر کے وقت کی تاریخ،دن ، القاب (جیسے مکرمی،محترمی،سر،عزیزالقدر) آداب (جیسے السلام علیکم،سلام مسنون،تسلیمات،آداب) اگر خط کاروباری یادفتری ہے تو نشان مجاریہ،اگر خط دفتری اورکاروباری ہوتو خط کا موضوع،نفس مضمون (خط کی تحریر،مواد) خاتمہ (ایسی سطر جہاں مکتوب نگارخط کا اختتام کرتا ہے جیسے آپ کا خیراندیش، مخلص،احقر،دعاگو) مکتوب نگار کے دستخط اورمکتوب نگارکا نام اور پتہ وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ خطوط اپنی نوعیت کے اعتبار سے کئی طرح کے ہوسکتے ہیں۔ویسے ادبی خطوط میں وہی خط مراد ہوتے ہیں جونجی اورذاتی قسم کے ہوں۔نوعیت کے اعتبار سے خطوط کی اقسام اس طرح ہوسکتی ہیں:(۱) نجی اورذاتی قسم کے خطوط (۲) دفتری خطوط (۳) کاروباری خطوط (۴) مراسلے (۵) ادبی نوعیت کے خطوط جومشاہیرادب کے ذریعے تحریر ہوئے ہوں۔(۶) ڈیجیٹل خطوط (ای میل،واٹس اپ،ٹویٹر، انسٹاگرام وغیرہ)

خطوط نگاری میں عام طور سے درج ذیل اصولوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے:

i۔ خطوط کے لیے ضروری ہے کہ وہ نجی ہوں۔ان میں موجود اطلاعات اور گفتگومکتوب الیہ تک کے لیے محدود ہوں۔

ii۔ خط انفرادی نوعیت کا ہو، ایسی تحریر نہ ہو جو اجتماع عام کی خاطر ہو، بلکہ ایک ذات سے نکل کر دوسری ذات تک کے لیے وسیلۂ اظہار بنے۔

iii۔ خط میں گفتگو کا انداز غالب ہو، ایسی تحریر نہ ہو جو مضمون، مقالہ، یا کہانی کا شائبہ دے، چوں کہ خط کو ملاقات کے متبادل تصور کیا جاتا ہے لہٰذا اس میں مکالماتی انداز غالب ہونا چاہیے۔

iv۔ خط، اپنے مخاطب کے مرتبے، منصب، ذاتی تعلق یا رشتہ کو ملحوظ رکھ کر تحریر کیا گیا ہو۔

v۔ بے جا تکلفات اور رسمی باتوں سے گریز کیا جائے بلکہ القاب وآداب میں بھی اختصار سے کام لیا جائے۔

vi۔ خط کی تحریر میں موجود باتیں سلیقے سے پیش کی جائیں، تکرار اور حشو وزواید سے گریز کیا جائے۔

vii۔ خط بے جا طوالت پر مشتمل نہ ہو۔ بلکہ اختصار اور جامعیت پر مبنی ہونا چاہیے۔

viii۔ الفاظ اور عبارت کو پیچیدہ نہ بنایا جائے۔ ترسیل خیال اور مطالب کے ادائیگی کی تکمیل ہو لہٰذا ایسی تحریر لکھی جائے جو رواں، آسان، سریع الفہم ہو۔

ix۔ خط واحد متکلم کے صیغہ میں لکھا جائے۔

اردو خطوط میں داخلی کیفیات اور نجی حالات کے بیان کی حیثیت سب سے اہم ہوتی ہے اور اس کے علاوہ ان میں ادبیت بھی ہوتی ہے۔ وہاں اعلیٰ اور ادبی مذاق بھی ہوتا ہے اور زبان و بیان کی لطافت بھی ہوتی ہے۔ وہ موضوع کے اعتبار سے پر تجسس، دلچسپ اور اسرار سے پُر بھی ہوتے ہیں اور اپنے عہد کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ وہ مکتوب نگار کی شخصیت کی کئی پرتیں اور نفسیات کی کئی گرہیں بھی کھولتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ بے حد فطری انداز میں تحریر کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ دراصل خط لکھنا بھی ایک فن ہے اسی لیے اس کی فنی اور ادبی حیثیت ہے۔ اچھے اور عمدہ خطوط شعوری طور پر نہیں تحریر ہوتے کہ ان کو شایع کیا جائے گا بلکہ وہ حسن اتفاق سے وجود میں آتے ہیں اور ذہن یا دل کی باتوں کا مجموعہ بن کر صفحۂ قرطاس پر رقم

ہو جاتے ہیں۔ بقول رشید احمد صدیقی ''خط لکھا نہیں جاتا بلکہ لکھ جاتا ہے۔''

خط کی اہم خصوصیات میں سے ایک اس کا دلچسپ ہونا ہے۔ اس میں ایسے جذبات واحساسات ہوتے ہیں یا ایسی تفصیلات ہوتی ہیں جو اپیل کرتے ہیں۔ ان کی اہمیت وقتی نہیں ہوتی بلکہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت کو بعینہٖ برقرار رکھتے ہیں۔ خطوط غالب اس کا عمدہ نمونہ ہیں۔

خط کی ایک خصوصیت جزئیات نگاری ہے۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو جو تجربے اور مشاہدے میں شامل ہوتی ہیں ایک مکتوب نگار ان تمام کو بڑی عمدگی، سلیقے اور ترتیب سے بیان کرتا ہے۔

خط کی خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ قطعیت پر مبنی ہو۔ یعنی اس کی ترسیل میں کسی نوع کی پیچیدگی نہیں ہونی چاہیے۔ ایک مکتوب نگار اپنے مکتوب الیہ تک جن باتوں کی ترسیل کرنا چاہتا ہے وہ اچھی طرح اس تک پہنچ جائے۔

خط کی ایک خوبی اس کا نجی پن ہے۔ ایک مکتوب نگار خط کے ذریعے مکتوب الیہ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیتا ہے اور اپنے پوشیدہ اسرار کو بھی وہاں بیان کر دیتا ہے۔ کیوں کہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطوط کبھی منظر عام پر نہیں آئیں گے۔

خط کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کا مواد اپنے مکتوب الیہ کے اعتبار سے اپنی نوعیت اور اظہار کی صورتوں کو تبدیل کرتا ہے۔ ایک ادیب جب دوسرے ادیب کو خط لکھتا ہے تو اس کے پیمانے اور مواد کی صورت بالکل الگ ہوتی ہے۔ جب کہ وہی ادیب اپنے کسی بے تکلف دوست یا گھر کے کسی فرد کو خط لکھتا ہے تو اظہار کی سطح اور مواد کی صورت بالکل الگ ہوتی ہے۔

اچھے مکتوب کی ایک خصوصیت اس کے اندر موجود لطافت ہوتی ہے۔ خطوط کا موضوع یا مضمون کچھ بھی ہو مکتوب نگار اسے اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ اس میں ایک خاص قسم کی لطافت

درآتی ہے۔سید عبداللہ نے بالکل درست فرمایا ہے کہ ''خط نگاری خود ادب نہیں مگر اس کو خاص ماحول، خاص مزاج، خاص استعداد اور خاص فضا میسر آجائے تو یہ ادب بن سکتی ہے۔''

خطوط نگاری کے سلسلے میں یہ امر ابھی تک باعث تحقیق ہے کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی اور کہاں ہوئی۔ ہاں یہ بات ضرور طے شدہ ہے کہ یہ صنف رسم تحریر کے بعد ہی وجود میں آئی ہے۔قرین قیاس ہے کہ کاغذ کی ایجاد سے قبل ہی حضرت انسان نے مکتوب نگاری کرنی شروع کر دی تھی۔بعض محققین کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا چار ہزار سال پہلے چین میں ہوئی۔۱۸۸۷ء کی سمرنا کے مقام پر ہوئی کھدائی میں تقریباً تین سو مٹّی کی تختیاں برآمد ہوئی ہیں جن پر فراعنہ کے نام خطوط کندہ ہیں۔بعض کے نزدیک اس کا آغاز ایران کے ایک بادشاہ ''سائروس'' سے ہوتا ہے جو پانچ سو پچاس برس قبل مسیح میں حکومت کرتا تھا۔خطوط نگاری کو روم میں باقاعدہ فن کی حیثیت حاصل ہوئی اور اس کی علمی، تہذیبی، سیاسی وسماجی حیثیت متعین ہوئی۔روم میں الگ الگ صوبہ جات اور مختلف علاقوں کے عہدہ داروں، فوج کے کمانڈروں اور دیگر منتظمین کے مابین خطوط کے ذریعہ پیغام رسانی کا رواج عام تھا۔سسیرو کے مکاتیب اسی سلسلے کی اہم کڑی ہیں جن میں روم کے سماجی اور معاشرتی حالات اور طرز حیات پر بے حد دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ان خطوط میں رومیوں کے مروجہ مکتوب نگاری کے مطابق نیم ادبی اور فصیح اور نیم روزمرہ کی زبان استعمال کی گئی ہے۔ عیسائیوں کے یہاں عیسائیت کی تبلیغ کی تحریک کے فروغ میں خطوط اہم وسیلہ ثابت ہوئے، لہٰذا مذہب اور اس کی تبلیغ نے مکتوب نگاری کے فن پر خاصا اثر ڈالا اور اس کو غیر معمولی فروغ بھی حاصل ہوا۔ساسانی دور کے نوشیرواں عادل کے خطوط ہوں یا حضرت عیسیٰ کے حوارین کے خطوط ہوں، ان تمام کو اسی سلسلے کی خاص کڑی کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ پہلے خط لکھنے کے لیے پیشہ ور کاتب ہوا کرتے تھے جو خط کے تمام لوازمات، اصول وضوابط، زبان وبیان سے واقف ہوتے تھے جنھیں کاتب کہا جاتا تھا۔اسلام کے ظہور میں آنے کے بعد باضابطہ ایک مخصوص عہدے کے طور پر اس کی تقرری کی جانے لگی۔ایسے کاتب کو معاشرے میں اعزاز کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔خود نبی ﷺ نے کھال، کھجور کے پتوں اور مٹی کی الواح پر ایسے خطوط

تحریر کرائے جن کو سیاسی مقصد، ہدایات، دعوت اسلام کی غرض سے مختلف مقامات پر بھیجا جاتا تھا۔ قیصر و کسریٰ کے بادشاہ، مصر، اسکندریہ، عمان، دمشق اور یمن کے بادشاہوں وغیرہ کے نام ان کے خطوط اس حوالے سے قابل ذکر ہیں۔ خلفائے راشدین نے اسی روایت کو آگے بڑھایا۔ خصوصاً حضرت عمر فاروق کے عہد خلافت میں اس کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ انھوں نے باقاعدہ ''دارالانشاء'' کا قیام کیا تھا اور ہر صوبے میں ایک دارالانشاء ہوا کرتا تھا جس کا ہیڈ کوارٹر مدینہ منورہ تھا۔ خلفائے راشدین کے بعد بنوامیہ اور بنوعباس کے عہد میں اس روایت کو مزید استحکام حاصل ہوا۔ بالخصوص خلیفہ مامون رشید نے جب فارسی زبان وادب کے فروغ میں ذاتی طور پر دلچسپی لی تو بعد کے ادوار میں سامانیوں، غزنویوں اور سلجوقیوں نے خط و کتابت کی زبان قصداً فارسی رکھی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ مخطوطات اور فرامین کی زبان فارسی ہی ملتی ہے۔

چندر گپت موریہ کے زمانے میں بھی ڈاک کا نظام بہت بہتر تھا لہٰذا خط و کتابت کا ایک سلسلہ یہاں بھی قائم نظر آتا ہے۔ لیکن اسلامی تمدن میں خطوط نگاری کے فن کو اعتبار حاصل ہوا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ خطوط کے مخطوطات اہم کتب خانوں اور میوزیم میں موجود ہیں۔

مغلیہ عہد میں اکبر کے نورتنوں میں فارسی کے جید عالم ابوالفضل کے مکتوبات بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے خطوط نگاری کو ایک منفرد انداز عطا کیا۔ فارسی کی عالمانہ نثر اور القاب وآداب میں طوالت کے سبب انھیں ادب عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ البتہ اورنگ زیب نے اپنے زمانہ میں اس نوع کے القاب وآداب سے گریز کرتے ہوئے سادہ اور شستہ تحریر لکھنے کی بنیاد ڈالی۔ ''واقعات عالمگیری'' اپنے سادہ طرز تحریر کی عمدہ مثال ہے۔

انگریزی زبان وادب کا مطالعہ کرتے ہوئے پندرہویں صدی سے خطوط نگاری کی

با قاعدہ روایت مِل جاتی ہے۔ پندرہویں اور سولہویں صدی کے بعض رقعات اس امر کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔نشاۃ ثانیہ میں موجود خطوط پر بھی مذہبیات کا عنصر غالب ہے۔سترہویں صدی میں جیمس ہاؤل کو انگلینڈ میں مکتوب نگاری کا نقش اول مانا جاتا ہے البتہ جیمس ہیرنگٹن کو اپنے طرز تحریر اور شگفتہ اسلوب کے سبب مقبولیتِ عام حاصل ہوئی۔اٹھارہویں صدی میں ولیم کاپر نے مکتوب نگاری کو با قاعدہ فن کے طور پر اپنایا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے خطوط میں روزمرّہ کی چھوٹی چھوٹی چیزوں اور باتوں کو جگہ دی اور شاعرانہ انداز میں نثر کو مسحور کن بنا دیا۔ البتہ اہم مکتوب نگاروں میں سسرو اور گرے کے خطوط کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔سسرو نے اپنے خطوط کو واقعتاً مراسلہ سے مکالمہ میں تبدیل کر دیا تو گرے نے اپنے مخصوص دوستوں کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔اس کے خطوط بے حد نفیس انداز میں انسانیت کا پیغام دیتے ہیں۔رومانوی عہد میں بھی مکتوب نگاری کو غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی۔چارلس لیمپ کے خطوط محبت سے پُر جذبات اور شہری زندگی کی تنہائی کا عکاس ہیں اور اپنے منفرد اسلوب کے سبب ایک نئی شناخت حاصل کر لیتے ہیں تو کیٹس ،شیلی اور بائرن کے خطوط میں انفرادی تجربہ اور احساسات کے مختلف رنگ نظر آتے ہیں ۔کیٹس کے خطوط میں جذبے واحساس کی شدت کو محسوس کیا جاسکتا ہے تو شیلی کے یہاں پیکر تراشی ومنظر نگاری اور کائنات کے جلوے موجود ہوتے ہیں۔ برونس کے خطوط اس لئے متوجہ کرتے ہیں کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے نام لکھے گئے ہیں۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کے ادب میں مکتوب نگاری کے فن کی ایک مستحکم حیثیت اور روایت رہی ہے اور وہ ہر دور میں ترقی کی نئی منزلیں طے کرتی رہی ہے۔

اردو مکتوب نگاری کا با قاعدہ آغاز انیسویں صدی سے ہوتا ہے۔دراصل ہندوستان میں جب فارسی زبان کا سرکاری حیثیت سے زوال ہوا تو اس کی جگہ اردو نے لے لی۔مگر اس دور کے خطوط میں جس نوع کی اردو زبان ملتی ہے اس میں عربی اور فارسی اثرات کے گہرے نقوش نظر آتے ہیں۔اصطلاحیں ہوں یا محاورے،الفاظ ہوں یا تراکیب غرض سب کی کثرت وہاں موجود ہے۔رفتہ رفتہ اردو نے اس کے اثر سے

آزاد ہونا شروع کیا اور اپنی ایک مستقل اور مستند حیثیت حاصل کر لی۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق اردو کے اولین خطوط میں اردو کا پہلا خط جاہ بہادر کرناٹک کے بیٹے نواب حسام الدین بہادر نے ۶ر دسمبر ۱۸۲۲ء کو اپنی بڑی بھابھی نواب بیگم صاحب کے نام لکھا تھا۔ دیگر کلاسیکی اصناف سخن کی طرح مکتوب نگاری کے نقوش اولیں بھی دکن میں ملتے ہیں لیکن اس صنف کو بھی دیگر شعری اصناف کی طرح شمالی ہند میں ہی اعتبار حاصل ہوا۔ خواجہ احمد فاروقی کے مطابق رجب علی بیگ سرور کے یہاں باقاعدگی سے اردو خطوط لکھنے کا رواج ملتا ہے۔ انھوں نے ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء کے درمیان اردو خطوط لکھنے شروع کر دیے تھے۔ سرور کے خطوط میں ان کا عہد جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ تہذیبی و معاشرتی جھلکیاں، سیاسی صورت حال اور سماجی اندراجات ان کے مکاتیب کا خاصّہ ہیں جن سے اُس زمانے کا پورا منظر نامہ سامنے آتا ہے۔ ''انشائے سرور'' سرور کے مکاتیب کا مجموعہ ہے جسے منشی نول کشور کی ہدایت پر مرزا احمد علی نے بڑی عمدگی سے ترتیب دیا۔

واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے رقعات اور پیغامات بھی تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔ ان خطوط سے محققین ادب کو بڑی قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ واجد علی شاہ کے خطوط اپنی بیگمات کے فراق میں جذبات کی شدت اور اضطراب کی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان خطوط میں قید اور جلاوطنی کے لمحات بھی قید ہیں۔ انگریزوں کے ہاتھوں کلکتہ مٹیا برج میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے ان کی دردناک صورت حال اور بے چینی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ تنہائی کی اسی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہوئے شیدا بیگم کے ایک خط کی یہ سطور ملاحظہ کریں:

> ''حکایت فراق اور قصۂ اشتیاق سن کر دل مضطر سخت گھبرایا، کلیجہ منہ کو آیا۔ ہمارا حال اگر سنو ساری کہانی اپنی بھول جاؤ۔ جامع المتفرقین اس دوری کو دور کر کے شادی وصل سے مسرور کرے۔''

(نورالحسن ہاشمی۔خطوط واجدعلی شاہ،ص۱۶۳)

بیگمات کی جانب سے بھیجے گئے خطوط میں بھی جدائی کی تڑپ اوروصال کی آرزو نظر آتی ہے۔ نواب نور جہاں بیگم کے ایک خط کی تحریر سے ان کی محبت،فراق کی بے چینی اور جذباتی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ سطر دیکھیے :

''اورسنوصاحب جس وقت سے تمہاری تصویر آئی ہے ہردم اپنے پاس رکھتے ہیں اورشب کو اپنے پاس لے کرسوتے ہیں...اورحال تمہاری تصویر کا یہ ہے کہ کلام تو کرتی نہیں لیکن نگاہ محبت سے ہرگھڑی ہم کودیکھتی ہے۔''

(تاریخ نورقعہ، ص۴)

غالب سے قبل مکتوب نگاری کے باب میں ایک اہم نام خواجہ غلام غوث بے خبر کا ہے جنھوں نے اس صنف کواردو میں فنی اعتباراور معیارعطا کیا۔تقریباً۱۸۴۶ء کے خطوط اب تحقیق کے ذریعے منظرعام پرآچکے ہیں۔ان خطوط میں بلا کی تخلیقیت نظرآتی ہے۔وہ عربی وفارسی کے بلند پایہ عالم تھے۔ عمر میں غالب سے چھوٹے تھے مگر پھر بھی غالب عزت وتکریم سے اپنے خطوط میں انھیں قبلہ اورمولانا لکھ کرخطاب کرتے تھے۔بے خبر کے خطوط کا مجموعہ۱۸۹۱ء میں''فغان بے خبر'' کے نام سے شائع ہوا جن میں تنوع اور رنگارنگی نظرآتی ہے۔ان خطوط کو غالب اورفورٹ ولیم کالج کے نثر کی درمیانی کڑی قراردیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ان کا انداز بیان سادہ اورروا ں ہے اورزبان صاف وشفاف ہے۔البتہ فارسیت کا اثر بھی قائم رہتا ہے۔تشبیہات واستعارات اورلفظی بازیگری سے یہ خطوط بھی خالی نہیں ہیں مگران میں وہ تعقیداورپیچیدگی نہیں ہے جواس وقت کے شمالی ہند کے مقفیٰ اور مسجع نثر کا خاصہ تھی۔ان کے یہاں غالب کی ہی طرح مکالماتی اورڈرامائی کیفیت بھی دیکھنے کوملتی ہے۔جیسے بے خبر کے خطوط کے یہ دو جملے دیکھیے :

۱۔ ''خیر یہ باتیں جانے دیجیے۔سوئیاں منگوایئے یا اسے بھی افطار کی طرح ٹالیے گا۔''

۲۔ ''اجی حضرت عید ملنے آیا ہوں اٹھیے اور چلیے۔''(انشائے بے خبر)

اردو نثر کی تاریخ مرزا اسداللہ خاں غالب کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ ان کے خطوط اردو نثر کو ترقی دینے اور اسے انفرادیت عطا کرنے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔غالب سے قبل اردو نثر مقفیٰ اور مسجع نثر کے دائروں میں قید تھی۔غالب نے اسے ایک نئی پرواز عطا کی۔میر امن کی باغ و بہار، مرزا غالب کے اردو خطوط اور سرسید کی آثار الصنادید اور مضامین کی نثر کو ایک سلسلے اور جدید نثر کی روایت کے طور پر دیکھا جائے تو غلط نہ ہوگا۔غالب نے سینکڑوں کی تعداد میں خطوط لکھے۔شاعری کی طرح نثر میں بھی طرز ادا اور جدت بیان کے ذریعے غالب کی عظمت قائم ہوتی ہے۔یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنادیا۔جدید تحقیق کے مطابق غالب کی اردو مکتوب نگاری کا آغاز ۱۸۴۶ء کے آس پاس ہوتا ہے۔ غالب کے خطوط کے دو بنیادی مجموعے ''عود ہندی'' اور ''اردوے معلیٰ'' ہیں۔اس کے علاوہ بعد کی دریافتوں سے ایک بڑی تعداد خطوط کی برآمد ہوئی۔خلیق انجم نے تمام خطوط کو یکجا کر کے چار ضخیم جلدوں میں ان کو شائع کیا۔ان خطوط کی تعداد تقریباً نو سو تک پہنچتی ہے۔احباب اور رفقا کی ایک بڑی تعداد تھی جو دور دراز کے علاقوں میں رہتی تھی ان میں کتنے غالب کے شاگرد بھی تھے جو خطوط کے ذریعے اصلاح بھی لیتے تھے اور بہت سے علمی و ادبی مباحث پر ان کی رائے حاصل کرتے تھے۔۱۸۵۷ء کے ہنگامی حالات میں غالب کی تنہائی کے ایّام میں یہ خطوط آب حیات کا درجہ رکھتے تھے۔وہ خود لکھتے ہیں کہ:''میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں، جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص آیا۔'' خطوطِ غالب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قدیم نوعیت کی عبارت آرائی یعنی مقفیٰ اور مسجع عبارت کو بالکل ترک کر دیا گیا۔دقیق اور پیچیدہ الفاظ، غیر ضروری تشبیہات اور تراکیب سے احتراز کیا گیا ہے۔غالب نے اپنے مطالب اور مدعا کو سادہ اور عام فہم انداز میں بیان کیا۔عبارت کو پر تکلف اور رنگین بنانے

کے بجائے مدعا پر زور صرف کیا۔ غالب کی ہی دین ہے کہ اردو نثر میں جذبے، احساس اور کیفیت کی ادائیگی بلاتکلف بیان ہونا شروع ہوئی۔ انھوں نے اپنے خطوط میں طویل القاب وآداب کو ترک کیا۔ اکثر خطوط میں سیدھے مدعا کا اظہار کرتے یا بے حد اختصار سے کام لیتے۔ ان کے خطوط کا ایک بڑا وصف یہ تھا کہ انھوں نے تحریر کو گفتگو کا انداز بخشا اور نثر کو بے تکلف بنا دیا۔ خود ان کا بیان اس کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ خطوط کی تحریر اور قرأت کو وہ گفتگو کرنا کہتے تھے۔

غالبؔ کے خطوط کی ایک خصوصیت شوخی اور ظرافت بھی ہے۔ ان کے خطوط اس خصوصیت کے سبب بے انتہا دلچسپ اور پر کشش ہو جاتے ہیں۔ انتہائی درد وغم اور پریشانیوں میں گھرے ہونے کے باوجود وہ مزاح اور شوخی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ دوسروں کے ساتھ بھی ہنسنے کا فن ان کو بخوبی آتا تھا۔ ان کے خطوط بھی اس کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ایک خط میں چھت ٹپکنے کا ذکر کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

> ''دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں
> ڈرتا، فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں چھت چھلنی ہوگئی ہے،
> ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔''

غالب کے خطوط میں ان کی روداد حیات، شخصیت کے مختلف گوشے اور ذاتی زندگی کے نشیب وفراز، غرض پوری زندگی کھنگالا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نثار احمد فاروقی نے خطوطِ غالب کو تاریخی ترتیب کے ساتھ جمع کر کے ''غالب کی آپ بیتی'' ترتیب دی ہے۔ خطوطِ غالب میں ولادت، آبا واجداد، تعلیم وتربیت، مختلف شہروں جیسے آگرہ، دہلی، کلکتہ کا قیام، ادبی معرکے، سفر جیسے کلکتہ، رام پور، لکھنؤ پنشن کی تفصیل اور اس کے حصول کی جدوجہد، شادی، اولاد، ازدواجی زندگی، شراب نوشی، عشق ومحبت، قید کے حالات، غذا اور خوراک، ۱۸۵۷ء کے حالات، گوشہ نشینی اور تنہائی کی صعوبتیں، کرائے کے مکان، علالت،

بڑھاپا، یہاں تک کہ مرنے کی تاریخ غرض سب کچھ ملتا ہے۔اس اعتبار سے ان کی نجی اور ذاتی زندگی کے تمام اہم گوشوں کو یہ خطوط عیاں کر دیتے ہیں۔

خطوطِ غالب کی اپنی عصری اور تہذیبی اور سیاسی وسماجی اہمیت بھی ہے۔ان میں ایک پورا عہد جیتا جاگتا نظر آتا ہے بلکہ ان سے پورے عہد کی تاریخ رقم کی جاسکتی ہے۔۱۸۵۷ء سے پہلے کے حالات ہوں یا اس کے بعد کی دہلی کی تصویر ہو، یہ خطوط اس کے اظہار کا واحد ذریعہ ہیں۔ایسے سینکڑوں خطوط مل جائیں گے جن میں دلی کے احوال اس انداز میں موجود ہیں جن کو تاریخی اعتبار سے سند حاصل ہو چکی ہے۔دلی کی تباہی کی صورت ان کے خط سے ظاہر ہوتی ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''بھائی کیا پوچھتے ہو۔کیا لکھوں۔ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع، بازار، مسجد جامع کا ،ہر ہفتہ ،سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔یہ پانچوں باتیں اب نہیں پھر کہو دلی کہاں، ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔''

مجموعی طور پر خطوطِ غالب زبان ،اسلوب بیان اور اپنے موضوعات کے اعتبار سے اردو خطوط کی روایت میں سب سے اعلیٰ پائے کا نمونہ ہیں اور اس روایت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اردو خطوط نگاری میں سرسید احمد خاں کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔سرسید کا عہد تاریخی، سیاسی، سماجی اور علمی اعتبار سے کشمکش کا شکار تھا۔ نئے میلانات اور نوآبادیاتی نظام سامنے تھا۔جدید دور کی ترقیاں اور جدید علوم کا سلسلہ قائم ہو رہا تھا اور فرسودہ روایتوں کا زوال ہو رہا تھا۔

سرسید کے خطوط میں اسی کشمکش کی عکاسی کرتے ہیں اور سرسید جدید میلانات اور عصری تقاضوں کے تحت جس انداز میں لائحہ عمل تیار کرتے اور جدوجہد کرتے ہیں اس کے اشارے ان کے مکاتیب میں بھی نظر آتے ہیں۔ان کے خطوط ان کی بامقصد زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ان میں سرسید کی نجی زندگی کے سلسلے میں معلومات کم ہی حاصل ہوتی ہیں مگر اس عہد کی اجتماعی صورت حال کو سمجھا جاسکتا ہے۔ان کے بہت سے خطوط سے ان کی فکری اور عملی زندگی کی پرتیں وا ہوتی ہیں۔ایک خط میں وہ محسن الملک کو لوگوں کی مخالفت کے حوالے سے اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ''لوگ اخباروں میں مجھے برا بھلا کہتے ہیں اس لیے آپ کو غصہ آ گیا...میں ہدف تیرہائے ملامت ہوگیا ہوں اور روز بروز ہوتا جاؤں گا۔شاید میرے بعد کوئی زمانہ آوے گا جب لوگ میری دل سوزی کی قدر کریں گے۔''

اس خط میں قوم کی حالت، اپنی جدوجہد، قوم کے تئیں نیک نیت اور خلوص اور صبر وتحمل، دور اندیشی، فہم وفراست اور بعد کی نسلوں سے ایک اچھی امید اور توقع کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

اردو کے بلند پایہ ادیب خواجہ الطاف حسین حالی کے خطوط کے دو مجموعے ''مکتوباتِ حالی'' کے نام سے پانی پت پریس سے ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئے جو بعد میں ضائع ہوگئے۔اس کے بعد مولوی اسماعیل پانی پتی نے ''مکاتیب حالی'' کے نام سے ان کے خطوط یکجا کر کے شائع کرائے۔ان کے خطوط میں بھی اس عہد کی طرز معاشرت اور تہذیب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ان کا انداز بیان بے حد سادہ، عام فہم ہے۔بعض خطوط تو مشرقی تہذیب، مشترکہ خاندانی تصور اور اس دور کے انسان کی عمدہ خصلتوں کا اظہار کرتے ہیں جہاں دلسوزی، محبت، چھوٹوں سے شفقت، بڑوں کا احترام، خلوص، اپنائیت، ایک نوع کا انکسار، مہذب گفتگو، دلنشیں انداز جگہ جگہ جھلکتا نظر آتا ہے۔ مجموعی طور پر ان کے خطوط اخلاقی اور انسانی قدروں کی

ترجمانی کرتے ہیں جن میں معصومیت، اپنائیت دردمندی اور خلوص بدرجۂ اتم موجود ہوتا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کے خطوط میں حالی کے مقابلے زیادہ تنوع نظر آتا ہے۔ان کے خطوط میں نصیحت ،مشورے،مزاح، لطافت اور رومان غرض سب کچھ جھلکتا ہے۔ یہ تمام باتیں ان کے مزاج کا خاصہ اوران کی شخصیت کا حصہ ہیں جن کا اظہار الگ الگ صورتوں میں ان کے خطوط میں ہوتا ہے جس سے ان کی شخصیت کو سمجھنے کا بھی موقع ملتا ہے۔ان کے خطوط سے ان کی علمی وادبی سرگرمیوں اورعملی کارگزاریوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔شبلی بیک وقت بلند پایہ عالم، فارسی اوراردو کے شاعر، سوانح نگار،مورخ، ناقداورمحقق تھے۔ وضع داری، اصول پسندی، قناعت، بے باکی ان کی شخصیت کانمایاں حصہ تھیں۔ان کے خطوط میں یہ خوبیاں جھلکتی ہیں۔محسن الملک ،حالی،حبیب الرحمٰن خاں شروانی وغیرہ کے علاوہ عطیہ بیگم اوزہرہ بیگم جیسی خواتین شبلی کی مکتوب الیہ رہیں۔ان کو لکھے گئے خطوط سے اس عہد کے معاشرے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔شبلی نے عورتوں کے حقوق کی حمایت کی اوران کوتعلیم یافتہ بنانے کی وکالت کرتے رہے۔تعلیم نسواں کی حمایت جس پُرزوراندازمیں انھوں نے کی، ان کے خطوط بھی اس کی وکالت کرتے ہیں۔مولوی عبدالحق نے شبلی کے خطوط کوایک دنیوی نعمت قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''یہ تکلف اور بناوٹ سے بَری ہیں۔ بے ریائی اوران خیالات کےنقوش ہیں جو بے ساختہ قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ بے ریائی اورخلوص کی سچی تصویریں ہیں جن کے ادا کرنے میں ادنیٰ تکلفات اورانشاء پردازی کے داؤ پیچوں سے مطلق کام نہیں لیا گیا ہے۔''

وقارالملک، حبیب الرحمٰن خاں شروانی اورمولوی عبدالحق وغیرہ کے خطوط بھی اس

اعتبار سے بے حد اہمیت کے حامل ہیں کہ ان میں قومی، مذہبی، علمی، اصلاحی اور بین الاقوامی مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان خطوط سے اس عہد کی سماجی اور معاشرتی کیفیت اور صورت حال کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مہدی افادی کے خطوط کی نوعیت اس اعتبار سے قدرے مختلف ہے کہ ان کے خطوط زیادہ تر علمی سرگرمیوں اور علمی مباحث سے سروکار رکھتے ہیں۔ جہاں کتابوں پر تبصرے علمی اور ادبی سرگرمیوں کا جائزہ اور اپنے رفقا اور احباب کو ہدایتیں ہوتی ہیں۔ ''مکاتیب مہدی'' ایسے خطوط کا عمدہ نمونہ ہیں البتہ ان کے خطوط کا دوسرا مجموعہ صحیفۂ محبت (۱۹۶۴ء) نجی، خانگی اور ازدواجی زندگی سے متعلق خطوط پر مشتمل ہے جہاں ایک ہمدم، رفیق، عاشق، شفیق والد اور محبت سے لبریز شوہر کے مختلف شیڈس نظر آتے ہیں۔ امیر مینائی کے خطوط مقفیٰ اور مسجع عبارت کے لیے مقبول ہیں تو ریاض خیرآبادی نے برمحل انداز اپنایا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے خطوط میں فصاحت و بلاغت اور بلا کی روانی موجود ہے۔ اور ان کے خطوط میں اخلاقی قدروں اور انسانی رویّوں کا اظہار بھی کثرت سے کیا گیا ہے اس کے علاوہ زبان کی شگفتگی اور کشش ان کے خطوط کا خاصہ ہے۔

علامہ اقبال جتنے عظیم شاعر ہیں اتنے ہی بلند پایہ نثر نگار بھی ہیں۔ ان کے نثری سرمایے میں خطوط ایک گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے خطوط کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ یہ اقبال کے افکار و تصورات کی نمائندگی بھی کرتے ہیں جن میں سیاسی، سماجی، تہذیبی، تاریخی اور علمی و ادبی موضوعات موجود ہیں جبکہ دوسری طرف بہت سے خطوط ایسے بھی ہیں جو ان کی نجی اور خانگی زندگی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ذاتی زندگی پر مشتمل مکاتیب بالخصوص عطیہ فیضی کو لکھے گئے خطوط میں ان کی شخصیت کی مختلف تہیں سامنے آتی ہیں۔ جہاں درد و غم میں ڈوبا، قنوطیت کا شکار، ایک حسرت کا مارا ہوا، ٹوٹا ہوا انسان نظر آتا ہے جس کو ہمدردی اور حوصلہ کی ضرورت ہے۔ جبکہ دیگر علمی، ادبی، سیاسی شخصیات اور سماجی ہستیوں کو لکھے گئے خطوط میں معلومات کا ایک سمندر موجزن ہے۔ جن میں علم و ادب، جغرافیہ، سیاسی امور، اہم رجحانات، تحریکات، میلانات، فلسفیانہ تصورات و افکار، تہذیب و ثقافت سے متعلق دیگر تفصیلات موجود ہیں۔ علامہ

اقبال کے ایک درجن سے زائد مکاتیب کے مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔

سید سلیمان ندوی کی شخصیت بھی بے حد متنوع رہی ہے وہ بیک وقت سیرت نگار، عالم دین، صحافی، مورخ، ماہر تعلیم، شاعر اور سیاست داں تھے۔ ان کی شخصیت کے ان تمام عناصر کی ترجمانی ان کے خطوط بھی کرتے ہیں۔ ان کے خطوط کے تین مجموعے، بریدِ فرنگ، مکاتیب سلیمان اور مکتوبات سلیمانی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ مکتوبات سلیمانی میں موجود خطوط ملک کی سیاسی اور بین الاقوامی سطح کے مسائل سے متعلق ہیں جن میں گاندھی جی کے قتل پر لکھا ہوا درد سے ڈوبا ہوا خط بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جبکہ بریدِ فرنگ میں وہ خطوط ہیں جو انھوں نے ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے سفر میں یورپ سے اپنے رفقا اور متعلقین کو تحریر کیے تھے۔ یہ خطوط ایک اعتبار سے مولانا کی سیاسی اور علمی سرگرمیوں کی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بیسویں صدی کی اہم شخصیات میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اردو خطوط نگاری کے باب میں غالب کے بعد مولانا کے خطوط کو بے پناہ مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔ مولانا کی شخصیت بھی بے حد متنوع رہی۔ وہ مجاہد آزادی، عظیم سیاست داں، جید عالم دین، بہترین صحافی اور اردو کے بلند پایہ انشا پرداز تھے۔ انھوں نے واقعتاً ایک تاریخ رقم کی اور ہندوستان کی تاریخ رقم کرنے میں اہم کردار بھی ادا کیا۔ ایک نیا سیاسی منظر نامہ ان کے ذریعے وجود میں آیا۔ ان کے خطوط کے کئی مجموعے جیسے کاروانِ خیال، غبارِ خاطر، نقش آزاد، مکاتیبِ ابوالکلام آزاد، تبرکاتِ آزاد وغیرہ منظر عام پر آئے۔ لیکن ان سب میں غبارِ خاطر کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ مجموعہ قلعہ احمد نگر میں ان کی نظر بندی کے دوران لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ خطوط نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھے گئے ہیں۔ مکتوب الیہ سے مکتوب نگار کا ذہنی ارتباط، علمی صلاحیت، ادب کا اعلیٰ ذوق، فارسی اور عربی زبان دانی، فصاحت و بلاغت، شعری مذاق، فلسفیانہ ادراک غرض تمام خصائص جو مولانا کے اعلیٰ معیار کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ اسی سبب خطوط

کا حصّہ بنے ہیں کہ مکتوب الیہ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے مرتبہ اور اعلیٰ پائے کا عالم اور ادبی ذوق رکھنے والا کوئی دوسرا آزاد کو ان کے سوا نظر بھی نہیں آتا۔ لہٰذا اسی سطح پر آ کر مولانا مکتوب الیہ کو ایسی انشا پردازی کے نمونے خطوط میں پیش کیے ہیں۔

غبارِ خاطر میں تاریخی معلومات کے علاوہ مولانا کی وہ شخصیت نظر آتی ہے جو وہ عوام الناس کے سامنے خود کو نظر آتے ہیں۔ وہی انا پسندی، علمیت، مہذب اور سنجیدہ، بارعب صورت، فلسفیانہ انداز خطوط میں بھی موجود رہتی ہے۔ وہ چائے کا ذکر بھی آب حیات کی طرح کرتے ہیں۔ اور چائے کی پوری تاریخ بیان کر دیتے ہیں۔ صلیبی جنگ، جنگ آزادی کی جدوجہد، قید کی تکالیف، ادبی اور سیاسی امور وغیرہ سب کچھ ان کے خطوط کا حصہ ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے یہ خطوط، تاریخ، زبان وادب، سیاست اور معاشرت، تہذیب وثقافت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ البتہ شعوری طور پر لکھے گئے ان خطوط میں مولانا کی ذاتی زندگی کے نشیب وفراز اور بشری کمزوریاں نظر نہیں آتی جن کی توقع قاری کو رہتی ہے۔ اپنی اہلیہ کی وفات کے بعد لکھا واحد خط درد وغم اور جذباتی کیفیت میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس خاص موقع پر مولانا پہلی بار ایک عام انسان کی صورت میں سامنے آتے ہیں اور اپنا دل کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ چائے سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ان کے ایک خط کی چند سطور ملاحظہ ہوں:

> ''چائے چین کی پیداوار ہے۔ اور چینیوں کی تصریح کے مطابق پندرہ سو برس سے استعمال کی جارہی ہے۔ لیکن وہاں کبھی کسی کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہیں گزری کہ اس جوہر لطیف کو دودھ کی کثافت سے آلودہ کیا جاسکتا ہے۔ جن جن ملکوں میں چین سے براہ راست گئی مثلاً روس، ترکستان، ایران وہاں بھی کسی کو خیال نہیں گزرا، مگر سترہویں صدی میں جب انگریز اس سے آشنا ہوئے تو

نہیں معلوم ان لوگوں کو کیا سوجھی ،انھوں نے دودھ ملانے کی
بدعت ایجاد کی۔''

بابائے اردو مولوی عبدالحق کو صاحب طرز ادیب ،خاکہ نگار اور محقق کے طور پر استناد حاصل ہے۔ ان کی پوری زندگی اردو کی اشاعت اور فروغ میں گزری۔ ان کے خطوط کے آٹھ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ یہ خطوط زیادہ تر اردو زبان ،اردو تہذیب اور علمی و ادبی سرگرمیوں سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ اورنگ آباد کے تعلق سے محبت والفت ،موسم ،آب وہوا، طرز معاشرت اور علمی و ادبی فضا کا تذکرہ بھی ان کے خطوط کا اہم حصہ ہیں۔

رشید احمد صدیقی اردو کے عظیم طنز و مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریر میں جو شگفتگی اور فنی ہنرمندی ہے اس کا مشتاق احمد یوسفی کے علاوہ کوئی دوسرا ثانی نہیں ہے۔ ان کی تمام تحریریں فکری اور تہذیبی سطح سے معمور ہیں جہاں مزاح کے اندر ایک نوع کی سنجیدگی ہمیں غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ علی گڑھ ان کا خاص موضوع تھا۔ علی گڑھ تہذیب کا ہر مقام پر تذکرہ ان کی علی گڑھ سے محبت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ رشید احمد صدیقی کے خطوط بھی ان کی تحریروں کی طرح تہذیب اور طرز معاشرت کا عمدہ نمونہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ آل احمد سرور، احتشام حسین، ذاکر حسین ،فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض ،صفیہ اختر ،علی سردار جعفری وغیرہ مشاہیر ادب کے خطوط بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ جن میں ایک جیتا جاگتا عہد نظر آتا ہے اور یہ خطوط بعد کے محققین اور ناقدین ،اسکالرس اور مورخین کے لیے بنیادی حوالہ بنے اور مستند ہیں۔ اور ان مذکورہ ادیبوں کے خطوط ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں ،نمایاں خصوصیات اور ذاتی زندگی کے مختلف حوالوں کو اجاگر کرنے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

حسرت موہانی خطوط کے آئینے میں

اردو ادب میں مولانا حسرت موہانی مشہور سیاسی رہنما اور ایک ممتاز شاعر کی حیثیت سے متعارف ہیں۔آپ کا شمار نہایت پر گو شعرا میں ہوتا ہے۔تحریک آزادی میں جوش وخروش سے حصہ لیا اور گرفتار بھی ہوئے۔قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود شعر و شاعری کا سلسلہ جاری رہا۔شعر و شاعری کے ساتھ مکتوبات لکھنا بھی ان کا مشغلہ رہا۔سودیشی تحریک سے بھی وابستہ رہے۔سودیشی چیزوں کی فروخت کے لیے ایک دوکان بھی شروع کی۔حسرت موہانی کو سیاست سے کافی لگاؤ تھا۔حسرت نے تحریک آزادی کو اپنا مقصد حیات بنایا تھا۔۱۹۰۸ء میں مصر کے مشہور لیڈر مصطفیٰ کامل کی موت پر اردوئے معلیٰ میں ایک گمنام مضمون شائع ہوا جس میں مصر میں انگریزوں کی حکمت عملی پر سخت تنقید کی گئی تھی۔اس پر گورنمنٹ کی طرف سے مقدمہ چلا اور دو سال کی قید ہوئی۔ یہ ہندوستان کا پہلا سیاسی مقدمہ تھا جو ایک سول کورٹ میں چلا اور دو سال کی قید ہوئی۔مندرجہ ذیل اقتباس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے:۔

> ''۱۹۰۸ء میں اس رسالہ کے (اردوے معلیٰ) میں ایک مضمون 'مصر میں انگریزوں کی حکمت عملی' پر شائع ہوا۔جس پر حکومت نے مقدمہ چلایا۔اور ان کو قید بامشقت کی سزا ہوئی۔''[۱]

قید خانہ کے مشاہدات اور تجربات کو حسرت نے مشہدات زنداں میں قلمبند کیا ہے۔اس ضمن میں آپ کا ایک شعر قید خانہ میں لکھا جو بے حد متاثر ہوئے ؎

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
یک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبعیت بھی

قید فرنگ سے ان کے سیاسی خیالات میں شدت پیدا ہوئی۔ملک کی تاریخ آزادی میں یہ شرف حسرت کو حاصل ہے۔کہ انھوں نے مکمل آزادی کی آواز اس وقت بلند کی جب مہاتما گاندھی جیسے رہنما بھی

ڈاکٹر فرح ہاشم، گیسٹ فیکلٹی، شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، پریاگ راج

اس کو قبل از وقت خیال کرتے تھے۔ چکی کی مشقت کے ساتھ آپ کا مشق سخن اور خطوط کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس دوران آپ نے اپنی شریک حیات نشاط النساء کے نام خطوط لکھے۔ ان خطوط کے مطالعے سے حسرت کی سیاسی، نجی اور ادبی زندگی کے متعلق کافی معلومات فراہم ہوئی۔

اردو اصناف ادب میں مکتوب نگاری اہم صنف مانی جاتی ہے۔ جو اپنے اندر کئی اصناف کو جذب کئے ہوئے ہے۔ خطوط جو ادبیات کا اہم جزو ہے۔ ہر معیار اور مذاق کے لوگ اپنی اپنی علمی و فکری استعداد کے تحت لا تعداد خطوط لکھتے ہیں۔ خاص طور پر ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کے خطوط میں ادبی لطافتوں فکر و خیال کی رعنائیوں اسلوبی بیان کی نزاکتوں اور متنوع مسائل کے تحت ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ڈاکٹر رزاق فاروقی کا خیال ہے:۔

> ''خطوط نگاری کو فنونِ لطیفہ کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ خطوط نگاری کی فنی اہمیت یہ ہے کہ اسلوب بیان اور اظہار خیال کے سارے فن استعمال کئے جاسکتے ہیں۔''

خطوط کی ادبی و علمی اہمیت بھی مسلم ہیں۔ ادیب و شاعر خطوط کے ذریعے اپنے فکر و فن کے متعلق علمی مباحث فنی نزاکتیں وادیبوں اور شاعروں کے علمی معتقدات اور ادبی رجحانات ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔ غالب کے کئی خطوط اس بات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ غالب نے اپنے خطوط کے ذریعہ کئی ادبی و شعری اصطلاحیں لکھیں۔ اپنے نقطۂ نظر کو پیش کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط علمی و ادبی مباحث کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ گفتگو سے ہمارے علم و ادب میں اضافہ کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ خطوط صرف ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ہی نہیں لکھے جاتے بلکہ اچھے خطوط تو وہ سمجھے جاتے ہیں۔ جس میں مکتوب نگار اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ خطوط کی بڑی وسعتیں ہوا کرتی ہیں مثلاً قید و بند میں لکھے گئے خطوط جنگ آزادی و وطن کے دوران ہمارے رہنماؤں نے زنداں دانوں سے جو خطوط لکھے کسی نے اپنی بیٹی کے نام خطوط لکھے کسی نے اپنی بیوی کے نام یہ خطوط جذبات انسانی کے ساتھ

ساتھ ایک عہد کی تاریخ کی بھی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں اس طرح کے خطوط جذبات کا آئینہ ہوتے ہیں ۔اس لیے خطوط نگاری کو فنون لطیفہ کی شاخ کہا جاتا ہے۔بیسویں صدی میں اردو مکتوب نگاری میں ایک نیا رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔جس میں ترقی پسند کی جھلک کے ساتھ اشتراکیت بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ خصوصاً: علامہ اقبالؔ، ابوالکلام آزادؔ اور حسرت موہانیؔ کے یہاں اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

حسرتؔ موہانی کی مکتوب کی امتیازی خصوصیت سادہ حسن کاری ہے۔ان کی تحریروں میں درد و اثر کے ساتھ شیرینی و دلکشی اور طرز ادا میں شگفتگی اور لطافت پائی جاتی ہے۔عشقیہ جذبات اور احساسات کی دلکش تصویر کشی، سیاست کی ترجمانی آزادی کی تڑپ ان کی زندگی کی سادگی سچائی یہ سب کچھ ان کے مکتوبات میں بڑی ہی سادگی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ان کے مکتوبات کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی بلند خیالی اور زور بیان ہے جس سے ان کی تحریروں میں ایک نیا اسلوب یا حسن دیکھنے کو ملتا ہے۔حسرت کو قید میں خطوط لکھنے کی اجازت نہیں تھی۔اسی لیے آپ پوشیدہ طور پر ہفتہ میں ایک بار اہلیہ کو خط لکھا کرتے تھے۔مگر نشاط النساء کو خط روز لکھنے کے لیے کہا کرتے تھے۔جس کا ذکر ۵/فروری ۱۹۱۶ء کے اس خط سے ہوتا ہے۔لکھتے ہیں:۔

> ''تم خط روز لکھا کرو مگر میں ہفتہ وار لکھا کروں گا۔ہفتہ کے روز تم جوابی کارڈ لکھ دیا کرو تا کہ میں اتوار کو جواب لکھ دیا کروں باقی برابر حسب معمول یوں ہی کارڈ لکھا کرو۔'' [۲]

یہ خطوط ہی حسرت کے لیے پیغام رسانی کا ایک بہترین ذریعہ تھے۔جس کی وجہ سے آپ جیل خانے کے حالات سے اپنی اہلیہ کو آگاہ کرتے رہے۔اور اپنے گھر کی سیاسی و کاروباری چیزوں کی اطلاع اپنی بیگم نشاط النساء سے خطوط کے ذریعہ معلوم کر لیتے۔اور پھر اپنے مفید مشوروں سے انھیں نوازتے اور کبھی اپنے ادبی ذوق کو پورا کرنے کے لیے کتابیں وغیرہ بھیجنے کی فرمائش کرتے۔نشاط النساء کو ۱۹۱۴ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

''میرے پاس اخبار وغیرہ بہت جمع ہوئے ہیں۔عنقریب وہ
سب ایک بورے میں بھر کر واپس کردوں گا۔اس کے بعد میں
علی گڑھ سے تزکرہ شعراء کے لئے بہت سے دیوان منگاؤں گا
۔جن کی فہرست عقب سے روانہ کروں گا۔تم وہ سب دیوان
ہمارے کتب خانے سے تلاش کر کے ایک ٹرنک میں بند کر
کے بذریعہ پسنجر ٹرین میں بھیج دینا۔'' ۳؎

حسرت موہانی کو پرتاپ گڑھ جیل سے فیض آباد جیل ۲ر فروری کو منتقل کیا گیا۔ جہاں پر انھیں ہر طرح کی سہولیتیں فراہم کی گئیں ۔جس کا ذکر خطوط میں ملتا ہے۔ایک خط میں بیگم حسرت کو لکھتے ہیں۔

''اطمینان رکھو کتابیں اور اخبار بھی حسب معمول ملتے ہیں۔''

بیگم نشاط النساء نے ایک اخباری بیان میں کہا ہے:

''حسرت نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے اس میں ضد اور خودرائی
کو مطلق دخل نہیں ہے۔ میں نے ان کی اس رائے کو بے حد
اطمینان اور خوشی کے ساتھ دیکھا ہے۔ایسی نظر بندی سے قید
بہر حال بہتر ہے۔حسرت نے خوب کیا۔ مجھے ان سے یہی
امید تھی۔'' ۴؎

نشاط النساء نے حسرت کی زندگی کے ہر رنگ میں خود کو اس طرح رنگ لیا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے۔نشاط النساء کو علی گڑھ آئے ہوئے ابھی پانچ سال بھی نہ ہوئے تھے کہ حسرت کو یکا یک قید و بند کی مصیبت سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ ان کے لیے خصوصاً نشاط النساء کے لیے کڑی آزمائش کا وقت تھا۔

جیل میں اخبار اور کتابوں کی سہولیات فراہم ہونے کے باوجود آپ گھر سے اردو ادب کی مختلف کتابیں منگوایا کرتے تھے ۔ان کتابوں کے متعلق آپ بیگم نشاط النساء کو خط میں فہرست لکھ دیتے۔جس کا ذکر ۱۱/فروری ۱۹۱۶ء کے اس خط میں ہے:۔

''مندرجہ ذیل دیوان تلاش کر کے بھیجو۔۔۔(۱) شاہ حاتم قلبی جلد چھڑا (۲) شگفتہ (۳) میر مہدی مجروح (۴) ذکی شاگرد غالب۔۔۔مسودہ قلمی میرے ہاتھ کا تھا تلاش کر کے بھیجو ۔۔۔''۵

بیگم حسرت نے سیاسی و علمی اور ادبی کارناموں میں ہمیشہ حسرت موہانی کا ساتھ دیا۔حسرت موہانی کے سبھی علمی و ادبی کام وہی انجام دیتی تھیں ۔حسرت موہانی کے خطوط میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔۱۱/مارچ ۱۹۱۲ء کے ایک خط میں حسرت موہانی نشاط بیگم کو لکھتے ہیں:۔

''جن جن لوگوں کو دیوان حسرت مکمل نہ پہنچا ہو۔مثلاً ہمدم، قیصر ہند وغیرہ ۔ان کو اب صرف حصہ دوم بھیجنا ۔اور شوکت مولوی حیدر، مولوی حمید الدین کو حیدر آباد جو دیوان تم نے بھیجے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ان لوگوں کو نہیں ملے۔۔۔''۶

حسرتؔ کی طبیعت میں احساس کمتری بالکل نہ تھی۔جدوجہد کرنا اور خود پر اعتماد کرنا ضروری سمجھتے تھے۔اس خیال کو حسرتؔ نے اپنے ایک خط میں بھی پیش کیا ہے۔

''میں گورنمنٹ کو اپنی آخری تحریر بھیجوں گا کہ میں علی گڑھ میں نظر بندی منظور کر سکتا ہوں بشرط یہ کہ میرے ذمہ کوئی الزام نہ لگایا جائے اور مجھ کو بدستور اپنی روزی خود پیدا کرنے کی اجازت

ہو۔۔‘‘ ۷

لیکن آپ کی یہ درخواست منظور نہیں کی گئی اور حسرت کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا۔آپ کے ساتھ مقدمہ کی پیروی کے لئے بیرسٹر نہیں تھا۔ پھر بھی آپ کی اعلیٰ ہمتی اور خودداری دیکھئے کہ بیرسٹر نہ ہونے کے باوجود اپنی اہلیہ کو لکھ رہے ہیں کہ مجھے کامیابی ہوگی۔اسی سلسلے کا ۱۳؍مئی ۱۹۱۲ء کا یہ خط ملاحظہ کیجئے۔نشاط بیگم کو لکھتے ہیں۔

’’۱۵؍مئی ۱۹۱۲ء کو ۱۱ بجے دن کے میرے خلاف مقدمے کی کاروائی یہاں سب ڈویژنل افسر کے اجلاس میں شروع ہو جائے گی اس کے لئے تیار ہوں۔سب باتیں اور اعتراض وغیرہ سوچ لئے ہیں۔انشاءاللہ تعلیٰ مجھ کو کامیابی ہوگی۔مگر ایک اور بھی شخص مثل بیرسٹر کے ہوتا تو اچھا تھا۔۔۔کچھ مضائقہ نہیں میں خود پیروی کرلوں گا۔‘‘ ۸

حکومت وقت اگر کوئی تحریر کرنی ہوتی تو حسرت سب سے پہلے کسی بیرسٹر سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ان بیرسٹروں میں خواجہ عبدالمجید بیرسٹر علی گڑھ۔ڈاکٹر ناظرالدین حسن بیرسٹر لکھنؤ وغیرہ تھے۔آپ ان سے مشورہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔لیکن آپ کی مدد کے لئے کسی بیرسٹر نے ساتھ نہیں دیا۔تب افسوس کے ساتھ اپنی بیگم کو لکھتے ہیں۔بیگم حسرت انتہائی افسوس کے ساتھ عبدالباری صاحب کو ۲۴؍جون ۱۹۱۶ء کے ایک خط میں لکھتی ہیں۔

’’اب شاہد حسین صاحب کا یا اور کسی بیرسٹر کا خیال نہ فرمایئے۔ جانے دیجئے۔سب لوگ بے وجہ حددرجہ خائف ہیں۔‘‘

حسرت موہانی دین اسلام کے پابند تھے۔حق گوئی اور بے باکی آپ کی مزاج میں

تھی۔ یہاں تک کہ حکومت وقت کے ان شرائط پر رہا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ جہاں ان کی خودی کو مجروح کرنے کی بات ہورہی تھی۔ ۲۰ر فروری ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں بیگم حسرت کو لکھتے ہیں:۔

''آج سپرنٹنڈنٹ پولس میرٹھ ایک اور انگریز آئے اور کہا کہ گورنمنٹ تم کو رہا کرنا چاہتی ہے۔مگر اس شرط پر کہ مقام کٹھور ۔۔بنگلے میں نظر بندی کے جملے قیود کے ساتھ رہنا منظور کرو مگر میں نے اس کو منظور نہ کیا۔۔''۹

مندرجہ بالا خط سے حسرت موہانی کی خودداری اور انگریزی حکومت کے خلاف شدید احتجاج نظر آتا ہے۔ یہ آپ کی شخصیت کی ایک اہم خصوصیت تھی جو عموماً آپ کے ہر خط میں نمایاں نظر آتی ہے ۔ایک دوسرے خط میں بھی یہ احتجاج نمایاں نظر آتا ہے۔

''۔۔میں ہرگز ہرگز گورنمنٹ کے حکم کو تسلیم نہ کروں۔۔۔''۱۰

یہ آپ کی قناعت پسندی تھی کہ آپ نے تکالیف و مصیبتوں کے باوجود قید و گرفت میں رہنا مناسب سمجھا۔لیکن انگریزوں کی دی ہوئی چیزوں کو کبھی قبول نہیں کیا۔ یہاں تک کہ سودیشی اسٹور کھولا۔ ہندوستانی تیار کردہ چیزوں کی حمایت کی لیکن حکومت کی یا اپنے عزیزوں کی طرف سے مالی امداد لینا گوارہ نہیں کیا۔حالانکہ حسرت موہانی کے عزیز و اقارب ان کی مالی حالت کے پیش نظر اگر انھیں ہدیہ کے طور پر کچھ پیش کرتے تو وہ اسے کبھی قبول نہیں کرتے۔ یہ حسرت موہانی کی قناعت پسندی اور سادگی تھی کہ حسرت موہانی روٹی اور پھٹے کپڑوں میں مگن رہے۔حسرت موہانی کی یہ سادگی ان کے خطوط میں نظر آتی ہے۔آپ کے خطوط کی تعداد مختصر ہے۔ جسے محمد طفیل صاحب نے نقوش میں شائع کئے ہیں۔مختصر سی تعداد میں حسرت موہانی کی سماجی سیاسی ادبی و ذاتی زندگی کے متعلق بہت سی اہم باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ یہ خطوط حسرت موہانی نے اپنی بیگم نشاط النساء کو لکھتے ہیں۔وقتی مسائل اور ضرورتوں سے ہٹ کر بھی خطوط ایسے ہیں جس میں حسرت موہانی اپنی رفیق حیات کو غزلیں لکھ کر بھیجا کرتے تھے ایک خط میں نشاط النساء بیگم کو خط

لکھتے ہیں:۔

''میں نے جھانسی سے ایک خط ۶ جولائی کو لکھا تھا۔جس میں
ایک غزل ''نور تیرا، سرور تیرا'' تھی ۔ مجھے یہی معلوم ہوتا ہے
کہ وہ تم کو ملا نہیں ۔۔۔خیر اب وہ غزل اور دوسری غزلیں پھر
کبھی لکھ دوں گا۔۔۔''[۱۱]

بیگم حسرت زیادہ پڑھی لکھی خاتون نہیں تھیں ۔مگر عربی، فارسی، اردو میں کافی مہارت رکھتی تھیں ۔اسی لئے حسرت موہانی قید فرنگ سے انھیں خطوط کے ساتھ کبھی کبھی غزلیں بھی لکھ دیا کرتے تھے۔حسرت کی گرفتاری کے وقت حسرت کی شیر خوار بچی نعیمہ بہت بیمار تھیں ۔گھر میں بیگم حسرت اور خادمہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔لیکن ایسے نازک حالات میں حسرت کے یہ خطوط بیگم حسرتؔ کا حوصلہ بڑھاتے ہیں اور بیگم حسرت بھی حسرت کو قید و بند کی سختیوں اور دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لئے انھیں دعا اور وظیفے بذریعہ خطوط بھی بھیجتی رہتی جس کا ذکر حسرت کے ۱۳/مئی ۱۹۱۶ء کو لکھے اس خط سے ہوتا ہے:۔

''وظیفے دونوں پہنچے ۔پڑھتا ہوں ۔تمہارے سب خطوط مجھ کو
ملتے ہیں۔''

حسرتؔ موہانی کے جتنے بھی خطوط چاہے تعداد کے لحاظ سے قلیل مقدار ہے ۔ان خطوط سے ہم مستقبل کے لئے راہِ عمل متعین کر سکتے ہیں کیوں کہ آپ کے خطوط بالکل آپ کی شخصیت کی طرح پہلودار ہیں ۔اس میں تصنع و بناوٹ کا شائبہ تک نہیں یہاں تک کہ القاب اور آداب بھی نہایت سادہ اور مختصر ہیں ۔اپنی شریک حیات کو بنام نشاط النساء سے اور بسم اللہ سے خط کی شروعات کرتے ہیں ۔یہ دو لفظ ہی القاب و آداب ہیں ۔اگر کسی ادب شناس کو مخاطب میں مکرم بندہ یہی سادگی ہے ۔ جو حسرت کے خطوط میں دلوں کو لبھاتی ہے۔سادہ اور رواں دواں اسلوب ہر جگہ نمایاں ہے۔البتہ

بات کو سمجھانے لے لئے جزئیات کا استعمال کیا گیا ہے۔مجموعی طور پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حسرت کے خطوط ان کی شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔

حواشی:

۱۔ جہات وجستجو۔ڈاکٹر مظفر حنفی،ص ۱۳۰

۲۔نقوش مکاتیب نمبر ۱۹۵۸ء۔محمد طفیل،ص ۲۰۸

۳۔نقوش مکاتیب نمبر ۱۹۵۸ء۔محمد طفیل۔ص ۲۰۹

۴۔بحوالہ جلیل قدوائی: مولانا حسرت موہانی جائزہ کانپور حسرت نمبر ۸ر ستمبر ۱۹۷۵ء۔ص ۴۷

۵۔نقوش مکاتیب نمبر ۱۹۵۸ء محمد طفیل۔ص ۲۰۹

۶۔نقوش مکاتیب نمبر ۱۹۵۸ء محمد طفیل۔ص ۲۰۹

۷۔نقوش مکاتیب نمبر ۱۹۵۸ء محمد طفیل۔ص ۲۱۲

۸۔نقوش مکاتیب نمبر ۱۹۵۸ء محمد طفیل۔ص ۲۱۲

۹۔حسرت موہانی۔خلیق انجم۔ص ۱۶۷

۱۰۔تقدیر وتعبیر۔محمد ہدایت اللہ۔ص ۸۰

۱۱۔نقوش مکاتیب نمبر، ۱۹۵۸ء محمد طفیل۔ص ۲۱۳

خطوط غالبؔ معلومات کا گنجینہ

اردو ادب میں مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کی اردو شاعری اور خطوط نگاری دونوں ان کی عہد آفرین کارنامے ہیں۔ اردو میں یہ کارنامہ سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ غالبؔ کے خطوط اردو نثر کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالبؔ کے خطوط اپنے دور کی نہ صرف بہترین عکاسی کرتے ہیں بلکہ معلومات کا گنجینہ ہیں۔ ان کے خطوط میں سیاسی اور سماجی زندگی، ایام غدر، خوشی، مسرت، بے بسی، قحط، سیلاب، دہلی کے اُجڑے اور ویران بازار، شاعر اور ادیبوں سے گفتگو، مالی پریشانی، دوستوں سے بچھڑنے کے غم کے چشم دید حالات غالب کے خطوط میں بیان ہوئے ہیں۔ لوگوں نے ان خطوط کا مطالعہ کر کے تاریخی نکات اخذ کیے ہر ایک مسئلہ پر غالب کی رائے لے کر ایک ادبی منظر نامہ تیار کیا۔ غالب نے اپنے خطوط کے ذریعے اردو نثر کو وسعت دی اور بے تکلفانہ ہر قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ خطوط نگاری کے قدیم طریقہ انداز کو ترک کیا اور اپنے تحریر کو سادہ اور سلیس انداز میں بیان کیا۔ غالب کے خطوط اردو ادب میں سادگی، بے ساختگی اور بے تکلفی کے اعلیٰ نمونے سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے خطوط سے جدید اردو نثر کا آغاز ہوتا ہے۔ حالی نے غالب کی خطوط نگاری کے بارے میں لکھا ہے

''مرزا کی اردو خط و کتابت کا انداز ہ سب سے نرالا ہے۔''

(یادگار غالب ۱۷۸)

غالبؔ کا ایک مشہور شعر ہے:

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

غالبؔ سے پہلے بھی اردو میں خطوط نگاری کی روایت موجود تھی۔ اس سلسلے میں دو نام

ڈاکٹر امتیاز احمد علی، جموں اینڈ کشمیر

اہمیت کے حامل ہیں ایک رجب علی بیگ سرورؔ اور دوسرا غلام غوث بے خبرؔ لیکن غالبؔ کی سی سادگی اور بے تکلفی جیسی خصوصیات ان کے خطوط میں موجود نہیں تھی۔ البتہ ان کے خطوط میں عربی اور فارسی کے مشکل اور غیر مانوس الفاظ و تراکیب، مسجع و مقفٰی عبارت آرائی، پر پیچ اسلوب اور طویل القاب کا استعمال عام ہوتا تھا۔ غالبؔ نے ان سب چیزوں سے پرہیز کر کے ایک مخصوص اسلوب بیان اختیار کیا اور تحریر کو تقریر کے قریب کر دیا اور یوں مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔ اس اسلوب کی مکمل پیروی نہ تو ان کے معاصرین کر سکے اور نہ ان کے بعد کسی نے کی۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام اپنے ایک مضمون ''خطوط نگاری'' میں رقم طراز ہیں۔

> ''ہماری زبان میں مکتوب نگاری کی ابتدا غالبؔ سے ہوتی ہے ان سے پہلے بھی یہ ذوق عام تھا لیکن خواص کی ادبی زبان فارسی تھی۔ چنانچہ رقعات عالمگیری کے علاوہ جو مکاتیب شمالی ہند کے بزرگوں نے لکھے ہیں۔ وہ اسی فارسی میں ہیں جو کانٹے میں تولی جاسکتی ہے۔ القاب و آداب شرمناک حد تک تکلف سے پُر ہیں۔ رجب علی بیگ سرورؔ، غلام غوث بے خبرؔ، قتیلؔ اور دوسرے ادیبوں کے مکاتیب جو کتاب کی صورت میں موجود ہیں۔ مکاتیب نہیں مہمات ہیں اس دور کے اعتبار سے یہی انداز تحریر فطری تھا لیکن بدقسمتی ہمارے لیے ان میں دل چسپی کا کوئی سامان نہیں۔ غالبؔ ذہنی طور طور پر اپنے پیش رووں سے کہیں زیادہ بیدار تھے۔ انھوں نے فن کو زندگی پر فضیلت نہیں دی۔ ان کی زندگی ان کے فن کا وسیلہ بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ غالب جو کچھ اپنی روزمرہ زندگی میں نظر آتے ہیں وہی شاعری میں ہیں اور وہی اپنے خطوط میں ہیں۔ ان کے مکاتیب زبان کے ارتقاء میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

(اردو نثر کا فنی ارتقا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص ۴۰۴)

حامد حسن قادری کو غالبؔ کے اسلوب کو دیکھ کر یہ کہنا پڑا:

''اردو خطوط نویسی کا غالب نے جو طریقہ ایجاد کیا اور اس میں
جدتیں پیدا کیں اور ان کو جس التزام، اہتمام اور کمال کے
ساتھ برتا اس میں غالب اول بھی ہیں اور آخر بھی''

(داستان تاریخ اردو، حامد حسن قادری، ص ۲۱۷)

خطوط غالبؔ کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو غالب ایک ایسے سادگی پسند نثر نگار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جسے پر تصنع اور پر تکلف عبارت پسند نہیں تھی نہ ان کو طویل فقرے خط میں لانے پسند تھے۔ یہ بات صاف ظاہر ہوتی کہ غالبؔ نے سیدھے سادے الفاظ اور عام بول چال کی زبان سے چھوٹے بڑے واقعات کو بڑے معنی خیز اور خوبصورت انداز سے بیان کیا۔ غالب اپنے دوستوں کو خط میں لکھتے تھے:

''چاہتا ہوں کہ کم سے کم لفظوں میں اپنی بات کہہ دوں اور تحریر
کو تقریر کا آئینہ بنا دوں''

(خط بنام مرزا علی بخش خان)

''مرزا صاحب میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو
مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر
میں وصال کے مزے لیا کرو۔''

(مکتوب بنام حاتم علی مہر)

غالبؔ کے خطوط کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی شوخیِ تحریر ہے۔ شوخی تحریر کی وجہ سے غالب بے جان بات کو بھی جاندار بنا دیتے تھے۔ شوخی تحریر کے بارے حالی نے ''یاد

گارِ غالب‘‘ میں لکھا ہے:

’’وہ چیز جس نے ان کے مکاتیب کو ناول اور ڈرامے سے زیادہ
دلچسپ بنایا ہے وہ شوخیِ تحریر ہے۔ مرزا کے کی طبیعت میں شوخی ایسی
بھری ہوئی تھی جیسے ستارے کے تارے میں سر بھرے ہوتے ہیں،
اور قوت متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اس کو مرزا کے
دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوت پرواز کو طائر کے ساتھ‘‘

(یادگار غالب ص ۱۷۹)

اپنے خطوط میں مرزا ہمیشہ شوخی، ظرافت و رجدت سے کام لیتے ہیں۔ اس طرح غالب کو جہاں موقع ملتا تھا لطیف مزاح سے کام لیتے تھے اور ہر موقع پر زندہ دلی کا ثبوت دیتے تھے۔ غالبؔ کی زندگی نہایت ہی تنگ دستی میں گزری۔ غدر کے زمانے میں ان کے حالات بے حد خراب تھے۔ لیکن اس کے باوجود مرزا کے حسِ مزاح میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کے خطوط میں تبسم زیر لب پیدا کرنے کی حلاوت پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے آنسوؤں کو ہنسی میں تبدیل کرتے تھے۔ حالی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

’’اگر نظم و نثر کے کمالات سے صرف نظر کر لی جائے تب بھی مرزا کی
زندگی صرف اپنی زندہ دلی اور شگفتگی کی وجہ سے ملک و قوم کے لیے
اہمیت رکھتی ہے۔‘‘

مولانا نے ان کے بذلہ سنجی اور ظرافت کے کئی واقعات لکھے ہیں۔ غالبؔ باتوں باتوں میں اپنی تحریر و تقریر میں جو لطف اور مزاح پیدا کر دیتے تھے وہ ان کی ہر بات اور تحریر کو یادگار بنا دیتی ہے۔

’’مرزا کے مزاج میں شوخی اور ظرافت اس درجہ تھی کہ حالی نے فرمایا
:انھیں بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہنا بجا ہے یہ شوخی اور
ظرافت خطوں میں بھی جا بجا موجود ہے۔ مثلاً میرزا نے اپنے خط

میں حسین علی خان کا ذکر کیا تو ساتھ ہی لکھا: وہ حسین علی خان کا روزہ مرہ ہے۔ کھلونے منگا دو۔ میں بھی جا بجا بازار جاؤنگا۔''

(غالب کے خطوط حصہ اول خلیق انجم ص ۵۸)

غالبؔ کے خطوط بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے اگر انہوں نے شاعری نہ کی ہوتی صرف اردو خطوط ہی لکھے ہوتے تب بھی اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام سنہری حروف سے لکھا جاتا اور اردو میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہتا۔

صفدر امام قادری اپنے ایک مضمون ''خطوط غالب جدید نثر کا نقطہ آغاز'' میں رقم طراز ہیں۔

''غالب نے جب اردو خطوط نگاری کا آغاز کیا۔ اس وقت اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اُن کے دواوین شایع ہو چکے تھے اور وہ ایک مستند اردو اور فارسی شاعر کی حیثیت سے تسلیم کیے جا چکے تھے۔ ان کے اردو خطوط پر جس سنجیدگی سے فوری توجہ دی گئی، اس کی وجہ بھی ایک عظیم المرتبت شاعر کے ہاتھوں رقم شدہ ہونے کی بات شامل حال تھی۔ خطوط غالب کی روز افزوں اہمیت اور مقبولیت بڑھی، اس میں بھی یہ نکتہ غیر متنازعہ طور پر سب سے اہم ہے کہ غالب کی شخصیت کے پیچ وخم کو خطوط میں وضاحت اور تفصیل کے ساتھ دیکھ لینے کے بعد ان کی شاعری اور بھی اثر انگیزی کے ساتھ ہمارے روبہ رو ہوتی ہے۔ اس لیے اس ادبی سرمائے کی لازوال اہمیت کے باوجود اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ غالب کی شاعرانہ

عظمت اولیت کی حامل ہے اور ان کی نثر نگاری اس کا تتمہ''

غالبؔ کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''مہر غالب، انتخاب غالب، عود ہندی، اردوے معلیٰ، مکاتیب غالب، ادبی خطوط غالب'' وغیرہ ان سب میں زیادہ مقبولیت اور شہرت ''اردوے معلیٰ'' اور ''عود ہندی'' کو حاصل ہوئی اس کے ابھی تک متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔

ابتدا میں غالبؔ اپنے دوست احباب اور رشتہ داروں کو فارسی میں خط لکھتے تھے۔ لیکن جب ان کو مغلیہ خاندان کی تاریخ لکھنے کا کام بہادر شاہ ظفر نے دیا تو عدیم الفرصتی اور بڑھاپے کی وجہ سے فارسی کے بجائے اردو میں خط لکھنے شروع کیے۔ اس سلسلے میں حالی لکھتے ہیں:

> ''وہ (غالب) فارسی تحریریں بڑی محنت اور کاوش سے لکھا کرتے تھے۔ اب اس کاوش کے ساتھ خطوط فارسی پر محنت کرنا دشوار تھا۔ اس لیے اردو میں خط و کتابت شروع کر دی''

غالب نے اپنے خطوط میں اپنے زمانے کی تاریخ قلم بند کی۔ غدر ۱۸۵۷ کے حالات کا پورا نقشہ غالب کے خطوط میں نظر آتا ہے یعنی جو واقعات ہمیں تاریخ (History) میں نظر نہیں آتے اس کی پوری تفصیل غالب کے خطوط میں ملتی ہے۔ غدر سے پہلے اور غدر کے بعد دہلی کی حالت کی جو تفصیل انہوں نے لکھی ہے وہ ان کے خطوط کے سوا کہیں نہیں ملتی ہیں، دہلی میں قتل غارت اور جان و مال کا لوٹ کھسوٹ کی عمدہ تصویر ان کے خطوط میں نظر آتی ہیں۔ اس ہنگامے سے غالب کی زندگی پر جو اثر پڑا اس کا اندازہ ان خطوط سے کیا جا سکتا ہے:

> ''اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نکل نہیں سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ

پڑے ہیں۔''

(خط بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

''وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے وہ میر سرفراز حسین آئے، وہ یوسف مرزا آئے، وہ میرن آئے وہ یوسف علی خان آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا بچھڑے ہوؤں میں سے گنے ہیں۔ اللہ اللہ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں میں مروں گا تو مجھے کون روئے گا''

(بنام سرفراز حسین)

خطوط غالبؔ میں نہ صرف دہلی کی بربادی کی تصویر کشی کی گئی بلکہ ان کے خطوط سے اُس وقت کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ خلیق انجم اپنی کتاب ''خطوط غالب۔ جلد اول'' میں لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی کے نصف اول کے ہندوستان میں برطانوی حکومت کی تاریخ کا بڑا حصہ ہمارے سامنے آجاتا ہے''

غالب کے خطوط میں غالبؔ کی پوری آپ بیتی ملتی ہے۔ ان خطوط میں غالبؔ کی پوری زندگی کی حقیقی کہانی ملتی ہیں والدین کون تھے۔ دہلی کب منتقل ہوئے۔ کلکتے کا سفر، لکھنو کا قیام، شادی کا بیان، غدر کے حالات، غدر کی وجہ سے کن کن مشکلات کا سامنے کرنا پڑا، بہادر شاہ ظفر کے استاد کب مقرر ہوئے وغیرہ وغیرہ۔ یہاں تک کہ ان کے خطوط سے اس بات کی بھی جانکاری ملتی ہے کہ انہوں نے اپنے مرنے کی تاریخ تک نکالی تھی۔ غرض پوری تفصّل ان کے خطوط میں ملتی ہے۔ بعد میں پروفیسر نثار احمد فاروقی نے غالبؔ کے خطوط کو سنہ ترتیب کے ساتھ جمع کر کے ''غالب کی آپ

بیتی''، لکھی۔ غالب کے خطوط میں غالب کے تنقیدی شعور کا بھی پتا چلتا ہے۔ انہوں نے اپنے کئی خطوط میں اپنے اشعار کی خود ہی تشریح کی اور اپنے شاگردوں کے کلام پر بھی اصلاح کی اور بعض اوقات اپنے فن کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا۔ ان خطوط سے ہمیں غالبؔ کی شاعری اور شعریات کو بہتر طریقہ سے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

غالبؔ نے نہ صرف فرسودہ انداز کی نثر نگاری کو ختم کیا بلکہ طویل القاب وآداب کو بھی ترک کیا۔ غالب نے سادہ تحریر کو رواج دیا اور بول چال کی زبان کو آسان الفاظ میں استعمال کیا۔ جس سے اردو نثر ہمارے احساس سے زیادہ قریب ہوئی۔ غالب کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے۔ بقول آفتاب احمد:

''غالب نے تحریر کو زندگی سے قریب کر دیا''

(بحوالہ غالب اور عہد غالب۔ ص ۵۹)

غالبؔ نے اپنے خطوط میں عصری زندگی کی ایسی عکاسی کی ہے کہ وہ اپنے دور کی تاریخ بن گئی۔ ان کے خطوط کی شوخی تحریر کی وجہ سے یہ خطوط ہمیشہ دلچسپی کے ساتھ پڑھے جائیں گے اور قابل قدر رہیں گے۔

کتابیات:

۱۔ یادگار غالب۔ الطاف حسین حالی

۲۔ غالب اور عہد غالب، شاہد مرتبین اور ڈاکٹر رضا حیدر

۳۔ تصورات غالب، محمد عزیز حسین

۴۔ داستان تاریخ اردو، حامد حسن قادری

۵۔ عبدالرحمٰن بجنوری، محاسن کلام

۶۔ دیوان غالب، غالب

غبارِ خاطر کا تنقیدی جائزہ

اردو کا مکتوباتی ادب اردو نثر نگاری کی وسیع وعریض تاریخ میں اپنا ایک علیحدہ اور مستقل وجود رکھتا ہے، اردو کے نثری ادب کی کوئی تاریخ اردو کے مکتوباتی ادب سے چشم پوشی کرنے کے بعد مکمل یا معتبر تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ اردو میں مکتوب نگاری انشا وقواعد کے دشوار گزار مراحل سے گزر کر سلاست وسادگی کی پاکیزگی میں ڈھلنے کے بعد ایک باقاعدہ فن کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

اردو کا مکتوباتی ادب اپنے فن کے ارتقائی دائروں میں گردش کرتا ہوا ایک زبردست کارواں کی طرح آگے بڑھتا چلا جارہا ہے، اس کی ابتدا اور آغاز سے اس کی اپنی ایک الگ تاریخ ہے، اس میں نشو ونما، ترقی، جدت اور ندرت کے تمام عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ بقا اور ارتقا کے تمام ضروری اوصاف سے مزین ہے، اس میں زندہ رہنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ یہ اپنے شاندار ماضی اور حال سے گزرتا ہوا ایک زریں مستقبل کی طرف گامزن نظر آتا ہے۔

مکتوب نگاری کا ماضی قلم اور کاغذ کی قدیم ایجاد کے برابر پرانا ہے، اردو مکتوب نگاری کی اولین تاریخ اب تک کی دریافت کے مطابق 1803 تک پہنچتی ہے جو پروفیسر مختار الدین آرزو کی تحقیق میں اردو کے قدیم ترین رقعہ پر مشتمل ہے۔ ادب میں کئی طرح کی دلکشیاں پائی جاتی ہیں لیکن جہاں تک خطوط نگاری کی دلکشی اور سحر آفرینی کا تعلق ہے وہ ادب کی کسی اور صنف میں نہیں ہے بشرطیکہ مکتوب نگار میں خط لکھنے کی بہترین صلاحیت پائی جاتی ہو۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ ادب کی تخلیقی اصناف میں مصنف کو صنعت گری سے کام لینا پڑتا ہے جبکہ خطوط میں سادگی اور سچائی ہوتی ہے جسے زوال نہیں۔ گویا خطوط کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے جس میں خلوص وصداقت زیادہ پائی جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے جیسے ایک انسان اپنے آپ سے محو گفتگو ہو۔ خط کو دل کا آئینہ کہا گیا ہے کیوں کہ کسی شخص کی زندگی کے کارنامے اور خیالات کو اچھی طرح معلوم کرنے کے لیے اس کے

ڈاکٹر معراج الدین خان، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، کسان پی جی کالج، بہرائچ

خطوط کا مطالعہ ضروری ہے۔ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی خطوط نگاری سے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:

''خط میں لکھنے والے کی شخصیت مرکوز ہوتی ہے، کبھی کبھی خط کے
ذریعے بھی کسی اہم شخصیت کی زندگی، کارنامے اور خیالات وغیرہ
کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔''

(مناظر عاشق ہرگانوی، روبرو، 1992 ص18)

اردو کا مکتوباتی ادب چند زبردست حیثیتوں کا مالک ہے، پہلی حیثیت میں یہ مکتوب نگاری کے اس سرمایے سے تعلق رکھتا ہے جس کی بہترین مثال میں عام طور پر خطوط غالب کو پیش کیا جاتا ہے، دوسری حیثیت میں فارسی وعربی نیز انگریزی کے مکتوباتی ادب کے ترجموں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ایک اور حیثیت میں یہ اس ادب کا سرمایہ ہے جو صورت و ہیئت میں مکتوباتی ہونے کے سبب ایک خوبصورت تجربے کا مقام رکھتا ہے، اس کے جملہ شاہکاروں میں لیلیٰ کے خطوط، مصنف قاضی عبدالغفار، نیاز فتح پوری کے مکتوبات نیاز، مجنوں گورکھپوری کے پردیسی کے خطوط اور ابوالکلام آزاد کے غبار خاطر کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے دور کی عبقری شخصیت تھے، وہ ایک غیر معمولی سیاست داں، ایک بے عدیل مقرر، ایک لاجواب مفسر، اور بے مثال انشا پرداز تھے۔ان کی گوں ناگوں خوبیوں کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔غبار خاطر کے دیباچہ میں محمد اجمل خاں مولانا آزاد کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا کی زندگی مختلف اور متضاد حصوں میں بٹی ہوئی ہے، وہ ایک
ہی وقت میں مصنف بھی ہیں، مقرر بھی ہیں، مفسر بھی ہیں، اور فلسفی
بھی ہیں۔ادیب بھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ جدوجہد آزادی کے سپہ
سالار بھی۔ گویا ان کی زندگی میں بہت سی زندگیاں شامل ہوگئی
ہیں۔''

غبار خاطر دل میں اس مقام کو کہتے ہیں جہاں جذبات اکٹھا ہوتے ہیں، غبار خاطر مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کا وہ مجموعہ ہے جو انھوں نے قلعہ احمد نگر کی اسیری میں 1942 سے 1945 کے درمیان لکھے، یہ خطوط مولانا نے اپنے دوست حبیب الرحمٰن شیروانی کے نام لکھے تھے۔ چونکہ قید خانے سے کسی کے خط کو باہر جانے کی اجازت نہ تھی اس لیے اس مجموعے کو بعد میں کتابی شکل میں شائع کرایا گیا۔ ان خطوط میں مولانا کے قید کے شب و روز اور ذہن و دماغ کی حالت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور مولانا کی مضمون نگاری کے جوہر دکھائی پڑتے ہیں۔ اس میں کل 24 خطوط ہیں اور سات سو اشعار ہیں۔ غبار خاطر اردو میں غالباً واحد کتاب ہے جس نے اپنی طباعت کی پہلی منزل سے بڑی دھوم مچائی اور شائع ہو کر جب منظر عام پر آئی تو ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور تنقید و تعریض کا نشانہ بنی، تو عرصہ تک لوگوں کے دل و دماغ پر اس کا جادو چلتا رہا۔ اس نے قلب و نظر، عقل و شعور، گفتار و کردار اور تحریر و تقریر سب کو متاثر کیا، صاحبِ دل، صاحبِ نظر، صاحبِ قلم، صاحبِ علم سبھوں نے اس سے فیض اٹھایا، اس کی عظمت کا اعتراف کیا لیکن ایک گروہ ایسے حضرات کا بھی رہا ہے جو انھیں خطوط میں شمار کرنا پسند نہیں کرتے۔ کسی نے اس کو مضامین کا دفتر کہا ہے تو کسی نے انشائیہ کا مجموعہ قرار دیا ہے۔ کسی نے خود کلامی کہا ہے اور کسی نے روزنامچہ کہا ہے، لیکن درحقیقت یہ خطوط کا مجموعہ ہے۔ مصنف نے بھی خطوط کا مجموعہ کہا ہے۔

ان خطوط کی تخلیق میں بعض ایسے عناصر کارفرما ہیں جن کا وجود انشائیہ کی تخلیق کے لیے از بس ضروری ہے، مثلاً انشائیہ نگار شخصی سطح پر واردات قلبی کا انکشاف کرتا ہے جیسے کسی بے تکلف دوست سے اپنی ذہنی ترنگیں بیان کر رہا ہو، بعینہ یہی حالت مولانا ابوالکلام آزاد کو اس وقت میسر آتی ہے۔ قلعہ احمد نگر میں اسیری کے دوران سیاست کی متلاطم ہیجان انگیز لہروں سے نجات حاصل کرنے کے بعد انھیں ایک گوشہ تنہائی میسر آیا، ان لمحات میں مولانا کے خیالات، جذبات و افکار کے پردوں میں ہونے والی جنبش ان کے خطوط میں ریکارڈ ہوئی اور اس ارتعاش کی اوٹ سے ان کی شخصیات کی

جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ان خطوط میں یہی خود اکتشافی انشائیہ نگاری سے عبارت ہے۔غبار خاطر کے خطوط فوراً مکتوب الیہ تک نہیں پہنچے۔مولانا کے سکریٹری محمد اجمل خاں نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

''قلعہ احمد نگر کے زمانے میں دوستوں سے خط و کتابت کی اجازت نہ تھی اور حضرت مولانا کی کوئی تحریر باہر نہیں جاسکتی تھی۔ 15 جون 1945 کو جب مولانا رہا ہوئے تو ان مکاتیب کے مکتوب الیہ تک پہنچنے کی راہ ہموار ہوئی۔''

(محمد اجمل خاں، مقدمہ غبار خاطر، ص5)

غبار خاطر کے خطوط میں زبان و بیان کی سلاست، خیالات کی پاکیزگی اور جمالیاتی کیفیت کے بارے میں ناقدین حضرات یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔گوپی چند نارگ نے کہا:

''غبار خاطر کے خطوط تنہائی کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔''

''سجاد انصاری کے خیال میں مولانا کی نثر الہامی ہے۔''

مہدی افادی کہتے ہیں:

''یہ ماہ جبینوں کا چمن ہے۔''

سردار جعفری کے بقول:

''یہ خط نہیں ہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے ادب پارے ہیں۔''

یوسف سرمست زوردے کر کہتے ہیں:

''غبار خاطر کا تعلق مکتوبات سے اتنا زیادہ نہیں جتنا انشائیہ سے ہے۔''

غبار خاطر کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ مولانا کے خطوط میں زبان کی سلاست، خیال کی پاکیزگی، انداز کی ندرت اور بے ساختگی کے ساتھ ساتھ مکتوب الیہ سے بڑی قربت اور اپنائیت پائی جاتی

ہے۔خطوط کے اس مجموعے کا نام ابوالکلام نے کہاں سے مستعار لیا،اس سلسلے میں غبار خاطر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''میر عظمت اللہ خاں بے خبر بلگرامی، مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کے معاصر اور ہم وطن تھے،انھوں نے ایک مختصر رسالہ غبار خاطر کے نام سے لکھا تھا، یہ نام ان سے مستعار لیتا ہوں۔''

(غبار خاطر،ص1)

غبار خاطر میں مکتوب الیہ برائے نام ہے، یہ خطوط کہیں شعری انداز میں ہیں تو کہیں افسانوی، کہیں علمی اور کہیں سادہ سلیس عبارت ملتی ہے۔وہ اپنے خطوط میں ایک خطیب، انشا پرداز کی حیثیت سے نظر آتے ہیں اور حیات وکائنات کے بارے میں فلسفیانہ باتیں کرتے ہیں۔بعض خطوط پر فلسفہ پوری طرح حاوی ہے۔ان کے خطوط سے ہمیں یورپ کے فلسفیوں اور ایشیا کے پرانے مفکروں کے خیالات سے قدم قدم پر آگاہی ہوتی ہے۔خوشی کے فلسفہ پر مولانا اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ اصل خوشی جسم کی نہیں، دماغ کی ہے، جو تہ خانے میں بھی محسوس کی جاسکتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''قید خانے کی چہار دیواری کے اندر بھی سورج روز چمکتا ہے،اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔''

(غبار خاطر،ص69)

غبار خاطر کا اسلوب اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔غبار خاطر کے خطوط کے موضوع کے مطابق اس کا اسلوب ہے،جیسا موضوع ویسا ہی اسلوب۔اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے

کہ کہیں شعریت کا غلبہ ہے اور انھیں عربی فارسی کے بے شمار اشعار یاد ہیں، ان کی زبان کہیں فارسی آمیز ہے تو کہیں عام فہم نثر شگفتہ اور دل نشیں ہے۔ مولانا چاے کا ذکر بڑے خوب صورت انداز سے کرتے ہیں کیوں کہ وہ چائے کے بڑے شوقین تھے، اور چینی چائے وائٹ کا استعمال کرتے تھے جس کا ترجمہ انھوں نے گوری چمیلی کیا ہے۔ جسے وہ بغیر دودھ کے پیتے اور چینی کی جگہ مصری کا استعمال کرتے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''آپ کو معلوم ہے میں چائے کے لیے روسی فنجان کام میں لاتا ہوں، یہ چاے کی معمولی پیالیوں سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں، اگر بے ذوقی سے پیجئے تو دو گھونٹ میں ختم ہو جائے، مگر خدانخواستہ میں ایسی بے ذوقی کا مرتکب کیوں ہونے لگا۔ میں جرعہ کشاں، کہنہ مشق کی طرح ٹھہر ٹھہر کر پیوں گا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لوں گا۔''

(غبار خاطر، مولانا ابوالکلام آزاد، ص 72)

اس طرح کی اور بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں خطوط کا رنگ ڈھنگ اور مزاج ملتا ہے، ان خطوط میں مکتوب نگار نے جو کچھ لکھا بہت احتیاط سے لکھا، اور مکتوب الیہ کے بجاے تمام قارئین کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے اس لیے ان خطوط میں مضمون نگاری کا رنگ غالب آ گیا ہے۔ غبار خاطر سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''کاتب اپنے دل کے باغوں کی بہار دیکھنا چاہتا ہے۔ غبار خاطر خطوط کا مجموعہ نہیں مضامین کا مجموعہ ہے، اور مضمون نگاری کے لحاظ سے ان کا اسلوب بھی ہے۔''

(اردو ادب، آزاد نمبر)

سرور صاحب کے مطابق ابوالکلام آزاد کے بیشتر خطوط میں مندرجہ بالا خصوصیات پائی جاتی

ہیں۔غبار خاطر کو اگر توجہ سے پڑھیں تو ان خطوط میں کسی بھی موضوع پر بے تکلفی سے اظہار خیال کیا جا سکتا ہے۔ابوالکلام کے یہ خطوط، خطوط سے زیادہ انشائیہ کی صفات سے قریب ہیں۔ 15 / اگست 1942ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''کار باہر نکلی، تو صبح مسکرا رہی تھی، سامنے دیکھا تو سمندر اچھل اچھل کر ناچ رہا تھا، نسیم صبح کے جھونکے احاطہ کی روشنی میں پھرتے ہوئے ملے، یہ پھولوں کی خوشبو چن چن کر جمع کر رہے تھے، اور سمندر کو بھیج رہے تھے کہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلاتا رہے۔''

(غبار خاطر، ص22)

حکایت بادہ تریاک کے تحت 27 / اگست 1942ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''صبح جب طباشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی اور شام جب شفق کی گلگوں چادریں پھیلانے لگے گی تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں ہی سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا، قید خانوں کے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انھیں دیکھ لیا کریں گی۔ فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شادکام کرے، کسی کو محروم کر دے، جب وہ کبھی اپنے چہرہ سے نقاب اٹھاتی ہے تو سب کو یکساں طور پر نظارۂ حسن کی دعوت دیتی ہے۔''

(غبار خاطر، ص69)

اس طرح غبار خاطر کے خطوط میں انشائیہ کے بہت سے حسین مرقع مل جاتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے:

''غبار خاطر تو اس ضعف پیری کی یادگار ہے جس میں انسان اپنے خول سے باہر نکل کر انحطاط وجود کا علاج محض اظہار ونمائش سے کرتا ہے۔''

اور اس طرح اسلوب احمد انصاری نے لکھا ہے کہ:

''غبار خاطر کے خطوط میں بے ساختگی اور عصری ہمدردی اور زندگی کے تحت دست کو ہموار کر کے دل آویزی پیدا کرنے کا فقدان ہے۔''

غبار خاطر نثری کارنامہ ہے، مگر اس میں اشعار کی کثرت ہے۔ اس کا یہ سبب نہیں کہ مولانا اپنے شعر پسند طبیعت کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کی یادداشت میں خیالات وواقعات کے لحاظ سے اتنے اشعار جمع ہو گئے تھے کہ نثر کے میدان میں بھی موقع پاتے ہی بے تحاشہ سامنے آجاتے تھے۔ اور مولانا کو مفہوم کی جامعیت مجبور کرتی تھی کہ بلا تکلف اشعار سے بات کو ذہن نشین بنا دیں۔

غبار خاطر کے دو خطوط میں ابوالکلام آزاد نے خدا کی ذات سے متعلق گفتگو کی ہے۔ 9/جنوری 1943ء کے خط میں انانیت کے تصور پر روشنی ڈالی گئی ہے، انانیتی ادبیات (Egoistic Literature) کی نسبت زمانہ حال کے بعض نقادوں نے یہ رائے دی کہ وہ بہت زیادہ دل پذیر ہوں گی یا بہت زیادہ ناگوار۔ کسی درمیانی درجہ کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ انانیتی ادبیات سے مقصود تمام اُس طرح کی خامہ فرمائیاں ہیں۔

انانیت کا موضوع کوئی آسان موضوع نہیں ہے، اس موضوع پر ابوالکلام نے فلسفیانہ پہلو سے روشنی ڈالی ہے، عام تجربات پر بھی ابوالکلام نے بعض خطوط میں اظہار خیال کیا ہے اور اس میں بھی دلچسپی کا کوئی نہ کوئی فکر انگیز پہلو تلاش کر لیا ہے۔ ابوالکلام نے زاغ وبلبل، چڑیا یا چڑے کی کہانی میں ایک عام

مشاہدے کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ چائے نوشی، شغف اور اس کے جزئیات کا بیان ابوالکلام کا پسندیدہ موضوع ہے۔ 17 / دسمبر 1942ء کے خط میں اپنی پسندیدہ چائے کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''وقت وہی ہے مگر افسوس وہ چائے نہیں ہے جو طبع شورش پسند کو مستیوں کی اور فکر عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی۔ وہ چینی چائے جس کا عادی ہوں کئی دن ہوئے ختم ہوگئی، اور احمد نگر اور پونا کے بازاروں میں کوئی اس جنس گراں مایہ سے آشنا نہیں۔''

(غبار خاطر، ص 151)

چڑیا، چڑے کی کہانی میں ابوالکلام آزاد نے چڑیوں کی نفسیات کا نہایت باریکی سے جائزہ لیا ہے، اور انسان سے پرندوں کے تعلق پر روشنی ڈالی ہے۔ 15 / مارچ 1943ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے موتی آئی اور گردن اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی کہ آج ڈھکنا کیوں دکھائی نہیں دیتا، یہ اس بستی کی سب سے زیادہ خوب صورت چڑیا ہے۔ چھریرا بدن، نکلی ہوئی گردن، مخروطی دم اور گول گول آنکھوں میں ایک عجیب طرح کا بولتا ہوا بھولا پن، جب دانہ چگنے کے لیے آئے گی تو ہر دانے پر میری طرف دیکھتی جائے گی، ہم دونوں کی زبانیں خاموش رہتی ہیں مگر نگاہیں گویا ہوگئی ہیں، وہ میری نگاہوں کی بولی سمجھنے لگی ہے۔ میں نے اس کی نگاہوں کو پڑھنا سیکھ لیا ہے۔

اس بستی کے اگر عام باشندوں سے قطع نظر کر لی جائے تو خواص میں چند شخصیتیں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اب مختصراً ملا اور صوفی کا حال بھی سن لیجیے، ایک چڑا بڑا ہی تنومن اور جھگڑالو ہے، جب دیکھو زبان فرفر چل رہی ہے، اور سر اٹھا ہوا، اور سینہ تنا ہوا رہتا ہے، جو بھی سامنے آجائے دو دو ہاتھ کیے بغیر نہیں رہے گا، کیا مجال کہ ہمسایہ کا کوئی چڑا اس محلّہ کے اندر قدم رکھ سکے۔ کئی شہ زوروں نے ہمت دکھائی مگر پہلے مقابلے میں چت ہو گئے۔ ٹھیک اس کے برعکس ایک دوسرا چڑا ہے، اسے جب دیکھیے، اپنی حالت میں گم اور خاموش ہے

راکہ خبر شد خبرش باز نیامد

بہت کیا تو کبھی کبھار ایک ہلکی سی ناتمام چوں کی آواز نکال دی، اور اس ناتمام چوں کا بھی انداز لفظ و سخن کا سا نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسی آواز ہوتی ہے جیسے کوئی آدمی سر جھکائے اپنی حالت میں گم پڑا رہتا ہے، اور کبھی کبھی سر اٹھا کے ''ہا'' کر دیتا ہے۔ میں نے یہ حال دیکھا تو اس کا نام صوفی رکھ دیا۔''

(غبار خاطر، ص 225 تا 227)

اس طرح ابوالکلام نے موتی، ملا اور صوفی جیسے جیتے جاگتے کردار پیش کر کے ان چڑیوں کو عام چڑیوں سے ممتاز کر دیا، اور مخصوص ناموں سے ان کے تئیں اپنے ردعمل پر روشنی ڈالی ہے۔ اس خط میں پرندوں سے ابوالکلام کے رابطے کی نوعیت اور جزئیات نگاری لائق دید ہے۔ ایک خط غبار خاطر میں ایسا ضرور ہے جس میں ابوالکلام کی اصل شخصیت بڑی حد تک سامنے آتی ہے، 11 / اپریل 1943ء کے خط

میں اپنی بیوی کی بیماری اور انتقال کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''22/ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی ملی، جس دن تار ملا اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اُسے فوراً بمبئی بھیج دے گا، اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سیاسی کاموں میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی، وہ صورت حال سے بہت متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا، لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا نہیں چاہتا۔ تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لیے جد و جہد کرنی پڑے گی۔ اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا، میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر وسکون کے ساتھ برداشت کرلوں، اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہوسکا۔''

(غبار خاطر، ص 237)

یہ خط ایسا ہے جس میں جذبات کی فراوانی ہے اور ابوالکلام آزاد کی شخصیت کا نجی رخ دیکھنے کو ملتا ہے، بہرحال ان خطوط کو مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی غیر معمولی علمیت، دانش مندی اور ذہانت سے بہت دلچسپ اور خوبصورت بنا دیا ہے۔

تاریخ نویسی میں مکتب ادب کی اہمیت: مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط کے خصوصی حوالہ کے ساتھ

مکتوب کا شمار اردو کی غیر افسانوی اصناف میں ہوتا ہے۔ مکتوب میں روزمرہ کی چھوٹی باتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے، جن کا تعلق مکتوب نگار یا مکتوب الیہ کی ذات سے ہوتا ہے، مکتوب دلی خیالات وجذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے، اس میں وہ صداقت وخلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوسکتا، مکتوب مراسلہ اور خط ایک ہی تصویر کے مختلف پہلو ہیں، خطوط لکھنا پیغام پہنچانے کا ایک اہم ذریعہ رہا ہے۔ یہ انسانی معاشرہ کی روزمرہ کی ضرورت میں شامل ہے۔ خط میں مصنف کی ضروریات، احساسات وخیالات اور اس کی زندگی کے دیگر مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس سے نہ صرف مکتوب نگار پر روشنی پڑتی ہے بلکہ مکتوب الٰہی کی شخصیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ادبی تحریر کا کوئی خاص سخت اور مضحکہ خیز اصول نہیں ہے۔ مکتوب تین پہلوؤں سے اہم ہیں۔

ادبی، سَوانحی، تاریخی

خط میں لکھنے والے کی شخصیت جھلکتی ہے اس نے ادبی اور انشا پردازی کی وجہ سے خط کو سادہ کھانے کا درجہ دیا ہے۔ خط میں لکھنے والے کے خیالات کھل کر سامنے آتے ہیں لیکن بے چینی کے طوفان کے ساتھ لکھے گئے خط میں اصل شخصیت پردے کے پیچھے رہ جاتی ہے، تیز نظر سے دیکھا جائے تو وہ خط زیادہ اہم ہے، جس میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ لاپرواہی اور ذات پات کی تفریق تاریخ کے نقطۂ نظر سے بھی اہم ہیں مشاہیر کے خط میں ایسے اشارے یا تفصیلات ہیں جو تاریخ کی کتاب میں نہیں ملتی۔ موجودہ ماحول میں تاریخ کا مطالعہ صرف سیاسی یا درباری تاریخ تک محدود نہیں ہے بلکہ اب تاریخ کا وسیع تناظر میں مطالعہ کیا جارہا ہے اور اگر ہم درباری اور صوفی ادب دونوں کے ذریعے کسی دور کا مطالعہ کریں تو ہمیں

ڈاکٹر تبسم نگار، پی۔جی۔ڈی۔اے۔وی۔کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

اس دور کی مجموعی تاریخ مل سکتی ہے۔اگر ہم خطوط کے مجموعے کی بات کریں تو یہ خط لکھنے والے کی شخصیت، کردار اور سیاسی، سماجی اور تاریخی چیزوں کا بہترین آئینہ ہوتا ہے، جس سے انسان کی اندرونی اور بیرونی زندگی کے حالات بہتر سے زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا. خطوط لکھتے وقت آدمی بغیر کسی جھجک کے لکھتا ہے جس سے خطوط میں مذکور بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ہمیں حقیقت کی طرف لے جاتی ہیں اور اس کے ذہن کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔اس تحقیقی مقالے میں ۱۸ویں صدی کے نقشبندی صوفی مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط پر بذریعہ کلمات طیبہ روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔مرزا مظہر کے خط میں اٹھارویں صدی میں ہندوستان کی حالت، مغلیہ سلطنت کا زوال اور ایسے بہت سے واقعات کہیں اور نہیں ملتے۔اگر چہ ہمیں غالب سے اردو میں ادبی تصانیف ملنا شروع ہوتی ہیں لیکن اس سے بہت پہلے مرزا مظہر جان جاناں کی تحریروں سے ان کی شخصیت اور ان کی حیثیت پوری طرح جھلکتی ہے یہ ذرائع 18 ویں صدی کے سماج اور ثقافت اور اس وقت کی سیاست کے ساتھ ساتھ فلسفے پر ان کے خیالات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔اس لیے اس شکل میں مرزا صاحب کے خطوط کا تاریخی مطالعہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مرزا صاحب کے خطوط کا مجموعہ ''کلماتِ طیبہ'' کے نام سے مرتب کیا گیا ہے۔جو فارسی میں لکھے گئے تھے۔مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ میں "رفعت مرزا مظہر" کا قلمی نسخہ بھی موجود ہے جس میں ان کے صرف 23 خطوط ہیں۔یہ خطوط شاہ غلام علی کے مقام مظہری میں بھی شامل ہیں۔مرزا مظہر کا یہ نسخہ شائع ہوا اور بعد میں اس میں اضافہ ہوتا رہا۔مرزا صاحب کے خط کا ایک اہم نسخہ ''رفعت کرامت سعادت شمس الدین حبیب اللہ مرزا جانِ جان مظہر علوی شہید'' کے نام سے شائع ہوا، جس میں دو نئے خطوط شامل کیے گئے ہیں۔آج یہ نیشنل میوزیم، نئی دہلی میں دستیاب ہے۔ان خطوط کے ذریعے مرزا صاحب کی شخصیت اور ان کے اعہد کے بارے میں کافی معلومات ملتی ہیں۔مرزا مظہر کے خطوط فارسی زبان میں کلماتِ طیبات کے نام سے مرتب کیے گئے ہیں[۱] جسے پروفیسر خلیق انجم نے بھی ان

کے خطوط کا اردو میں ترجمہ کر کے 'مقبوضہ مرزا مظہر جان جاناں' کے نام سے مرتب کیا ہے۔[۱] ان خطوط میں مرزا صاحب نے اٹھارویں صدی کے سیاسی اتھل پتھل، معاشرے کے ہنگاموں کو بہت باریک بینی سے بیان کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان خطوط کے ذریعے ان کی اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کے عہد کی سیاسی اور سماجی زندگی کی بھی اچھی تاریخ ملتی ہے۔ ہندوستان کے صوفی نظام کی بیشتر شخصیات کی طرح مرزا مظہر بھی اشرفی خاندان کے فرزند تھے۔[۲] مرزا صاحب نے اپنے حسب نسب کے بارے میں ایک خط لکھا ہے۔

"اس خاکسار کی نسبت اٹھائیسویں صدی سے محمد بن حنیفہ کی ثالثی
سے اسلام کے چوتھے خلیفہ حضرت علی تک پہنچتی ہے"۔[۳]

ولی داغستانی نے بھی اپنی تذکیر ''ریاض الشعراء'' میں یہی لکھا ہے کہ مرزا صاحب کا تعلق سعادت علوی سے تھا[۴] مرزا مظہر کے والد کا نام مرزا جان تھا، جو شاہی خدمت میں تھے۔ لیکن وہ کسی اعلیٰ منصب پر نہیں تھا۔

مرزا صاحب کی والدہ کا تعلق بیجاپور کے شاہی خاندان سے تھا اور غالباً مرزا جان کے دکن کے زمانے میں ان کی شادی ہوئی تھی۔ مرزا جان کے شاید دو ہی بچے تھے۔ مرزا مظہر اور اس کی بہن۔ اس کی اطلاع ہمیں ان کے خط سے بھی ملتی ہے، جب مرزا صاحب نے احمد شاہ بادشاہ کے وزیر نواب انتظار الدولہ کو اپنے ہمشیرزادے کی ملازمت کے لیے خط لکھا کہ فقیر کے ہمشیرزادے ہیں۔ اگرچہ وہ کوئی کمال نہیں دکھاتا لیکن وہ انسانیت سے خالی نہیں ہے۔ اکتا جائے وقت سے پریشان ہیں۔ خوش قسمتی سے ان میں سے ایک کی حالت نازک ہے۔ وہ برخوردان جسے حکومت کی جاگیر کی بہت خواہش ہے، میں اسے کل آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔ مرزا مظہر جانِ جانان (1699) میں پیدا ہوئے، شمالی ہندوستان میں نقشبندی تصوف کی ایک بڑی شخصیت ہیں۔ ان کے والد مرزا جان نے شہنشاہ اورنگزیب کے دور میں منصبدار، ریونیو کلکٹر اور قاضی کے طور پر خدمات انجام دیں۔ ان عہدوں سے مستعفی ہونے کے بعد، مرزا دکن سے آگرہ واپس آ

رہے تھے جب مرزا مظہر مالوہ کے ضلع کالاباغ میں پیدا ہوئے۔[۵] جانِ جانان نے ابتدائی تعلیم آگرہ میں رہتے ہوئے اپنے والد کی سرپرستی میں حاصل کی۔مرزا جان نے بہت چھوٹی عمر میں اپنے بیٹے کی تعلیم کا آغاز کیا اور آگرہ میں اپنے والد سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔مرزا صاحب نے اپنے والد سے رسالہ فارسی کا محاورہ پڑھا تھا۔'عبد دہلوی رسول' سے قرآن شریف پڑھا، ان سے علم تجوید اور کرامت کی سند حاصل کی۔ والد کی وفات کے بعد آپ نے حدیث وتفسیر کا علم حاجی محمد افضل سیالکوٹی سے حاصل کیا۔مرزا جان نے نہ صرف یہ تعلیم اپنے اکلوتے بیٹے کو دی بلکہ انہوں نے مرزا مظہر کو فوجی تعلیم سے بھی محروم نہیں ہونے دیا۔اس نے مرزا مظہر کو سپاہی کے سارے کرتب سکھائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاہی سپاہیوں میں مشہور تھا اور ان سے مشورہ بھی کیا کرتا تھا۔مرزا صاحب اپنے ایک خط میں فرماتے ہیں:

> "خدا نے ہمیں عقل کامل اور ثابت رائے بلیغ عطا فرمائی ہے۔ امر سلطنت کی تدبیر اور انتظام مملکت کے سلسلے میں جیسا جس کے لئے مناسب ہوتا ہے، بتا دیتے ہیں۔ اس لئے امرائے وقت اپنے معاملات میں ہم سے صلاح ومشورہ لیتے ہیں۔اور اس پر عمل کرتے ہیں۔[۶]"

مرزا صاحب کے والد نے ان کی تربیت اور تربیت اس طرح کی تھی کہ وہ دونوں صورتوں میں تمام چالوں پر عبور حاصل کر چکے تھے خواہ وہ امیر اختیار رہو یا درویشی۔ بہر حال والد صاحب کی خواہش تھی کہ مرزا صاحب درویشی کے راستے پر چلیں۔اسی وجہ سے وہ اپنے بیٹے کو اپنے پیر ومرشد حضرت شاہ عبدالرحمٰن قادری کے پاس بھی لے جایا کرتے تھے۔جبکہ مرزا صاحب کو والد کی وفات تک تصوف کی طرف کوئی خاص میلان نہیں تھا۔لیکن بچپن ہی سے سنت کے بارے میں سخت تھے اور اس میں کوتاہی برداشت نہیں کرتے تھے۔مرزا صاحب ایک خط میں لکھتے ہیں کہ۔۔

"والد کا انتقال 1718 میں ہوا اور میں 16 سال کی عمر میں یتیم ہو
گیا۔ 20 سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے انہوں
نے صوفی زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔[۷]"

تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ نقشبندی صوفی سید نور محمد بدایونی کے شاگرد اور خلیفہ بن گئے۔ بعد میں انہوں نے روایتی اور مذہبی علوم دونوں میں اپنے وقت کے ممتاز علماء سے تعلیم حاصل کی۔ تیس سال کی عمر میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد، جانِ جانان دہلی منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے اپنا تعلیمی مرکز قائم کیا، جسے مناسب طور پر خانقاہ مظہریہ کہا جاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے آخر تک دہلی میں ہی رہے۔ مرزا صاحب کا انتقال 82 سال کی عمر میں 10 محرم 1780ء کو ایک شیعہ کی گولی لگنے سے ہوا۔ ان کی میت کو محلّہ چتلی قبر میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ وفات سے بہت پہلے ان کی صحت خراب ہو چکی تھی جس کے بارے میں وہ خود ایک خط میں لکھتے ہیں۔

" کمزوری کی وجہ سے میں خطوط کا جواب نہیں دے پا رہا ہوں۔ اب
میں نے اپنے دوستوں کو لکھا ہے کہ جواب کا انتظار نہ کریں۔ کیونکہ
اب میں بے بس ہوں اور اب مجھ میں جامع مسجد جانے کی بھی
طاقت نہیں ہے۔ اب وہ گھر بھی نہیں جاتا۔ ضرورت سے زیادہ
کمزوری کی وجہ سے اسے کئی بیماریوں نے گھیر لیا ہے۔[۸]"

ہندوستان میں 18 ویں صدی مغلیہ سلطنت کے زوال کا دور تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں کے درمیان نہ صرف خوراک کی جنگ شروع ہو گئی بلکہ خوراک کا زیاں بھی شروع ہو گیا۔ اگرچہ تخت کے لیے جنگ عام تھی لیکن یہ زمانہ یا مدت زیادہ اہم ہے کیونکہ اب تک عام لوگ بادشاہت کی جنگ میں شامل نہیں تھے اور نہ ہی اس سے مکمل طور پر متاثر ہوئے تھے۔ لیکن 18 ویں صدی میں مغلیہ سلطنت کے زوال میں عام لوگ بری طرح متاثر ہوئے۔ حالات اتنے خراب ہو چکے تھے کہ بادشاہ کے

قابو سے باہر ہو گئے تھے۔ دنیا فسادات سے بھری ہوئی تھی، کہیں بھی امن وسلامتی کا نام ونشان نہ تھا۔ لوگوں کے جان و مال، عزت وآبرو کے تحفظ کا کوئی تذکرہ یا نشان نہیں تھا۔ اور لوگوں کے اخلاق حد سے زیادہ گر چکے تھے۔ سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ معاشرے کے لوگ مذہبی، اخلاقی اور روحانی ابتری کا شکار ہو رہے تھے۔ اٹھارویں صدی میں ہندوستان کے سماجی ماحول کا اندازہ لگانے کے لیے مرزا صاحب کے خطوط پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے کیونکہ حضرت مرزا مظہر نے اپنی ساری زندگی اسی شہر میں گزاری تھی۔ اور دہلی اس وقت کی سیاست کا مرکز رہا۔ اور تبدیلی کے آثار سب سے زیادہ دہلی میں ہی نظر آئے۔ اس لیے اٹھارویں صدی میں ہندوستان کے سماجی اور سیاسی ماحول کا جائزہ لینے کے لیے مرزا صاحب کے خطوط پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ مرزا مظہر اگرچہ تارکِ دنیا تھے لیکن وہ دنیا سے باہر نہیں تھے۔ وہ معاشرے کے مسائل سے بھی آگاہ تھے، وہ خود اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"احوال شہر تا اخبار محل از فقیر پنہاں نمی ماند- آنچہ واقعیت بفقیر می رسد-[۹] "

یہ درست ہے کہ مرزا مظہر سودا، میر تقی میر وغیرہ کی طرح براہ راست سیاسی ہلچل اور ہنگاموں کی زد میں نہیں آیا لیکن اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور وہ اس قدر پریشان ہو گئے کہ ایک بار اس نے دہلی کا اقتدار چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اسے اپنے خاندان کی خاطر اپنا فیصلہ بدلنا پڑا[۱۰]۔ ان کی تصانیف میں بہت سی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے سیاسی حالات سے پوری طرح واقف تھے اور اس کے اثرات کو بھی قبول کرتے تھے۔ مثال کے طور پر، ایک خط میں، کسی کو اطلاع دی جاتی ہے کہ۔

"درین روزگار دائمی قوئی بدل راہ یافتہ- در ماہ گزشتہ قلعہ تھانیسر را کفّار سکھ بغرد متصرف شد مزو قتل و غارتو اسر

درمیاں آمد۔[۱۱]"

یہ دور شاہ عالم ثانی کے دور کا دور تھا، یہ وہ دور ہے جس کا حضرت مرزا صاحب کی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ حالات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ تمام تر کوششوں کے باوجود حالات پر قابو پانا شہنشاہ کی استطاعت سے باہر تھا۔ خزانہ خالی تھا۔ فوجیوں کی تنخواہیں کئی ماہ سے التوا میں پڑیں تھیں۔ بادشاہ کے گرد دشمنوں کا ہجوم تھا۔ غریبوں پر ظلم ہو رہا تھا، مسافروں اور راہگیروں کو لوٹا جا رہا تھا، لیکن ان کی درد بھری آوازوں اور فریادوں کو سننے والا کوئی نہیں تھا۔ سیاسی ہلچل کا اثر پورے ملک پر پڑا تھا۔ بہت سے صوبے آزاد ہو چکے تھے، جاٹ، مراٹھے اور سکھ مضبوط تھے۔ لوٹ مار سے تباہی پھیلائی گئی۔ شاہی خاندان سے لے کر عام لوگوں تک سماجی مصائب میں گھرے ہوئے تھے۔ جب ملک، شہر اور سلطنت کے یہ حالات ہیں تو ایسے بزرگ اور ایسے صوفی اپنے ملک وملت کی سیاسی اور معاشی حالت سے کیسے غافل رہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا صاب نے اپنے ایک خط میں شہزادہ غلام عسکری خان کو لکھا کہ۔

"نواب اور جاٹ نجیب خان کے درمیان صلح کے لیے شور وغوغا ہے اور دونوں طرف کے مخبروں اور سکریٹریوں سے جو معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ جاٹ راجہ بہادر سنگھ اور دلیر سنگھ ان کے مشورے کی وجہ سے روہیلوں کے ساتھ جنگ میں ہیں۔ دوستی کرتا ہے، اور نواب کا ذکر صرف نام کی خاطر کیا جاتا ہے، کیونکہ اس نے لوگوں کو اپنے سے جدا کیا اور اپنی خواہش اور صرف اپنی معیشت کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں رسوا ہو گئے۔ اس کے برے رویے کی وجہ سے کسی کو نواب پر یقین نہیں اور دوسرا یہ کہ لوگ نواب کی طرف کیوں آئے، وہ اپنی خود غرضی کے لیے مقدمات رکھتا ہے۔ آج کل مجھے کسی پر بھروسہ نہیں کہ میں اپنے عزیزوں کے خلاف کچھ لکھوں۔ یہاں

تک کہ تکلیف میں بہت کچھ لکھا ہے۔شہر کی حالت سے لے کر محل کی خبروں تک بھکاریوں سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہتی اور جو بھی حقیقت ہوتی ہے وہ بھکاری تک پہنچ جاتی ہے۔ ہر چند ماہ بعد میں نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جو کچھ نواب صاحب کرنا چاہتے ہیں وہ مجھے بتائیں لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ورنہ میں ایسی بنیاد رکھ دیتا کہ لوگ دیکھتے ہی رہ جاتے، مشکل یہ ہے کہ نواب کے تمام مشیر لالچی اور خود غرض ہوتے ہیں اور اکثر وہ ادنیٰ طبقے سے ہوتے ہیں اور جو شریفوں میں ہوتے ہیں وہ منافق ہوتے ہیں۔اس سارے جھگڑے کی جڑ آقا کی بے ایمانی ہے۔ کیونکہ نہ اس کے خیر کی کوئی امید ہے اور نہ ہی اس کے سر سے کوئی خوف، ہم ظلم کی شکایت کہاں تک کریں۔تم چونکہ آشنا اور آشنا زادے ہو، اسی لیے یہ لگاؤ، ورنہ دنیا اور اہلِ دنیا سے مجھے کیا فائدہ۔شہر کے درویش بھی نواب سے خوش نہیں ہیں۔جن کو نواب نے بہت پیسہ اور دولت دی ہے، وہ مخالفین سے مل کر نواب کے دشمن بن گئے ہیں۔اور جن درویشوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا وہ کیوں خواب دیکھنے والوں کے دل کو جلا دیں اور کیوں توجہ کریں اور استغفار قلبی کے ساتھ دعا کریں کہ قبول ہو۔نواب ہر کافر اور مومن فقیر کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے اور اپنے آپ کو کسی یادو کے گلے نہیں باندھتا تو اس فقیر کے ذمہ دار

لوگوں کو اس کی طرف سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دیکھو کیا
ہوتا ہے، خدا انصاف کرے، ظالموں پر غارت کرے اور مظلوموں
پر رحم کرے۔ السلام علیکم"

اس خط سے معلوم ہوا کہ حضرت مرزا صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی ذات سے شہر کی حالت سے لے کر محل کی خبر تک کوئی واقعہ پوشیدہ نہیں تھا۔ اپنے پیروکار مولوی ثناء اللہ سنبھلی کو کافر مرہٹوں کی مصیبتوں اور حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے وہ اس طرح لکھتے ہیں:

"ذخیرہ رکھو۔ وقت کی پابندی کے ساتھ رسم و رواج اور درسِ قطب
میں مصروف رہیں۔ ہمارے بزرگوں اور حضرت مجدد رازیؒ کی دعا
ہر روز روشنی کے بعد ضرور پڑھیں۔ اللہ سے امید رکھیں اور ہر کسی
سے ناامید رہیں۔ کفار مرہٹوں کے ہنگاموں سے مت ڈرو۔ انشاء
اللہ دوستوں کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ ان پریشانیوں سے نجات کے
لیے جتنی بار ہو سکے سورہ لِاِیلٰفِ پڑھ کر کفار کے لشکر پر اسلام کی فتح
کے لیے دعا مانگیں اور بس ہمت کی ضرورت ہے، غافل نہ
ہوں۔[۱۳]"

سکھوں کے فسادات اور لوٹ مار کے وقت کا صحیح اور صحیح نقشہ مرزا صاحب کے خط میں ملتا ہے۔ اس کے قتل اور قید کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ حضرت مولوی ثناء اللہ سنبھلی کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اس وقت دل کو شدید جھٹکا لگا۔ پچھلے مہینے کفار سکھوں نے تھانیشور
کے قلعے پر قبضہ کر لیا اور بہت زیادہ قتل و غارت اور لوٹ مار کی۔
مولوی قلندر بخش بی بی نے بچوں کو لوٹ لیا اور جان بچا کر باہر

آ گئے۔اس مصیبت کے علاوہ یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ اس
کی خوبصورتی کے باوجود کوئی اس کی مدد نہیں کرسکتا، اللہ اسے
سلامت رکھے۔[۱۴]"

واضح رہے کہ وہ اپنے قریبی عزیزوں کو بعض سیاسی معاملات کے سلسلے میں ان کی پریشانیوں کی وجہ سے صرف ان کی پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے خط لکھتے ہیں۔مولوی قطب شاہجہان پوری کو لکھے گئے خط میں اس سے اس دور کے مرہٹوں کے ظلم وستم کا ذکر کیا گیا ہے۔گری جانا جاتا ہے۔

"خدا کا شکر اور امید قوی ہے کی خدا نے ہمارے تمام دوستوں
اور اس شہر کے لوگوں کو مصیبت سے محفوظ رکھا ہے۔ سورہ
لِاِیلٰف کی تلاوت صبح وشام کیا کریں۔ اس علاقہ پر مرہٹوں
کے قبضے،قوم روہیلہ کا فرار اور قصبات و دیہات کے تاراج
ہونے کے متعلق کیا لکھوں اس کی تفصیل عزیزوں کے خطوط
سے معلوم ہوگی۔[۱۵]"

ایک اور خط میں نواب نے انتفاضہ اللہ کو بزرگوں اور فقیروں کا احترام کرنے کی ہدایت کی ہے۔ کیونکہ اگر حضرت ان دنیا دار فقیروں کو دربار کے آداب نہ سکھاتے تو اور کہاں سے سیکھ سکتے تھے۔ دنیا کے امیروں کو دنیا کے بادشاہوں یعنی فقیروں کے سامنے عزت کرنی چاہیے۔خاص طور پر اس وقت جب مدد کی ضرورت ہوتا کہ مانگنے والوں کے دل خوش ہوں۔ایسے وقت میں لاپرواہی کرنا نقصان دہ ہے۔اگر ذہن میں اچھے خیالات ہوں تو مناسب ہے اور اگر نہیں تو ان کی خدمت میں حاضر ہونا ضروری نہیں۔ان باتوں کے خوف سے میں نے ملاقات اور خط لکھنا ترک کر دیا ہے۔اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نواب اور صاحبان اپنی پریشانیوں سے نجات کے لیے حضرت سے

دعائیں اور توجہ طلب کرتے تھے اور اس عمر میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے پر مجبور تھے۔ مرزا صاحب کا عہد اور اس عہد میں آپ کے دوستوں اور رشتہ داروں کی موجودگی جو حکومت تک بہت امیر وزیر اور نواب یا صاحب تھے۔ اگر ان تمام حالات نے حضرت مرزا صاحب کو متاثر کیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان حالات میں ان کا اثر حکمرانی یا دنیاوی مصلحتوں کی بنا پر تھا یا اہل دنیا کو خوش کرنے کی وجہ سے۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ مرزا صاحب بڑے دردمند تھے، تمام جگہوں کی دیکھ بھال کرتے تھے اور دنیا والوں کو خوش وخرم دیکھنا چاہتے تھے۔ ظالم اور غیر انسانی اور عیار وعیاش اور نقارہ اور نہال حقان سے محروم تھے۔ لوگ سنت اور عبادتِ رسول سے بے نیاز تھے اور یہ ہر دیانت دار کا خاصہ ہے، پھر حضرت کی ذات کے کیا کہنے۔ اسی طرح مرزا مظہر کے مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ سرہند کو سکھوں کے ظلم وستم سے بچانے کے لیے حکومت کی طرف سے جو فوج بھیجی گئی تھی اس میں نقشبندیہ مجددیہ کے بہت سے حضرت بھی بڑی تعداد میں شامل تھے۔ جب ملا رحیم داد روہیلہ کو مجد دولہ نے سکھوں کی بغاوت کو دبانے کے لیے بھیجا تو اس نے دس ہزار کا لشکر اکٹھا کیا۔ حضرت مظہر کے مطابق ان لشکروں میں حضرت مجدد کی اولاد نے بڑا حصہ لیا۔ لیکن پھر بھی سرہند کو سکون نہ مل سکا۔ چونکہ علی محمد خان روہیلہ سرہند کے ناظم رہ چکے تھے، لہٰذا روہیل اس خاندان پر ایمان رکھتے تھے، حضرت مظہر کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ صاحبزادے بھی بریلی میں آباد ہوئے تھے۔ چنانچہ بریلی چھوڑ کر دہلی چلے گئے تاکہ حضرت مظہر کے مقام پر ٹھہریں۔[۱۶] سرہند پر سکھوں کے حملے تواتر سے ہو رہے تھے، مسلمانوں کے ہاتھوں اس دارالارشاد کو تباہ کرنے سے مرزا صاحب کو جو بے چینی محسوس ہوئی، اس کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں۔

" کفران سکھ خدا انہیں ذلیل کرے، ان کے ظلم سے متبرک شہر سرہند ویران ہو گیا ہے- اور بزرگوں کے مزارات شہید ہو گئے ہیں- اور صاحب زادگان شہر بہ شہر آوارہ پھر رہیں ہیں- ایک جماعت نے اس طرف کا قصد کیا ہے- خاص طور پر حضرت میر اسداللہ جو فقیر

سے بہت محبت کرتے ہیں تشریف لا رہے ہیں- اگرچہ اس
شہر کا حال بھی مخفی نہیں ہے۔[۱۷]"

اس سب کے بعد جب درانی نے پنجاب پر کئی حملے کیے تو سکھوں کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ نہ تو پنجاب کے طبیب اس قدر مضبوط تھے کہ اس سے فائدہ اٹھا کر امن وہم آہنگی بحال کرسکیں اور نہ ہی کسی سیاسی جماعت نے عوام کے امن وسکون کی پرواہ کی۔درانی کے واپس جاتے ہی سکھ اٹھ کھڑے ہوں گے اور کمزور مسلمان صوبیداروں کو کچل دیں گے اور حالات پھر وہی ہو جائیں گے۔اور ان تباہیوں کی شکایت صرف مسلمان ہی نہیں کرتے، کچھ سکھ بھی سکھوں کی ان تباہیوں کو بیان کرتے ہیں۔مرہٹوں کے بارے میں حضرت مظہر اور شاہ ولی اللہ دونوں کی ایک ہی رائے ہے۔اور دونوں نے ان مرہٹوں کی طرف سے لوگوں کی تباہی، لوٹ مار اور ہنگامہ آرائی کی مذمت کی ہے۔شاہ ولی اللہ کی نظر میں ان کے دور میں مسلمانوں کو جس سختی کا سامنا کرنا پڑا وہ صرف مرہٹوں کے ساتھ صلح کی وجہ سے تھا۔[۱۸] مرہٹوں کے حوالے سے حضرت مظہر کے خطوط میں ایسے بہت سے معاملات ملتے ہیں جو اس وقت کی سیاسی دھڑے بندیوں کے ساتھ ساتھ شاہ ولی اللہ کے خطوط کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔مرزا صاحب قاضی ثناءاللہ کے نام خط میں لکھتے ہیں۔

" کفار مرہٹوں کے ہنگامے سے مت ڈرو۔انشاءاللہ دوستوں
کو نقصان نہیں پہنچے گا۔مصیبتوں سے بچنے اور کفار کے لشکر پر
اسلام کی فتح کے لیے صرف دعا اور ہمت ضروری ہے۔[۱۹]"

مرہٹوں اور روحیلوں کے درمیان 1772 میں ہونے والی جنگ کا بھی مرزا صاحب کے خط سے پتہ چلتا ہے جس میں انہوں نے مرہٹوں کے ہاتھوں روہیلوں کی شکست پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔اور کہا جاتا ہے کہ مرہٹوں نے سہارنپور پر حملہ کیا جو چیتا خان کی جاگیر تھا، اور سب کچھ تباہ کر

دیا۔[۲۰] مزید یہ کہ جب مرہٹے دوسرے علاقے پر حملہ کرتے تھے۔ چنانچہ اس وقت کے اصولوں کے خلاف وہ وہاں سے نقصان کا معاوضہ لینے کے علاوہ کسانوں اور جاگیرداروں سے ٹیکس بھی وصول کرتے تھے۔ اور جہاں ان کے قدم نہ گرتے وہیں برباد ہو جاتے۔[۲۱] ان ہنگاموں اور کوششوں کے دور میں مرزا مظہر اور شاہ ولی اللہ دونوں اہم ترین شخصیات نے مسلم حکمرانی کو بچانے اور عوام میں امن قائم کرنے کے لیے دو طاقتوں میں سے احمد شاہ ابدالی اور دوسرے نجب الدولہ (روہیل) کا انتخاب کیا۔ ان دونوں قوتوں کو ملا کر اس نے ہندوستانی سیاست کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ حضرت مظہر نے قاضی ثناء اللہ کو بھی روحیل کے اس گروہ کے ساتھ دہلی آنے کی اطلاع دی۔ یہ خطوط روہیل سے اس کی قربت کو بیان کرتے ہیں۔ بہت سے مورخین ان غیر ملکی حملوں اور سیاسی کارروائیوں کی وجہ سے راستے محفوظ نہ ہونے کی تفصیلات دیتے ہیں، لیکن حضرت مظہرؒ ایک مکتوب بمقابلہ قاضی ثناء اللہ لکھتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جن علاقوں میں روحیل کا اثر تھا، وہ سڑکیں پرامن تھیں۔ اور حضرت مظہر ان راستوں سے ہی سفر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

"راہ امن راست سونپت پانی پت وکرانہ است از آنجا در عمل روہیلہ
ہا، بارہ میران پرودار انگر، بمترل مقصود می رہم۔[۲۲]"

سیاسی طور پر مرزا صاحب روہیلوں کے سکھوں، مراٹھوں اور جاٹوں کے خلاف کیے گئے اقدامات سے خوش تھے، کیونکہ اس وقت کے صوفیاء یا علمائے اکرام سبھی سلطنت مغلیہ کو اسلام پھیلانے کا ذریعہ سمجھتے تھے، اور وہ بزرگ نہیں چاہتے تھے۔ مغلیہ سلطنت کا زوال ہر حال میں۔ چنانچہ یہ صوفی کرام اپنی سطح پر اسلام کو بچانے کے لیے جو کچھ کر سکتے تھے کرتے تھے۔ لیکن جن طاقتوں کے تعاون سے وہ اپنی خواہشات پوری کرنا چاہتے تھے، انہوں نے بھی ہندوستان میں کوئی کم کام نہیں کیا۔ چنانچہ مرزا صاحب بھی ان کے اس دوستانہ پہلو سے بہت متاثر ہوئے۔ درانی اور روہیل کی فوج جب کسی علاقے میں لوٹ مار کرتی

تھی تو وہاں کے مکینوں کی حالت خراب ہو جاتی تھی۔ جب یہ خبر دہلی پہنچی تو ان دونوں بزرگوں نے اپنے خطوط کے ذریعے ان کو سمجھایا اور محتاط رہنے کو کہا لیکن یہ سب کچھ نجیب الدولہ کی زندگی تک ٹھیک تھا لیکن اس کی موت کے بعد انہوں نے جو تباہی مچائی وہ کسی دشمن قوتوں سے کم نہ تھی۔ جبکہ ان دونوں بزرگوں نے انہیں سمجھانے اور احتیاط کرنے کی بہت کوشش کی۔ شاہ صاحب مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"مسلمان ہندوستان خواہ وہ دہلی کے ہوں خواہ اس کے علاوہ کسی اور جگہ کی صدمات دیکھتیں ہیں اور چند بار لوٹ مار کا شکار ہوئے ہیں، چاقو ہڈی تک پہنچ گیا ہے- رحم کا مقام ہے، خدا کا اور اس کے رسول کا واسطہ دیتا ہوں کہ کسی مسلمان کے مال کے درپے نہ ہوں۔[۲۳]"

حضرت مظہر کے مکاتیب سے بھی روہیل کی تباہی کا پتہ چلتا ہے، اس کی مثالیں ان کے کئی خطوط میں ملتی ہیں۔

"از مطالع احوال تبا عزیزان این جا عدم قدرت بر تدارک و تلوین مزاج روہیلہ ہا کہ اصلاً محل نیستند۔[۲۴]"

حضرت مظہر کی بیوی کے پاس کچھ زمین تھی، جس میں فصل تیار تھی، کہ اچانک روہیل کے لشکر نے اسے روند ڈالا۔ مرزا صاحب کو ان کی مسلسل تباہی کی خبریں ملتی رہتی تھیں جس سے وہ پریشان ہو جاتے تھے۔ ایک خط میں قاضی صاحب ثناء اللہ کو لکھتے ہیں— ان روہیلوں کی تباہی سے فقیر کا مزاج بگڑ گیا ہے۔

"بعد از انتظار دو ماہ، از ابتدائی خریف گزشتہ بداست آمد نگاہ فوز روہیلہ ہا بر ان محال تاخت آورد- نہ خریف مانند نہ ربیع۔[۲۵]"

حضرت مظہر نے اپنے بہت سے مکتوبوں میں دہلی کے ہنگامے کو بیان کرنے کے بعد اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے دہلی سے دور امن کی جگہ تلاش کرنے کی خواہش کی۔ نادر شاہ کے حملے کے وقت دہلی کے باشندوں کی حالت کے گواہ کے طور پر تاریخ نادر شاہی کا مصنف کہتا ہے کہ

"الحال جمیع ساکنان شہر خدارا فراموش کردہ اند واز خاص وعام لباس زمانہ اختیار کردہ، بہ جائے نماز وروزہ بہ حرام وشراب خواری وغلام بازی مطلق العنان شدہ اند غرض دریں ایام- در بلند دارالخلافت شاہجہاں باداین اطوار شغیہ وافعال ناشائستہ واعمال فاصل ومفعول بدی رواج یافتہ بود کہ اگر خدانخواستہ ازیں نعمت عظمیٰ کسی محروم مانند باشد براور یختند ہامیکردند-[۲۶]"

مرزا صاحب کے مطالعہ اور اٹھارویں صدی کی سیاست کے نتیجے میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب صوفیانہ زندگی گزار رہے تھے، دنیا سے لاتعلق رہے، لیکن وہ ان ہنگاموں اور قیاس آرائیوں سے بھی بچ نہ سکے۔ ہاں یہ بات یقینی ہے کہ وہ اپنے ہم عصر صوفیوں کی طرح اس کے آگے سرنگوں نہیں ہوئے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان جیسا حساس دل ودماغ رکھنے والا شخص ان ہنگاموں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ مرہٹوں، سکھوں کے حملوں اور سرہند کی تباہی سے خاصے متاثر تھے۔ عقیدت مندوں کے اصرار پر وہ دہلی سے بحفاظت نکل گئے، لیکن جب دہلی آنے کا ذکر آیا تو اس جگہ کی حالت کے بارے میں کہا جاتا ہے، کہ دہلی میں ہر طرف فساد اور فساد پھیل رہا ہے۔ اور اللہ سے دعا کرتے رہیں کہ وہاں امن قائم ہو۔ وہ سیاست میں دھڑے بندی کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اور جہاں تک وہ لوگوں کو اپنے الفاظ اور نصیحت سے نواز سکتا تھا، اس نے کیا۔ اور عام لوگوں کی عوامی زندگی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے مرزا صاحب ایک طرف تو اس وقت کی سیاست سے متاثر تھے، لیکن دوسری طرف انھوں نے اپنے مشوروں اور مشوروں سے سیاست کو متاثر کرنے کی کوشش بھی کی۔

حواشی:

۱ کلماتِ طیبہ، 1891، لاہور

۲ شاہ غلام علی دہلوی، مقام مظہری، ص:26۔

۳ کلماتِ طیبہ، خط نمبر-1۔

۴ ولے داغستانی، ریاض الاشعر، ص:405۔

۵ کلماتِ طیبہ، خط نمبر-57۔

۶ شاہ غلام علی دہلوی، مقام مظہری، ص:15۔

۷ ایضاً، ص:38۔

۸ خالق انجم، مرزا مظہر جان جاناں اور ان کے خطوط، خط نمبر 1۔

۹ کلماتِ طیبات، ص:47۔

۱۰ ایضاً۔

۱۱ کلماتِ طیبات، ص: 52۔

۱۲ ایضاً۔

۱۳ کلماتِ طیبات، ص:26۔

۱۴ خلیق انجم، مرزا مظہر جان جاناں اور ان کے خطوط، مکتوب 25۔

۱۵ کلماتِ طیبات، مکتوب 31۔

۱۶ تبرک علی، مرزا مظہر جان جاناں اور ان کے اردو کلام، ص:101۔

۱۷ عبدالرزاق قریشی، مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام، ص:83۔

۱۸ ایضاً، ص:12-13۔

۱۹ نظامی، سیاسی مکتوبات (بمقابلہ آصفزہ) ص:143۔

۲۰ خالق انجم، مرزا مظہر جان جان اور ان کا خطوط، ص:25۔

۲۱ کلمات طیبات، ص:50۔

۲۲ واردتہرانی، نادرنامہ، ص:91-96۔

۲۳ عبدالرزاق قریشی، مکاتیب مرزا مظہر جانان جان، ص:35۔

۲۴ خلیق احمد نظامی، شاہ ولی اللہ کی سیاسی تصانیف، ص:104-105۔

۲۵ عبدالرزاق قریشی، مکاتیب مرزا مظہر جان جاناں، ص:3۔

۲۶ واردتہرانی، تاریخ نادرشاہی، ص:42۔

خطوط غالب کی ادبی اہمیت

ادبی لحاظ سے عالمی سطح پر ادیبوں اور فنکاروں کی ایک فہرست تیار کی جائے تو اس فہرست میں غالبؔ کا شمار ضرور ہوتا ہے۔ بالخصوص اردو نثر کی نشو نما میں میر امن، غالبؔ اور سرسید کا نام بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ ادبی حیثیت سے غالبؔ کی شہرت و عظمت کا اعتراف سبھی نے کیا ہے۔ آج بھی اردو ادب میں آپ کی مقبولیت کا پرچم بلند ہے۔ ایک مفکر کا کہنا ہے کہ

''کسی فن پارے پر سو برس گزر جائیں اور وہ تب بھی پڑھا
جاتا ہے تو یہ اس کی عظمت کی دلیل ہے۔''

اردو ادب میں جہاں غالبؔ کی شاعرانہ عظمت اور مقبولیت کا پرچم آسمان کو چھو گیا وہاں ان کی نثر نگاری بھی اپنا کوئی نظیر نہیں رکھتی۔ اردو نظم و نثر دونوں ہی غالبؔ کے احسان سے گراں بار ہیں۔ شاید ہی کسی فنکار کو ان دونوں میدانوں میں ایسی حاکمانہ قدرت حاصل رہی ہو۔ جیسی غالبؔ کو تھی۔ ایک قابل فنکار کے لئے اپنے عہد کے ماحول کی عکاسی کرنا شاعری میں بڑا دشوار ہوتا ہے۔ مگر اس کی تکمیل نثر کے ذریعہ ہوسکتی ہے۔ غالبؔ نے نثر کے میدان میں جو طبع آزمائی کی ہے۔ اس کی ایک وجہ اپنے عہد و ماحول کی تصویر کو پیش کرنا ہے۔ حالانکہ غالب نے اپنا دل بہلانے، وقت گزاری کرنے اور دوستوں کو خوش کرنے کے لئے مکتوب نگاری کے شغل کو اپنایا۔ مگر ان کا یہ عمل اردو نثر کی ترقی و ترویج کا باعث ہوا۔ غالبؔ کے خطوط ہمیں غالبؔ کے نجی واز دواجی زندگی کا پتا دیتے ہیں تو کہیں اپنے عہد و ماحول کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ وقار عظیم اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

''غالبؔ کے خط جتنے زیادہ ان کے عہد کے سیاسی تہذیبی اور
معاشرتی انقلاب کی دلکش روادر ہیں۔ اس سے بھی زیادہ لکھنے
والے کی زندگی کا آئینہ ہیں۔ اس آئینے میں غالبؔ کی بھر پور

سراج انور محمد میراں، پی ایچ ڈی اردو اسکالر، شعبہ اردو، سوامی رامانند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی ناندیڑ

زندگی کا عکس دکھائی دیتا ہے۔''

غالبؔ اگر شاعری نہ بھی کرتے تو ان کا نثری سرمایہ جو مکتوب نگاری کے احاطہ کو وسیع کرتا ہے ان کے نام نامی کو تا ابد زندہ رکھتا۔ غالبؔ نے مکتوب نگاری میں جو طرز تحریر ایجاد کیا۔ وہ گویا آج بھی خراج تحسین وصول کر رہا ہے۔ مولانا حالی نے یادگار غالبؔ میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ۔:

''مرزا کی اردو نثر کے قدردان بہ نسبت ناقدردانوں کے ملک میں
بہت زیادہ نکلیں گے۔''

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ:

''خاکم بدہن اگر دیوان غالبؔ نہ ہوتا اور صرف خطوط غالبؔ ہوتے
تو بھی غالبؔ غالبؔ ہی ہوتے۔۔۔۔''

غالبؔ کو خود اپنی خطوط نویسی پر بڑا ناز تھا۔ وہ اپنی اہمیت سے خود واقف تھے۔ اور جس طرز تحریر کے وہ موجد تھے اس کا اعتراف وہ خود بھی کرتے تھے۔ انہیں اس بات پر غرور نہیں بلکہ ناز تھا۔ اس لئے انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

''میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا
ہے۔۔۔''

مرزا غالبؔ کے اردو مکاتیب ادبی حیثیت سے ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ یہ گویا ہمارے ادب کا سرمایہ ہیں۔ غالبؔ کی اردو مکتوب نگاری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ غالبؔ نے ۱۸۴۸ء سے اردو میں خط لکھنا شروع کیا۔ غالبؔ نے اردو میں خطوط نویسی کیوں شروع کی؟ جب کہ ان کو فارسی دانی پر بڑا ناز تھا۔ اس سوال کے جواب میں غالباً یہ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۰ء میں غالبؔ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کئے گئے تھے۔ اور 'مہر نیم روز' اور فارسی تاریخ لکھنے میں منہمک تھے۔ فارسی مکتوب نگاری کے لئے وقت درکار تھا۔ اردو خطوط فارسی کے مقابلے زیادہ آسان سمجھے جاتے تھے۔ غالبؔ کی زندگی کے آخری ایام میں فارسی

مکتوب نگاری کا چلن قریب قریب ختم بھی ہور ہا تھا اور انہیں یہ بے وقت کی راگنی معلوم ہونے لگی تھی۔اس لئے غالب نے اردو میں خط و کتابت شروع کی۔ اردو خطوط نویسی کے سلسلے میں بعض نقادوں نے غالبؔ کے تعلق سے یوں کہا ہے۔

''۱۸۵۰ءتک غالب فارسی میں خط لکھا کرتے تھے۔اس سال میں بہادر شاہ ظفر نے ان کو تاریخ نویسی کی خدمت سپرد کی۔ وہ فارسی تحریر میں بڑی محنت اور کاوش سے لکھا کرتے تھے۔ اس تاریخ کے ساتھ خطوط فارسی پر بھی محنت کرنا دشوار تھا۔اس لئے اردو ہی میں خط و کتابت شروع کر دی۔''

اویس احمد ادیب لکھتے ہیں۔

''مرزا نے اردو خطوط نویسی کی طرف توجہ کیوں کی! اس لئے کہ ان کو فارسی میں تاریخ لکھنا تھی۔اور فارسی میں خطوط لکھنے کی زیادہ مہلت بھی۔ دراصل یہ مجبوری تھی جس نے غالبؔ سے اردو میں خطوط لکھوائے۔''

شیخ محمد اکرام صاحب رقم طراز ہیں۔

''جب ۱۸۵۰ء میں تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور ہوئے اور ان کے پاس اس قدر وقت نہ رہا تو انہوں نے اردو میں مراسلت نگاری شروع کی۔۔۔''

غالبؔ کے خطوط ۱۸۲۹ء سے ۱۸۴۸ء تک کا احاطہ کرتے ہیں۔غالبؔ شناسوں نے برسوں کی چھان بین سے جو معلومات فراہم کئے ہیں۔ وہ اردو تحقیق کے لئے ایک بڑا سرمایہ ہے۔مولانا حامد حسن قادری نے برسوں پہلے غالبؔ کے اردو خطوط کی تعداد تقریبا ۸۲۵ بتائی تھی۔ کاظم علی خان کے بیان کے مطابق غالبؔ کے ۸۷۳ مطبوعہ اردو خطوط ہیں۔

خطوط غالبؔ کا پہلا مجموعہ عود ہندی کے نام سے منظر عام پر آیا۔ یہ مجموعہ غالبؔ کی وفات سے قبل شائع ہوا۔ اور دوسرا مجموعہ اردوئے معلیٰ ان کی وفات کے بعد مکمل ہوا۔ اردوے معلیٰ کے بعد رقعات کے متعدد مجموعے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔ اور ایک دور تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ غالبؔ کے خطوط کے مجموعے کو مکاتیب غالب۔ نادرات غالبؔ۔ ادبی خطوط غالبؔ کے خطوط وغیرہ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ جواد بی حیثیت سے اپنی مثال آپ ہیں۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے عود ہندی کے مطالعے کے بعد اپنی رائے یوں قائم کی ہے کہ ''غالبًا اردو زبان میں تحریر اختیار کرنے کو مرزا نے اول اول اپنی شان کے خلاف سمجھا ہوگا۔ مگر بعض اوقات انسان اپنے جس کام کو حقیر اور کم وزن خیال کرتا ہے وہی اس کی شہرت اور مقبولیت کا باعث ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔''

غالبؔ کے خطوط اردو ادب کا وہ عظیم سرمایہ ہیں جو آپ کے نام کو نہ صرف تا ابد زندہ رکھتا ہے بلکہ اردو نثر کے میدان کو وسیع کرتا ہے۔ حالانکہ خط دو اشخاص کے درمیان راز و نیاز کی باتوں کو پوشیدہ و مبہم رکھتا ہے۔ خط کا یہ مطلب تو نہیں کہ راز افشاں ہو جائے۔ اس لئے غالبؔ نے بھی اپنے خطوط کی اشاعت پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ ۱۸۵۸ء کے ایک خط سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ منشی شیونرائن آرام کو لکھتے ہیں۔

> ''اردو کے رقعات جو آپ چھاپنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی زائد بات ہے کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخن وری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر، کیا ضرور ہے کہ آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان رقعات کا چھاپا جانا میرے خلاف طبع ہے۔۔۔۔۔''

منشی شیونرائن آرام نے غالبؔ سے ان کے خطوط کی اشاعت کی بات ایک خط کے ذریعے کی

تھی۔جس کے جواب میں مرزا غالبؔ نے مندرجہ بالا خط لکھ کر اپنے خطوط کی اشاعت کے بارے میں خلاف رائے دے دی۔لیکن غالبؔ کے شاگرد اور دوستوں کا اسرار بڑھتا گیا۔تو غالبؔ نے ناپسندیدگی کے ساتھ ساتھ خطوط کی اشاعت کے سلسلے میں اپنی رضامندی دی۔اس سلسلے میں تفتہ کے خط کے جواب میں غالبؔ کا ایک خط ملتا ہے۔لکھتے ہیں۔

''رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔
لڑکوں کی ضد نہ کرو۔
اگر تمہاری اس میں خوشی ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو تم کو
اختیار ہے۔
یہ امر میرے خلاف رائے ہے۔۔۔۔"

غالبؔ کے خطوط منظر عام پر آنے سے قبل اردو میں مکتوب نگاری کی با قاعدہ طور پر کوئی روایت موجود نہیں تھی۔غالبؔ کے خطوط جہاں اردو میں فن مکتوب نگاری کا آغاز کا موجب بنے وہیں اردو میں با قاعدہ طور پر آسان اور سادہ ادبی نثر لکھنے کی روایت قائم ہوئی۔ جب کہ اس دور میں اردو نثر کا رواج عام نہیں تھا۔عام طور پر فارسی زبان غالب تھی۔ یہاں تک کہ اردو زبان پر بھی فارسی زبان کا اثر غالب تھا۔اس لئے اس دور کی نثر مسجع و مقفیٰ اور پر تکلف عبارت سے معمور تھی۔ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ

''اردو کے ادیبوں نے جس طرح ادب کی دوسری صنفوں
میں فارسی کا سہارا لیا تھا۔ وہاں خطوط کے سلسلے میں بھی اس
سے کافی مدد لی۔اس تقلید کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشکل پسندی جو فارسی
خطوط کا طرہ امتیاز تھیں۔ اردو مکتوب نگاری کا بھی جز و بن
گئی۔''

حالانکہ فورٹ ولیم کالج کا قیام ایک مقصد کے تحت ہوا تھا مگر اس کالج کی نسبت سے اردو زبان میں سادگی پیدا ہوئی۔ اور عام فہم اردو نثر کا آغاز ہوا۔ لیکن اردو پر فارسی کا اثر ہنوز باقی تھا۔ غالبؔ نے اپنے خطوط کے ذریعہ سادگی اور سلاست کی اس تحریک کو سہارا دیا۔ آگے چل کر اس تحریک نے ترقی کی اور جدید نثر کا یہ رجحان نہ صرف مقبول ہوا بلکہ اس نے ایک مستقل روایت کی صورت بھی اختیار کر لی۔ غالبؔ نے عام فہم اور سادہ زبان کے استعمال کے ساتھ فن اور فکر کو بھی ملحوظ رکھا۔ اس اعتبار سے غالبؔ کے خطوط کی اہمیت اردو ادب میں مسلم ہے۔ غالب کی شاعرانہ فطرت تو اپنی مثال آپ ہے مگر نثر نگاری میں آپ کے خطوط کا سرمایہ بھی کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ اردو ادب کو غالب صرف اپنے خطوط کا سرمایہ دے جاتے تب بھی آپ کی مقبولیت تا ابد غالب ہی رہتی۔ غالبؔ خط لکھنے کے اس قدر عادی تھے کہ خط نویسی ان کا مشغلہ بن گئی تھی۔ آپ کی زندگی میں کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ جس دن انہوں نے خط نہیں لکھا ہو۔ اور کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ قاصد نے ان کے گھر پر دستک نہ دیا ہو۔ خط و کتابت کے سلسلے میں آپ اس قدر مقبول تھے کہ اگر دنیا کے کسی گوشہ سے بھی خط لکھا جائے اور اس پر صرف غالبؔ دہلی کا پتا لکھا جائے تو وہ خط آپ کے یہاں ضرور پہنچ جاتا حالانکہ مرزا غالب نے اپنے عزیزوں دوستوں کو خوش کرنے اور اپنا دل بہلانے کے لئے مکتوب نگاری کے مشغلہ کو اپنایا تھا۔ مگر غالبؔ کے یہی خطوط ان کا ادبی سرمایہ بن گئے۔ ان خطوط کی فراوانی اس قدر ہے کہ ان کا گھر گھر نہیں بلکہ خطوط کا دفتر نظر آتا ہے۔ لکھتے ہیں

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا

اردو خطوط نویسی میں غالبؔ نے ایک انوکھے طرز کی ابتداء کی اور اس انوکھے طرز کو اردو ادب میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں۔

''مرزا کی اردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔
نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان

کے بعد کسی سے پوری پوری تقلید ہوسکی۔۔۔۔۔۔''

اس جدید طرز تحریر کے متعلق مرزا غالبؔ میر مہدی مجروح کے نام خط میں لکھتے ہیں۔اوراس طرز تحریر کی تصدیق کررہے ہیں کہ

''کیوں سچ کہو،اگلوں کے خطوط کی یہی طرز تھی۔۔۔۔؟''

غالبؔ کے تقریباً سبھی خطوط ایسے ہیں جو لطف سے خالی نہیں ان خطوط میں جو چاشنی ہے۔ یہ انہیں کا حصہ ہے انہوں نے جو کچھ بھی لکھا جس کو بھی لکھا وہ نہایت انہماک اور لگن کے ساتھ لکھا ہے۔شہناز انجم نے لکھا ہے کہ

''غالب کی نثر ہلکی پھلکی اور لطیف ہوتی ہے۔''

غالبؔ کی اپنی یہ خاص خصوصیت اور ان کا وہ جدید پن ہے کہ انہوں نے مکتوب نگاری میں وہ فن تحریر ایجاد کیا ہے جو بے نظیر ہے۔غالبؔ نے خط کو خط نہیں بلکہ ملاقات کا ذریعہ سمجھا ہے۔ اور پھر وہ انداز ایجاد کا جو ہجر میں وصل کا پیغام دیتا ہے۔رندؔ کا شعر ہے۔

تصور مجھے خط کا دن رات ہے۔
کہ مکتوب نصف الملاقات ہے۔

غالبؔ کے خطوط ان کی شخصیت کا آئینہ نظر آتے ہیں دلی کی نکھری صاف ستھری اور روزمرہ کی زبان میں غالبؔ اپنے مکتوبات میں بات چیت کرتے نظر آتے ہیں۔وہ خطوط سے وہی کام لینا چاہتے تھے۔جو عام طور سے گفتگو سے لیا جاتا ہے۔اپنی تنہائیوں کا حل انہوں نے خطوط میں تلاش کرلیا تھا۔ان خطوط کو غالب روحانی اور جذباتی تسکین کا ذریعہ سمجھتے تھے۔کسی کے خط کو پا کر انہیں جو مسرت ملتی تھی اس کا اندازہ اپنے دوست کو لکھے ہوئے اس خط کے اس جملے سے ہوتا ہے۔

''تمہارے خط کے آنے سے وہ خوشی ہوتی ہے جو کسی دوست
کے دیکھنے سے ہو۔''

تفتہ کو لکھتے ہیں۔

''میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں۔یعنی جس
کا خط آیا۔ میں نے جانا وہ شخص تشریف لایا۔خدا کا احسان ہے کہ
کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں
آرہتے ہوں۔۔۔دن ان کے پڑھنے میں اور جواب لکھنے میں گزر
جاتا ہے۔''

دراصل غالبؔ کی مکتوب نگاری کا آغاز کسی خاص مقصد کی طرف نشاندہی نہیں کرتا۔مگر مرزا غالبؔ کو مکتوب نگاری کے اس مشغلے سے اتنا لگاؤ ہوا کہ آخر میں اس مشغلے نے تفریحی شکل اختیار کر لی۔ خط کے تحریر کرنے میں بھی انہوں نے تاخیر نہیں کی۔اس سلسلے میں اس قدر پابند رہے کہ خطوط آنے سے پہلے ان کے یہاں جوابی خط موجود رہتے۔مثلاً شطرنج کا کھلاڑی چال چلنے سے پہلے یہ ضرور سوچتا ہے کہ اس کے مخالف کی اگلی چال کیا ہوسکتی ہے اور اس کے جواب میں وہ پھر کوئی چال چل سکتا ہے۔اسی طرح غالبؔ بھی جوابی محل لکھنے سے پہلے یہ ضرور سوچتے کہ مکتوب الیہ ان کے خط کے جواب میں کیا لکھے گا اور ان کو جواب میں کیا لکھنا ہے۔جس کا ذکر انہوں نے اپنے کلام میں بھی کیا ہے۔لکھتے ہیں۔

قاصد کے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

غالب کے خطوط کی انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے جدید طرز تحریر سے بالکل بے نظیر نظر آتے ہیں خطوط نگاری کی قدیم روایت کا خیال نہ کرتے ہوئے وہ مقصد تحریر پر اتر آتے ہیں۔آپ کا یہ انوکھا پن اردو مکتوب نگاری میں اپنی مثال آپ ہے۔لکھتے ہیں

''میرا طریقہ یہ ہے کہ جب خط لکھنے کے لئے قلم کاغذ اٹھاتا ہوں تو
مکتوب الیہ کو کسی ایسے لفظ سے جو اس کی حالت کے موافق ہوتا

ہے۔ پکارتا ہوں۔۔۔اور اس کے بعد ہی مطلب شروع کر
دیتا ہوں۔القاب وآداب کا پرانا طریقہ شکر وشکوہ، شادی غم کا
قدیم رویہ میں نے بالکل اٹھا دیا ہے۔''

غالبؔ کا یہ کہنا کہ القاب وآداب کو میں نے بالکل ترک کر دیا ہے کبھی کبھی غلط بھی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ غالب کے ایسے کئی خطوط ہیں جہاں پر انہوں نے القاب وآداب کو خوش رکھا ہے۔ مثلاً ''میری جان، صاحب برخوردار، بھائی جان، راحت جان، جان من وغیرہ۔۔''عظیم شخصیتوں کو بڑے طویل اور تصنع سے بھر پور القاب سے مخاطب ہوتے ہیں جیسے۔''سبحان اللہ تعالی شانہ ما عظم برہانہ، جناب مستطاب نواب میر غلام بابا خاں بہادر۔۔۔اکثر خطوط میں غالب القاب کو نفی کر کے لکھتے تھے۔جیسے میر سرفراز احسن کو لکھتے ہیں۔

''میری جاں کے چین مجتہد العصر میر سرفراز احسین۔''

نواب یوسف مرزا کو لکھتے ہیں۔

''میری جان خدا تیرا نگہبان۔''

غالبؔ نے القاب کو پوری طرح ترک تو نہیں کیا۔ بلکہ اسے مختصر کر دیا ہے۔اور تصنع کے بجائے ایک فکری انداز پیدا کیا ہے۔غالبؔ سے پہلے اکثر وبیشتر خطوط کی شروعات گویا باہمی خیریت کے ایک طویل جملے کی روایت سے ہوتی تھی۔اس طرز کو غالب نے بالکل ترک کر دیا اور صرف مقصد پر اتر کر مقصد کی باتیں کیں۔ان کے خطوط کی عبارت سے لگتا ہے کہ ہے وہ جیسے گل افشانی کر رہے ہیں۔ان خطوط کے متعلق مولانا آزاد دہلوی لکھتے ہیں۔

'' ان خطوں کی طرز عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے۔
ظرافت کے چٹکلے اور لطافت کی شوخیاں اس میں خوب ادا
ہوسکتی ہیں۔۔۔۔۔''

غالبؔ کے زمانے میں مکتوب نگاری کا جو معیار تھا۔اس میں لمبے چوڑے القاب وآداب کے علاوہ خاص عبارت آرائی بھی کرنی پڑتی تھی۔اردو مکتوب نگاری کے لئے غالبؔ نے بلخصوص عام بول چال اور روز مرہ کی زبان استعمال کی۔ اپنی گفتگو کو معنی خیز اور شگفتہ بنانے کے لئے کبھی کبھار تشبیہات اور استعارے سے بھی کام لیا کرتے تھے۔ بالخصوص نثر میں قافیہ ردیف کا استعمال گویا آپ کا خیال ہی نہیں بلکہ کمال تھا۔ مذکورہ بالا ان خطوط میں آرائیاں نمایاں گراں، ارزاں، ڈھنگ رنگ، سلام پیام اس طرح کے الفاظ کا استعمال گویا غالبؔ کے تمام خطوط اس انداز کے نہیں ہیں بلکہ موقع ومحل کے اعتبار سے تخاطب کا انداز اختیار کرتے ہیں۔یہی سادگی وخلوص خط کے اختتام میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔خط کے آخر میں عموماً وہ اپنا نام تحریر کرتے ہیں۔مثلاً نجات کا طالب غالبؔ، علائی کے دیدار کا طالب غالبؔ، غالب علی شاہ اسداللہ مضطرب وغیرہ غالب کے خطوط کا زیادہ تر دارومدار درمطلب نویسی پر ہے۔۱۸۵۵ء کے ایک خط میں غالب قاضی عبدالجمیل جنوں کو لکھتے ہیں۔

> ''دوسرا سبب یہ کہ شوقیہ خطوط کا جواب کہاں تک لکھوں اور کیا لکھوں! میں نے آئین نامہ نگاری چھوڑ کر مطلب نویسی پر مدار رکھا ہے۔جب مطلب ضروری التحریر نہ ہوتو کیا لکھوں؟''

غالبؔ کی زندگی کا بیشتر حصہ پریشان حالی میں گزرا۔فکر معاش، تنگ دستی، پریشان حالی، عزیز واقارب اور دوستوں کی داغ مفارقت کے باعث غالبؔ اکثر فکر وافکار کی دنیا میں منہمک رہے۔ان پریشان کن حالات کے باوجود بھی غالبؔ اپنی شوخی وظرافت اور بے تکلفی سے باز نہیں آتے تھے۔غرض یہ کہ وہ ایک ہنگامی زندگی کے طالب تھے۔غالبؔ کے خطوط کی سب سے اہم خصوصیت صداقت اور بے تکلفی ہے۔بقول عبادت بریلوی

> ''غالبؔ کے خطوط کی یہ بنیادی اور سب سے اہم خصوصیت ہے کہ ان میں بے پناہ خلوص اور بے انداز صداقت ہے''

غالبؔ کے خطوط میں صداقت اور خلوص ہونے کی وجہ سے ان خطوط میں ہمیں ایک مانوس فضا دیکھنے کو ملتی ہے۔ غالبؔ نے ان خطوط میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ خیالات ہمیں اپنے نظر آتے ہیں۔ غالبؔ ایک ذہین انسان تھے۔ ان کے خطوط میں عام فہم اور آسان زبان کا استعمال ہی نہیں بلکہ روز مرہ کے محاوروں کا استعمال بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف اسالیب کا استعمال ان کے خطوط کو دوسروں سے مختلف رکھتا ہے۔ مرزا غالبؔ کے خطوط ادبی تخلیق کے لئے ایک بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ فن، اسلوب، مواد، موضوع، کے اعتبار سے ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ان خطوط میں غالب کی زندگی کا ہر پہلو اور ان کے مزاج کی ہر خصوصیت موجود ہے۔ ان کی شخصیت میں خلوص وصداقت، بے تکلفی، برجستگی اور بے باکی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ غالبؔ نے ان خطوط میں دو باتیں کہیں ہیں۔ وہ ان کی آپ بیتی ہے۔ لیکن ان خطوط کو پڑھنے والا جب اس میں اپنے آپ کو دیکھتا ہے تو وہ جگ بیتی بن جاتی ہے۔ غالبؔ نے زندگی کو ہر پہلو سے دیکھا ہے۔ اور ان کا یہ فلسفہ رہا ہے کہ غم ہی زندگی کا ساتھی ہے۔ حالانک غم انفرادی ہوتا ہے۔ لیکن غالبؔ کے یہاں غم انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی معلوم ہوتا ہے۔

خطوط غالبؔ کے موضوعات مختلف ہیں۔ ان خطوط میں ان کی شخصیت سے متعلق عام باتیں موجود ہیں۔ پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات وواقعات کا اندازہ ان کے خطوط سے لگایا جاسکتا ہے۔ بچپن کے حالات تعلیم وتربیت، شادی اور اس کے اثرات مالی الجھنیں اور پریشانیاں، پنشن اور اس کی ساری تفصیلات اس سلسلے میں دور دراز کا سفر غرض ان کے نجی معاملات کے علاوہ، دلی کے حالات، قید کا واقعہ، غدر کا ہنگامہ اور اس دور کے عام سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی کے علاوہ قدیم تہذیبی اقدار کا زوال، در باروں کی حالت مغل سلطنت کی کمزوری اور انگریزوں کی ظلم اور ان کی طاقت علمی اور ادبی، سیاسی تحریکوں کا عام زندگی پر اثر، شاعرانہ ماحول کی خصوصیات اسی طرح دیگر معاملات وسائل ہیں جن کے مرقعے ہمیں غالبؔ کے خطوط میں مل جاتے

ہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں۔

'' ان خطوں میں غالبؔ چلتے پھرتے ہنستے بولتے، ملتے جلتے،
شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے۔علمی وادبی بحثوں میں شریک
ہوتے اورزمانے کو دیکھتے اور سمجھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔''

مرزا غالبؔ کے مزاج کی ایک بڑی خوبی شوخی وظرافت تھی۔اس لئے حالی نے انہیں ''حیوان ظریف'' کا خطاب دیا ہے۔ان کا مقصد اس طرف اشارہ کرنا تھا کہ غالبؔ اپنے اکثر فقروں اور عبارتوں میں کوئی نہ کوئی لطیف نکتہ ضرور پیدا کرتے ہیں۔اور مجید ومضامین میں خوشی اور ملنگی کی لہر دوڑا دیتے ہیں۔ اس طرح کی شوخی اور شگفتگی کی مثال ان کی شاعری میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔مثلاً

مئے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجئے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

غالبؔ کی شوخی وظرافت نے ان کی تحروں میں جان پیدا کردی ہے۔خصوصاً ان کے خطوط ان کی لازوال شوخی وظرافت اور بذلہ سنجی کا نمونہ نظر آتے ہیں۔بات میں بات پیدا کرنا غالبؔ خوب جانتے تھے۔یہاں تک کہ بغیر شوخی کے وہ بات کر ہی نہیں سکتے تھے۔غالبؔ کی شوخی کے متعلق مولانا حالی نے لکھا ہے۔

"مرزا کی طبیعت میں شوخی اس طرح بھری ہوئی تھی جس طرح
ستارے کے تار میں سر کھرے ہوتے ہیں۔اور قوت متخیلہ جو شاعری
اور ظرافت کی خلاق ہے۔اس کو مرزا کے دماغ سے وہی نسبت
ہے۔جو طائر کو پرواز کے ساتھ۔''

شوخی اور شگفتگی کا انداز غالبؔ کے خطوط میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔یہ شوخی وشگفتگی بسا اوقات خطوط میں لطیفہ سنجی کی خصوصیت پیدا کردیتی ہے۔مرزا کی ظرافت کا انداز بڑا دلچسپ اور موثر

ہے۔ بڑے ہی معصومانہ انداز میں اپنے دل کی بات کہہ جاتے ہیں۔ میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا۔ اس طرف سے خاطر جمع
رکھنا رمضان کا مہینہ روزہ کھا کھا کر کاٹا آئندہ خدا رزاق ہے۔
کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔۔۔۔۔ تو پھر کیا غم ہے؟''

میر مہدی مجروح غالبؔ کے شاگرد ہی نہیں بلکہ اچھے دوست بھی تھے۔ غالبؔ مجروح سے اس قسم کا مذاق کیا کرتے تھے۔ یعنی مزاحیہ انداز میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ اپنی زندگی کے غم انگیز پہلوؤں کو طنز و ظرافت کے ذریعہ اپنے دوستوں کے لئے تفریح کا ذریعہ بناتے ہیں۔ جہاں کوئی غم انگیز مضمون ادا ہوا ہے۔ وہاں بھی وہ تفریح کا کوئی پہلو نکال لیتے ہیں۔ ایک دوسرے خط میں منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں۔

''روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلائے رہتا ہوں۔ کبھی پانی
پی لیا۔ کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم اور
طرفہ روش رکھتے ہیں میں تو روزہ بہلاتا رہتا ہوں اور یہ
صاحب فرماتے ہیں۔ کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ
روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔۔۔''

یہی وہ شوخی شگفتگی ہے۔ جو غالب کے خطوط میں لطیفہ سنجی کی خصوصیت پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن غالب اس لطیفہ سنجی میں بھی حفظ مراتب کا خیال رکھتے تھے۔ اپنے ایک دوست کے خط میں دوست کی بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''کیوں بھئی! اگر ہم کو لے آئے بھی تو تم کو کیوں کر دیکھیں
گے؟ کیا تمہارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی

ہیں۔۔۔''

غالبؔ کی یہ شوخی اور شگفتگی ان کے خطوط میں ایک نیا انداز پیدا کرتی ہے۔خطوط کے مطالعہ سے یہ پتا چلتا ہے یا یہ محسوس ہوتا ہے کہ شوخی وظرافت ان کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔مرزا غالبؔ کی ظرافت کے متعلق عبدالغنی فاروقی صاحب لکھتے ہیں۔

''مرزا نے جس ظرافت کو اپنے خطوط کے ذریعے فروغ دیا وہ بلاشبہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اردو ادب میں پہلی چیز ہے۔مرزا کی نجی زندگی اور ماحول غم وآرام سے بوجھل ہوگیا۔پھر بھی ان کے ہونٹوں پر ہنسی کھلتی رہی۔ان کی شوخیت یاسیت پر ہمیشہ غالبؔ رہی اور انہیں میر ہونے سے بچالیا۔۔۔''

یہ غالبؔ کا کمال رہا ہے کہ غم میں بھی ان کے ہونٹوں پر جسم کی لہر دوڑتی نظر آتی ہے۔اور شوخیت یاسیت پر غالبؔ رہتی ہے۔یہاں تک کہ تعزیت کے نازک ترین موقعوں پر بھی غالبؔ نے شوخی وظرافت کو ملحوظ رکھا ہے۔یہ غالبؔ کا کمال ہے کہ تعزیت جیسے نازک موقع پر بھی اپنے اس لطیف انداز کے ذریعے لوگوں کو مسکرانے پر مجبور کرتے ہیں۔بقول نورالحسن نقوی

''غالبؔ نے غموں کو ہنسی میں اڑانا سیکھ لیا تھا۔''

جو شخص اپنے غموں کو خوشیوں میں بدلنے کی قوت رکھتا ہو۔وہ دوسروں کے غم دور کرنے کی کوشش کیوں نہ کرے گا۔غالبؔ کا یہ تعزیتی خط ملاحظہ فرمائے جو انہوں نے امین الدین خان کے نام ان کی اہلیہ کے انتقال پر لکھا ہے۔

''آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں؟ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں۔اظہار غم،تلقین صبر، دعائے مغفرت سو بھائی اظہار غم تکلف محض ہے جو غم تم کو ہوا۔ممکن

نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو۔ تلقین صبر بے دردی ہے۔۔۔ رہی
دعائے مغفرت میں کیا اور میری دعا کیا مگر چونکہ وہ میری
مربیہ اور محسنہ تھیں دل سے دعا نکلتی ہے۔۔۔۔۔''

اس خط سے یہ صاف ظاہر ہے کہ خط بہت تاخیر سے لکھا ہے۔

غالب کے فکر و خیال کی پرواز بہت بلند و اعلی ہے۔ غالب کا ہر خط ان کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کی ترجمانی کراتا ہے۔ یہ غالبؔ ہی کا کمال ہے کہ انہوں نے زندگی کی معمولی سی معمولی باتوں کو پرکشش انداز سے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے کہ

''وادیٔ خیال کو مستانہ وار طے کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا لیکن
وہ زندگی کو بہت قریب سے دیکھتے تھے۔ اس کی گہرائیوں تک
پہنچنا اور اصل حقیقت کو معلوم کرنا ان کی شخصیت کا جزو
تھا۔۔۔۔۔''

غالبؔ کو زندگی میں فراغت عیش و آرام بھی نصیب نہیں ہوا۔ فکر معاش، تنگ دستی، پریشان حالی ہمیشہ ساتھ رہی۔ اس پریشان حالی کا تذکرہ نہ صرف ان کے خطوط میں بلکہ ان کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ غم روزگار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

غم اگر چہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

مندرجہ بالا خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالبؔ تنگدستی میں مبتلا تھے۔ پنشن بند ہونے کی وجہ سے ان کی طبیعت میں اضطرابی و پریشانی نمایاں تھی جس کا اندازہ ہمیں ان کے اس جملے سے ہوتا ہے، وہ کیا کھاتا پیتا ہے۔ اور کیوں کر جیتا ہے؟ وہ دوسروں کے محتاج تھے۔ غالبؔ جیسا انا پرست انسان جو کبھی دوسروں کو اپنے سے برابر یا بڑا ماننے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ وہ معاشی تنگدستی کے آگے اتنا

مجبور ہو جاتا ہے کہ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔نواب یوسف علی خاں کو لکھتے ہیں۔

''جو آپ بن مانگے دیں اس کے لئے مجھے انکار نہیں اور جب مجھ کو حاجت آ پڑے تو آپ سے مانگنے میں عار نہیں۔ بارگرانِ غم سے پست ہو گیا ہوں۔آگے تنگ دست تھا۔اب تہی دست ہو گیا ہوں جلدی میری خبر لیجئے اور کچھ بھجوا دیجئے۔''

اس خط میں مکتوب الیہ کو مالی مدد بہم پہنچانے کے لئے لکھ رہے ہیں۔غالبؔ کے یہاں اپنے اوپر ہنسنے کی یہ کیفیت اکثر و بیشتر دردوغم کی کثرت سے ہے۔اور بعض اوقات شگفتگی ناپسندی چیزوں کے ردِعمل سے طنز کا روپ دھار لیتی ہے۔طنز اور شوخی وظرافت جس کا ہدف عموماً دوسرے انسان اور ان کے افعال اور اعمال ہوتے ہیں۔لیکن خود اپنے اوپر ہنسنے کی قوت اعلیٰ ظرف کی نشاندہی کرتی ہے۔علاالدین علائی کے نام اپنی معاشی بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''بھائی صاحب کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں۔ ادھر متھرا داس سے قرض لیا۔ادھر درباری مل کو مارا۔۔۔اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ پھوپی کے سر۔۔۔کبھی ماں نے آگرہ سے بھیج دیا۔۔۔ بیوی جدا۔ بچے جدا۔۔۔سوچا کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں!۔۔۔۔۔۔''

قرض کے لین دین،سود کی ادائیگی،اخراجات کی بہتات اور اپنی بے بسی پر ہنسنا صاف دکھائی دیتا ہے۔ذرائع آمدنی کے نہ ہونے کے باوجود وہ دوسروں کا خیال رکھتے تھے۔اور حتی الامکان ان کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔جس کا ثبوت ان کی اس تحریر سے ملتا ہے۔جو انہوں نے یوسف مرزا کو لکھا تھا۔حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا۔اس کی بیٹی، اس کے چار بچے،اس کی ماں میری بھاوج

جے پور میں پڑے ہیں۔اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی چچا ہے۔۔۔۔۔"

اپنے بھائی کے یتیم اور لاوارث اولاد کے حقوق ادا نہ ہونے کا غم غالبؔ کو زیادہ تھا۔ بھائی حسین علی خاں سے محبت اور بچوں کی دیکھ بھال کو غالبؔ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ حالانکہ مالی اعتبار سے غالبؔ اس قابل نہیں تھے کہ وہ ان فرائض کو انجام دے سکیں۔لیکن غالبؔ ایک دردمندانہ اور حساس طبیعت کے مالک تھے۔اپنے پاس کچھ نہ ہونے کے باوجود بھی وہ دوسروں کے لئے پریشان رہا کرتے تھے۔جس کا اندازہ ہمیں مندرجہ بالا خط سے ہوتا ہے۔ غالبؔ نے اس دور میں آنکھ کھولی جب ہندوستان ایک سیاسی سماجی اور تہذیبی بحران سے گزر رہا تھا۔قدیم وجدید اور اندھیرے اجالے کی کش مکش غالبؔ کے لب ولہجہ اور اشعار میں صاف سنائی دیتی ہے۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

دلی کے اجڑنے کے اسباب اور عزیز واقارب کے بچھڑنے کا غم غالبؔ کو بہت تھا۔ ۱۸۵۷ء کا غدر جس پر غالب تفصیل سے لکھ سکتے تھے۔مگر وہ جانتے تھے کہ اس میں جان کا خطرہ ہے۔اس بات کا اشارہ ہمیں تفتہ کے نام ایک خط میں ملتا ہے۔لکھتے ہیں مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔پھر بھی ان خطوں میں بہت اہم معلومات محفوظ ہوگئی ہیں۔انگریزوں کی ظالمانہ حکومت ۱۸۵۷ء کی تباہی و بربادی۔گویا غدر کے ہنگامہ کی پوری تفصیل نمایاں ہوتی ہے۔لکھتے ہیں۔

"غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں دروازے سے باہر نکل
نہیں سکتا۔سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔رہا یہ کہ
کوئی میرے پاس آوے۔شہر میں کون جو آوے گھر کے گھر
بے چراغ پڑے ہیں۔۔۔۔۔"

۱۸۵۷ء کے اس عظیم سانحہ میں غالب کا سب سے بڑا غم دوستوں کی جدائی تھا۔اس عظیم سانحہ میں غالب کے بہت سے عزیز واقارب اس دنیا سے کوچ کر گئے تھے اور جو بقید حیات تھے۔وہ بچھڑ چکے تھے۔اور دلی سے دور تھے۔نہ وہ غالب سے مل سکتے تھے۔اور نہ غالب اُن سے بس اس تنہائی کے موقع پر صرف خطوں کے سہارے جیتے تھے۔

میر سرفراز حسین کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''انگریز قوم سے جوان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ان میں کوئی میرا امید گاہ تھا۔اور کوئی میرا شاگرد۔۔۔۔ہائے اتنے یار مرے کہ اب جو میں مروں گا تو کوئی میرا رونے والا بھی نہ ہوگا۔۔۔''

قاضی عبدالجمیل جنوں کو ان کے کلام کی اصلاح کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

''فارسی کیا لکھوں؟ یہاں ترکی تمام ہے اخوان واحباب یا مفقوالجز ہزار آدمی کا ماتم دار وہوں۔آپ غم زدہ اور آپ غم گسار ہوں۔اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں۔مرنا سر پر کھڑا ہے۔اور پا بہ رکاب ہوں۔۔۔۔۔۔''

۱۸۵۷ء کی تباہی و بربادی نے غالب کو ذہنی اور جذباتی طور پر گہری مایوسی واداسی سے دوچار کیا تھا زمانے کے حوادث اور دوستوں کی دائمی مفارقت سے جو اثر ان کی طبیعت نے قبول کیا۔

ان اقتباسات سے غالبؔ کی حسرتوں کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔جو کسی تاریخی دستاویز سے کم اہمیت نہیں رکھتا غالبؔ اپنے دور کے سیاسی وسماجی حالات سے مفاہمت کرنے کو تیار تھے۔بلکہ وہ اس دور کے سیاسی وسماجی حالات میں پیدا ہورہی مختلف تبدیلیوں کو سمجھتے تھے۔خطوط غالب کی سب سے بڑی خوبی واہمیت یہ ہے کہ ان خطوط سے ۱۸۵۷ء کے حالات وواردات کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔اور غالبؔ نے

ان واقعات کہ منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔اور یہاں کی سسکتی بلکتی ہوئی زندگی کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ غالبؔ نے غدر سے آٹھ نو سال قبل اردو میں خط و کتابت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔جس میں ۱۸۵۷ء یا اس کے بعد کے خطوط زیادہ اہم ہیں۔ان خطوط میں غالب نے شعوری یا لاشعوری طور پر ان تمام حالات و واقعات کا ذکر کر دیا ہے۔ان تحریروں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غالبؔ کی مکتوب نگاری میں جو اثر آفرینی ہے اس میں دلی کی تباہی کا بہت بڑا ہاتھ نظر آتا ہے۔شکست وریخت کے اس عالم میں بھی غالبؔ نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور تنہائی کے باجود اپنے خطوط کے سہارے ایک نئی دلّی بنانے کی کوشش میں مصروف رہے۔اتنے حوصلہ شکن ماحول میں بھی باری باری سے اپنے سبھی دوستوں کو خط لکھتے رہے۔ان خطوں میں ان کی اپنی ذات اور عہد کا کرب واضح نظر آتا ہے۔جوان کے اس جملے سے صاف ظاہر ہے۔''میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں۔''

غالبؔ کے وہ خطوط جو انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں لکھے ہیں۔جن سے ان کے نجی غموں اور بیماریوں کا پتا چلتا ہے۔اور ان میں موت سے ہمکنار ہونے کی خواہش کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔غالبؔ نے اپنے آخری ایام میں اپنی زندگی کے صبر آزما اور حوصلہ شکن حالات سے ہار مان لی تھی۔ان کے یہاں گھٹن، بیزاری اور مریضانہ پن کا جذبہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔اور یہ بیزارگی غالبؔ کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔اس طرح زندگی سے بیزارگی ان کی زندگی کے ہر گوشے پر چھائی نظر آتی ہے۔اس کا ذکر انہوں نے اپنی غزلوں میں کیا ہے۔

خموشی میں نہاں خوں گشت لاکھوں آرزوئیں ہیں۔
چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

غزلوں کی طرح غالب نے اپنے خطوں میں بھی غم ذات اور غم کائنات کا ذکر کیا ہے۔

حبیب اللہ ذکاء کو ایک خط میں رقمطراز ہیں

''میرے محبوب، میرے محبوب تم کو میری خبر بھی ہے۔ آگے ناتواں
تھا۔ اب نیم جاں ہوں۔ آگے بہرا تھا۔ اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔
رعشہ وضعف بصر جہاں چار سطریں لکھیں۔ انگلیاں ٹیڑھی ہوگئیں۔
صرف سوچنے سے رہ گیا۔ اکہتر برس اب زندگی برسوں کی نہیں
مہینوں اور دنوں کی ہے۔''

ضعیفی کے اس دور میں جہاں غالب اپنی زندگی کے آخری مراحل طے کر رہے تھے۔ انہیں دنوں غالبؔ ایک اور اور بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ پھوڑوں کی تکلیف۔ ان عوارض کا ذکر تفصیل کے ساتھ خطوط میں لکھا ہے۔ باقر علی خاں کامل کو لکھتے ہیں۔

''بھائی! اب میری انگلیاں لکھی ہوئی ہیں۔ اور بصارت میں ضعف آ
گیا ہے۔ دو سطر میں نہیں لکھ سکتا۔''

تفتہ کو لکھتے ہیں۔

''بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہے بیٹھ نہیں سکتا۔
اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔''

پھوڑوں کے متعلق عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں۔

'' برس دن میں اوجاع سہتے سہتے روح تحلیل ہوگئی۔ نشست و
برخاست کی طاقت نہ رہی۔ اور پھوڑے تو خیر دونوں پنڈلیوں کی
ہڈیاں چرانے لگیں اور رگیں پھٹنے لگیں۔''

ایک اور خط میں مرزا حاتم علی مہر کو اپنے بڑھاپے کا حلیہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''جب داڑھی مونچھ میں سفید بال آ گئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے

انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے
کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی
مگر یاد رکھئے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے۔عام،
ملا، حافظ بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیارہ، جولاہا، کنجرا،
منہ پر داڑھی سر پر بال فقیر نے جس دن داڑھی رکھی۔اسی دن
سر منڈوا دیا۔''

مندرجہ بالا تحریر میں غالبؔ نے اپنے حلیہ کا آئینہ دکھا کر خود اپنا مذاق اڑایا ہے ساتھ ہی ساتھ اپنی شخصیت کی انفرادیت کو ظاہر بھی کیا ہے کہ کس طرح نو جوانی رخصت ہوئی اور بڑھاپے کا آغاز ہوا۔ بہر کیف غالب کے خطوط خواہ کن حالات کے تحت بھی لکھے گئے ہوں۔مگر ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔نثری ادب میں غالبؔ کی شخصیت جس آب وتاب کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔وہ مراسلہ نگار کی ہے۔اور یہ مکتوبات غالب کی قلم کاری کا نمونہ ہیں۔احمد با احتمال غالب کے خطوط کے متعلق لکھتے ہیں۔

''اپنے خطوط میں غالب دوسروں پر بھی ہنستے ہیں اور اپنے
اوپر بھی قہقہے لگاتے ہیں۔اپنے مسائل ومصائب پر دوسروں کو
ہنسانے کے ساتھ اپنے اوپر ہنسنا بڑی اعلیٰ ظرفی ہے۔اس اعلیٰ
ظرفی اور ظرافت نے انہیں ابدی شہرت کا تاج اور تخت عطا
کیا۔۔۔۔۔''

غالبؔ ایک انقلابی مزاج رکھتے تھے۔انہوں نے مراسلت کے تمام قاعدوں کو توڑ دیا۔وہ اپنے دل کی بات خط میں اسطرح کہتے ہیں کہ گویا پڑھنے والا ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ آپس میں بات چیت کر رہا ہے۔اس کے متعلق خود انہوں نے لکھا ہے کہ مجھے محمد شاہی روشیں پسند نہیں۔

غالبؔ کے اکثر خطوط میں سادگی، سلاست اور روانی ملتی ہے۔ خطوط غالبؔ کی خصوصیات میں ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے خطوط میں مکالماتی انداز اختیار کیا ہے۔ جس سے ڈرامے کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ غالبؔ نے خطوط میں با قاعدہ مکالمے لکھے ہیں۔ مگر ایسے خطوط گنے چنے ہیں۔ غالبؔ نے اپنی بات مکالمے کے انداز میں بہت خوبصورت طریقے سے کی ہے۔ غالبؔ کا یہ انداز جس پر غالبؔ کو خود ناز تھا۔ اس کا ذکر اس شعر میں کرتے ہیں کہتے ہیں۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں غالب کا ہے انداز بیاں اور

مہر مہدی مجروح کے نام ایک خط لکھا ہے۔ جس میں اپنی میرن صاحب کی ملاقات کی کیفیت کا حال سنایا ہے۔ خط کا نمونہ دیکھ کر ایسا لگتا ہے۔ جیسے کسی ڈرامے سے ایک ٹکڑا اٹھا لیا گیا ہے۔

''غالب: اے جناب میرن صاحب السلام علیکم

میرن: حضرت آداب

غالب: کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟

میرن: میں کیا منع کرتا ہوں میں نے تو عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں۔

بخار جاتا رہا ہے۔۔۔۔۔''

ایک دوسرا خط جو نواب علاؤالدین احمد خاں علائی کے نام ہے۔

''میری جان، علائی ہمہ دان!

میرا منظر سیر راہ ہے۔ وہاں بیٹھا ہوا یہ خط لکھا رہا ہوں۔

محمد علی بیگ ادھر سے نکلا

بھئی محمد علی بیگ!

لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟''

غالبؔ نے ان خطوط میں زندگی کی داخلی کشمکش اور اپنے ماحول کی متحرک تصاویر پیش کی ہیں۔ان خطوں میں جو شگفتگی پائی جاتی ہے۔اس کی تہہ میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا احساس نظر آتا ہے۔غالبؔ کے نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تحریر سادہ مگر دل کش ہے۔مرزا غالبؔ اپنے خطوں میں وہ سب کچھ کہہ دینا چاہتے تھے۔جس کا اظہار انہوں نے غزلوں میں کیا ہے۔مگر غزل کے تقاضوں اور پابندیوں نے ان کو مفصل اظہار کی اجازت نہیں دی۔اسی لئے انہوں نے مکتوب نویسی کے فن کو اختیار کیا۔وہ چاہتے تو کوئی دوسری صنف بھی اختیار کر سکتے تھے۔مگر ان کے سامنے کوئی نمونہ موجود نہیں تھا۔ڈاکٹر سید عبداللہ غالب کی مکتوب نویسی کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ''اگر مرزا کے لئے ممکن ہوتا تو وہ یقیناً ناول کا فن اختیار کرتے۔مگر ناول کا ان کے سامنے کوئی نمونہ موجود نہیں تھا۔پس انہوں نے مکتوب نویسی کو ذاتی اور عصری تجربات کے لئے ذریعہ بنایا۔یہ مکتوب نویسی ان کے لئے کاروباری چیز بھی بلکہ اظہار خیالات کا ایک وسیلہ تھی۔جس کی انہوں نے فن کی حیثیت سے ان کے مکاتب کو مختصر افسانہ کہا جاسکتا ہے۔۔۔''

مندرجہ بالا اقتباس میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا یہ کہنا کہ اگر مرزا کے لئے ممکن ہوتا تو وہ یقیناً ناول کا فن اختیار کرتے۔مگر ناول کا فن ان کے سامنے موجود نہیں تھا' بالکل صحیح ہے۔مگر ناول کا کوئی نمونہ ان کے سامنے موجود نہ ہونے کے باوجود ان کے خطوط میں ناول کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

غالبؔ کے خطوط میں مکتوب الیہ کرداروں کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔اور ہم بہ آسانی مکتوب نگار کے مکالموں کے ذریعے ان کی صفات اور انداز فکر کے بارے میں جان لیتے

ہیں۔ غالبؔ نے خطوط میں زندگی اور اس سے متعلق آدمی کے تعلقات وروابط کے بارے میں گفتگو کی ہے۔اس لئے غالبؔ کے تمام کردار ایک ناول کے کردار کی طرح ابھرتے نظر آتے ہیں۔ ناول میں جس طرح ناول نگار خود بھی ایک کردار کی صورت میں ابھرتا ہے۔اسی طرح غالبؔ بھی ایک کردار کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ناول میں کرداروں کے علاوہ مکالموں کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ مکالموں ہی کے ذریعہ کردار زیادہ واضح طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ غالبؔ کے خطوط میں بھی ناول کے جیسی مکالماتی انداز ملتا ہے۔اس کی تصدیق خود غالبؔ نے بھی کی ہے۔ یہ مراسلہ نگاری نہیں بلکہ مکالمہ نگاری ہے۔

غالب نے اپنے دور کی خصوصی اور روایتی زبان کا استعمال نہیں کیا۔ بلکہ اس سے ہٹ کہ ایک جدید اسلوب اختیار کیا۔جس میں انہوں نے ذو معنی الفاظ تشبیہ، استعارہ، تجنیس جیسی چیزوں کا استعمال کیا۔مثلاً تجنیس

> ''میاں تمہارے دادا تو نواب امین الدین خاں بہادر ہیں۔ میں تو دلدادہ ہوں''

مندرجہ بالا اقتباس میں دادا اور دلدادہ میں صوفی مماثلث کے ذریعے لطف پیدا کیا گیا ہے۔ دوسرا اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

> ''مبالغہ نہ سمجھنا۔ ہزار ہا مکانات گر گئے ہیں۔سینکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے ہیں۔گلی گلی ندی بہہ رہی ہے قصہ مختصر وہ ان کال تھا کہ پانی نہ برسا اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پن کال ہے پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہہ آئے۔۔۔''

اس طرح غالبؔ نے اپنے خطوط میں زندگی کے مختلف زاویوں کو الگ الگ انداز میں پیش کیا ہے۔ان خطوط میں کہیں افسانے کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے تو کہیں ڈرامائی انداز اور کہیں ناول نگاری کا انداز نمایاں۔غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

''غالبؔ کے اردو خطوط اعلیٰ درجے کی نثر نگاری کی ذوق پیدا
کرنے میں بے حد معاون ہو سکتے تھے۔ کیوں کہ ان میں
ہر طرز اور ہر رنگ کی تحریر میں موجود تھیں۔ مگر ان سے وہ کام
نہیں لیا گیا جو لیا جا سکتا تھا۔۔۔۔۔''

بہر کیف ان خطوں کو پڑھنے سے ایسے لگتا ہے کہ غالبؔ نے اپنی ساری زندگی کو ان خطوط میں نمایاں کر رکھا ہے۔ الغرض غالبؔ کے خطوط اردو ادب کے لئے نہایت عظیم سرمایہ ہیں۔ یہ خطوط نہ صرف خطوط میں بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ اردو نثر کا وہ حصہ ہے جہاں جدید نثر کا آغاز ہوتا ہے۔ بقول آل احمد سرور۔:

''غالبؔ کے خطوط سے جدید نثر کا آغاز ہوتا ہے۔''

غالب کے خطوط اردو نثر کی تشکیل جدید میں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنگ آزادی کی پہلی ناکام جنگ اور دلی کی تباہی و بربادی سے پہلے شعر و شاعری کے وافر مواقع تھے۔ لیکن آزادی کے بعد معاشرہ زوال پذیر ہو گیا۔ شعر و شاعری کے ذریعے اپنی بات کہنے کے مواقع ندارد ہے۔ بغاوت کی ناکامی کے بعد محفلیں یکسر ختم ہو گئی۔ یعنی داد و تحسین اور اعزاز و اکرام دینے والے نہ رہے۔ نثر کی طرف شعراء کا رجحان بڑھنے لگا۔ غالبا غالبؔ نے بھی اپنی بات نثر میں دوسروں تک پہنچانے کے لئے مکتوب نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ اور مکتوب نگاری میں ذو معنی الفاظ کا استعمال کر کے اس کے میدان کو وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے۔

خطوط غالب اردو نثر کا وہ حصہ ہے جہاں جدید نثر کا آغاز ہوتا ہے۔ بقول آل احمد سرور

''غالب کے خطوط سے جدید نثر کا آغاز ہوتا ہے۔''

غالب کے خطوط اردو نثر کی تشکیل جدید میں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنگ آزادی کی پہلی ناکام جنگ اور دلی کی تباہی و بربادی سے پہلے شعر و شاعری کے وافر مواقع

تھے۔لیکن آزادی کے بعد معاشرہ زوال پذیر ہوگیا۔شعروشاعری کے ذریعے اپنی بات کہنے کے مواقع ندر ہے۔ بغاوت کی ناکامی کے بعد محفلیں یکسر ختم ہوگئی۔یعنی دادوتحسین اور اعزاز واکرام دینے والے ندر ہے۔نثر کی طرف شعراء کا رجحان بڑھنے لگا۔ غالباغالبؔ نے بھی اپنی بات نثر میں دوسروں تک پہنچانے کے لئے مکتوب نگاری کی طرف مائل ہوئے اورمکتوب نگاری میں ذومعنی الفاظ کا استعمال کر کے اس کے میدان کووسیع سے وسیع تر کردیا ہے۔

اردونثر میں غالبؔ نے جوسرمایہ چھوڑا ہے۔وہ صرف ان کے خطوط پر مشتمل ہے۔یہ خطوط کسی منصوبے کے ماتحت نہیں لکھے گئے ہیں۔۔یہ خطوط بھی چونکہ ذاتی ہیں اورانہیں اس احساس سے نہیں لکھا گیا ہے کہ ان کا شمارادبی تخلیق کے تحت ہوگا۔اسلئے ان میں تکلف اورتصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔۔۔

حواشی:

۱۔اطراف غالبؔ	ڈاکٹرسیدعبداللہ
۲۔ادبی خطوط غالبؔ	محمدعسکری
۳۔ خطوطِ غالبؔ کاتحقیقی مطالعہ	کاظم علی خاں
۴۔ خطوطِ غالبؔ کافنی تجزیہ	حامدہ مسعود
۵۔ دکنی غالبؔ	قیوم صادق
۶۔ غالبؔ کی مکتوب نگاری	سیدعاشورکاظمی
۷۔ غالبؔ کے خطوط	خلیق انجم
۸۔ غالبؔ اورمطالعہ غالبؔ	ڈاکٹرعبادت بریلوی
۹۔ منتخب ادبی خطوط غالبؔ	مغیث الدین فریدی
۱۰۔ یادگارِغالبؔ	مولاناحالیؔ

خطوط نگاری کی روایت

مکتوب نگاری اردو کی قدیم صنف نثر ہے، جس میں غیر افسانوی انداز میں خیالات کی ترسیل ہوتی ہے۔ خط عربی کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی لکیر یا تحریر کے ہیں Dictionary of word literature کے مطابق ''خط عام طور سے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان تبادلہ خیال کا ذریعہ ہے۔''

خطوط نگاری کی ابتدا تحریر و کتابت کے ساتھ ہوئی ہے۔ ماضی میں جو لوگ فاصلوں پر رہتے تھے، اپنے عزیز و اقارب کی خیر و خیریت معلوم کرنے کا خط ہی واحد ذریعہ تھا۔ قرآ مجید میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے خط ملکہ سبا بلقیس کے نام کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ پیغمبر اعظم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حکمرانوں و بادشاہوں کے نام تبلیغی خطوط لکھے ہیں۔ آپ کے بعد خلفائے راشدین، خلفائے بنو امیہ اور عباسی خلفا اپنے والیوں کے نام خطوط لکھے ہیں۔ جن کا ذکر تاریخی کتابوں میں ملتا ہے۔ عربی زبان کے علاوہ فارسی، سنسکرت اور انگریزی زبان و ادب میں خطوط نگاری کا رواج رہا ہے۔

اردو کی دیگر اصناف ادب کی طرح خطوط نگاری کا آغاز بھی فارسی سے ہوا۔ اردو میں مکتوب نگاری کا رواج فورٹ ولیم کالج قیام سے قبل ہو چکا تھا۔ اردو کے اولین خطوط نگار کی حیثیت سے رجب علی بیگ سرور اور غلام غوث بے خبر کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر لطیف اعظمی نے اپنے مقالہ ''اردو مکتوب نگاری'' میں تحقیق سے یہ بات ثابت کی ہے کہ اردو کا پہلا خط کرناٹک میں ارکاٹ کے نواب والا جاہ کے چھوٹے بیٹے حسام الملک بہادر نے اپنی بھابھی نواب بیگم کے نام ۶ر دسمبر ۱۸۲۲ء کو لکھا تھا۔

پروفیسر گیان چند جین اور ڈاکٹر عنوان چشتی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ حیدرآباد کے دو

مصنف مرزا یار علی بیگ اور میر ابراہیم جیوان دونوں کے ایک دوسرے کے نام منظوم خطوط دریافت ہوئے ہیں جو ۱۸۶۱ء میں لکھے گئے ہیں۔ خطوط نگاری اتنی قدیم صنف ہے کہ آج بھی اردو کا اولین مکتوب نگار تحقیق طلب ہے۔

مرزا غالب نے اردو خطوط نگاری میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ مرزا غالب کے ہم عصروں میں رجب علی بیگ سرور اور خواجہ غلام غوث بے خبر کا نام آتا ہے۔ رجب علی بیگ سرور کے خطوط کا مجموعہ ''انشائے سرور'' کو مرزا احمد علی نے مرتب کر کے ۱۸۸۶ء میں نول کشو پریس لکھنؤ سے شائع کیا۔ سرور کو خطوط نگاری پر کمال حاصل تھا۔ انھوں نے مختلف اسالیب میں خطوط لکھے ہیں۔ ان کے خطوط میں مسجع مقفیٰ عبارتوں کے ساتھ ہی ساتھ سادگی اور روانی بھی نظر آتی ہے۔

غلام غوث بے خبر کے دو مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پہلا ''فغان بے خبر'' اور دوسرا ''انشائے بے خبر'' ان کے خطوط میں فارسی کا گہرا اثر ہے۔ کہیں کہیں سادگی اور پرکاری کی جھلک ملتی ہے۔

اردو خطوط نگاری میں مرزا غالب کا نام سرفہرست آتا ہے۔ آپ نے اردو مکتوب نگاری میں سنہرے دور کا آغاز کیا۔ غالب سے قبل مکتوب نگاری میں فارسی زبان کا گہرا اثر موجود تھا اور خطوط میں سادگی، سلاست اور بے تکلفی کی جگہ مشکل الفاظ، طویل فقرے اور القاب و آداب کا استعمال کیا جاتا تھا۔ غالب نے اپنے زمانے کے مزاج کے برعکس خطوط نگاری میں بے حد سادہ اور عام فہم زبان استعمال کی ہے۔ اور القاب و آداب کو بھی بے حد مختصر کر دیا ہے۔ ان کے خطوط کے مجموعے ''عود ہندی''، ''اردوئے معلیٰ''، ''مکاتیب غالب''، ''مہر غالب''، ''خطوط غالب'' اور ''نادرات غالب'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے خطوط مختلف رسالوں اور کتابوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے مکاتیب کے مجموعے میں ''عود ہندی'' اور ''اردوئے معلیٰ'' کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ غالب اپنے خطوط میں بے حد سادگی کے ساتھ سیدھے سادے مختصر الفاظ میں اپنی بات کہتے ہیں۔ انھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے گویا تحریر کو تقریر کا آئینہ بنا دیا ہے۔

مرزا غالب کے بعد خطوط نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں سرسید احمد خاں، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کا نام قابل ذکر ہے۔ حالی کے خطوط کا ایک مجموعہ مولوی اسماعیل پانی پتی نے ''مکاتیب حالی'' کے عنوان سے شائع کیا۔ اس مجموعہ میں اردو کے اور عربی و فارسی کے ۳۸ خطوط شامل ہیں۔ حالی کے فرزند خواجہ سجاد حسین نے ۱۹۲۵ء میں دو مجموعے شائع کئے تھے۔ ان خطوط میں زیادہ تر خط عزیزوں اور قرابت داروں کے نام ہیں۔ اس کے علاوہ چند خطوط دوستوں اور ہم عصروں کے نام بھی ملتے ہیں، جن میں ادبی نکات اور تنقیدی مضمون بھی ہے۔ ان کے خطوط سادگی، سلاست اور بے ساختگی کی عمدہ مثال ہیں۔

شبلی نعمانی کے خطوط کے دو مجموعے ''مکاتیب شبلی'' اور ''خطوط شبلی'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ شبلی نعمانی ایک عالم دین ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ایک باکمال شاعر اور نقاد بھی تھے۔ ان کے خطوط میں ان کی شخصیت کے تمام پہلو نظر آتے ہیں۔ شبلی خط بے حد مختصر انداز میں لکھا کرتے تھے۔ نظیر حسین زیدی لکھتے ہیں:

> ''نہیں معلوم کیوں شبلی کی زندگی دو خانوں میں بٹ گئی یا ان کی زندگی کو دو خانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ان دونوں خانوں کی نقاشی دو مختلف مکاتب فکر نے کی ہے۔ ایک طرف ندوۃ العلماء کا گروہ ہے تو دوسری طرف علی گڑھ کے نقاد۔ ایک کے سربراہ سید سلیمان ندوی ہیں تو دوسرے کے شیخ محمد اکرام۔ ایک کے خیال میں شبلی سید العلماء ہیں تو دوسرے کے خیال میں عشقیہ خطوط کے بانی۔'' [۱]

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کے کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں لیکن جو شہرت اور مقبولیت ''غبار خاطر'' کی میسر آئی وہ کسی اور مجموعے کو نہ مل سکی۔ غبار خاطر کے علاوہ ان کے مکاتیب

کے مجموعے میں ''کاروان خیال''، ''مکاتیب ابوالکلام آزاد''، ''تبرکات آزاد'' اور ''میرا عقیدہ'' کے نام سے شائع ہوئے۔ غبار خاطر مولانا آزاد کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ۱۳/اگست ۱۹۴۲ء سے ۳/ دسمبر ۱۹۴۵ء کے درمیان قلعہ احمد نگر کی اسیری کے زمانے میں حبیب الرحمٰن شروانی کے نام تحریر کئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انھیں کسی سے ملنے اور خط و کتابت کی اجازت نہیں تھی۔ اسی لئے خطوط مکتوب الیہ کو اس وقت ملے جب یہ خطوط غبار خاطر کی شکل میں شائع ہو چکے تھے۔

مولانا آزاد ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی رہنما اور مفکر بھی تھے۔ لہٰذا ان کے خطوط ان کی زندگی کے تمام مشاہدات و تجربات، خیالات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ غالب کے خطوط کے بعد خطوط نگاری کی روایت میں مولانا آزاد کے خطوط غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ خط شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ جس میں خطوط نگار کی شخصیت کی تمام خوبیاں اور خامیاں نمایاں ہوتی ہیں۔ مکتوب کو مکتوب نگار کا فوٹو یا ایکسرے بھی کہا جاتا ہے۔ ایسا اس لئے کہ کسی کی شخصیت کے ظاہری و باطنی خدوخال کا اندازہ لگانے کا خطوط بہترین ذریعہ ہیں۔

خط کو نصف ملاقات بھی کہا جاتا ہے۔ ایک اچھے خط میں اختصار و جامعیت، سادگی اور بے ساختگی۔ احساس کی لطافت، سچائی اور خلوص جیسی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

مولوی عبدالحق خطوط کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اردو میں سینکڑوں دلکشیاں ہیں۔ اس کی بے شمار راہیں اور ان گنت گھاتیں ہیں۔ لیکن خطوں میں جو جادو ہے، بشرطیکہ خط لکھنا آتا ہو، وہ ادب کی کسی ادا میں نہیں۔ نظم ہو، ناول ہو، ڈراما ہو یا کوئی اور مضمون ہو۔ غرضکہ ادب کی تمام اصناف میں صنعت گری کی عمر تھوری ہوتی ہے۔ بناوٹ کی باتیں بہت جلد پرانی اور بوسیدہ ہو جاتی ہیں۔ صرف سادگی ہی ایسا حسن ہے جسے کسی حال میں اور کسی

زمانے میں زوال نہیں، بشرطیکہ اس میں صداقت ہو اور ہم
میں سے کون ہے جس کے دل میں سچ کی چاہ نہیں؟ خطوں کی
یہی سادگی اور بے ریائی ہے جو دلوں کو لبھاتی ہے اور یہی وجہ
ہے کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ
کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ خطوں میں کاتب
مکتوب الیہ (جس کو خط لکھا گیا ہو) سے بلکہ بعض اوقات
اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو خیال جس طرح اس
کے دل میں ہوتا ہے اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔ نہیں
بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکرے پر نکال کر رکھ دیتا ہے۔'' ۲

خطوط کی اہمیت وافادیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر شجاعت علی لکھتے ہیں:

''فنکار کی شخصیت جس طرح ان کے خطوط میں بے نقاب ہو
جاتی ہے کسی اور صنف ادب میں ممکن نہیں۔ خطوط اس کی
شخصیت کا آئینہ بھی ہوتے ہیں اور ایکسرے
(X-Ray) بھی بلکہ جن باتوں کو آئینہ اور ایکسرے پیش
کرنے سے قاصر رہتے ہیں خطوط ان کو بھی ظاہر کر دیتے
ہیں۔ آئینہ زیادہ سے زیادہ ظاہری شکل وصورت کو پیش کر دیتا
ہے۔ اور ایکسرے اندرونی ساخت کا۔ لیکن جذبات و
احساسات اور شمائل وخصائل اور اس قسم کی دوسری خصوصیات
کی عکاسی ان کے (آئینہ وایکسرے) بس کی بات نہیں۔ اس
لئے خطوط کو ادب عالیہ میں سب سے بہتر تسلیم کیا جاتا

ہے۔''[۳]

ادبی شخصیتوں کے درمیان لکھے گئے خطوط ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔مکتوب نگاری اردو کی ایک قدیم صنف ہے۔گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ انسان نے بہت ترقی کر لی ہے۔دور حاضر میں ترسیل کے نئے نئے ذرائع موجود ہیں موبائل فون فیکس اور سوشل میڈیا نے فاصلوں کو مٹا دیا ہے۔آج خط کی جگہ ٹیکسٹ(Text) اور میسیج نے لے لی ہے،جس سے خطوط نگاری میں کمی واقع ہوئی ہے،لیکن آج بھی حکومتی اور دفتری کام کاج،کاروبار میں خطوط نگاری کا رواج عام ہے اور اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

حواشی

۱۔ غالب تاریخ کے آئینہ میں ازنظیر حسین زیدی ص۹۳

۲۔ مکتوبات بابائے اردو عبدالحق ص۱۳۔۱۴

۳۔ اردو مکتوب نگاری از ڈاکٹر شجاعت علی ص۲۷

مکتوب نگاری اور بھوپال

مکتوب نگاری ایک ایسی معتبر صنف ادب ہے، جس میں خط نگار کی شخصیت اپنے ماحول کے ساتھ جس قدر واضح طور پر سامنے آتی ہے، اس اعتبار سے کسی اور صنف ادب سے ناممکن ہے، لیکن یہاں یہ شرط ہے کہ خطوط تصنع اور بے جا مبالغہ سے پاک، سادگی اور سلاست نیز خلوص وصداقت اور بے ساختگی پر مبنی ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی لکھتے ہیں کہ:

> ''خطوط دراصل دو قسم کے ہوتے ہیں، نجی خطوط اور غیر نجی خطوط۔ غیر نجی خطوط اپنے اندر وہ خوبیاں نہیں رکھتے جو نجی خطوط رکھتے ہیں، نہ ان میں دررباعی ہوتی ہے، نہ رعنائی، نہ جاذبیت اور نہ سحر کاری، برخلاف اس کے نجی خطوط میں وہ ساری خوبیاں پائی جاتی ہیں جن کی ہم اچھے خطوط سے توقع رکھتے ہیں..... خطوط مکتوب نگاری کی سیرت اور شخصیت کو سمجھنے میں مدد کرتے ہیں اور مکتوب الیہ سے بھی روشناس کراتے ہیں۔''

(خط نگاری، از عبدالقوی دسنوی، ماہنامہ کتاب لکھنؤ ص ۹۱)

بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام:۔

> ''.....؛ انسان کے وہ سبک دلکش اور نازک پہلو جو اس کے بلند ادبی کارناموں میں ظاہر نہیں ہوتے، خطوں میں نمایاں ہوجاتے ہیں..... اگر یہ بات سچ ہے کہ نظر سے خاک کیمیا ہوجاتی ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ ایک اچھا مکتوب نگار ان نجی باتوں میں وہ رنگ بھر دیتا ہے کہ یہ باتیں ہمیں اپنی ہی داستان معلوم ہونے لگتی ہیں۔''

(خطوط نگاری، تنقیدیں، از خورشید الاسلام، ص ۱۱ تا ۱۲)

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ غالب کے خطوط خط نگاری کے بہترین نمونے مانے جاتے ہیں، اور ہیں بھی،

یسریٰ راحت، ریسرچ اسکالر، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال

لیکن میں نے بھوپال کے کچھ خط نگاروں، شاعر اور ان سے متعلق خطوط کو اپنا موضوع منتخب کیا ہے۔

بھوپال کے طنز ومزاح نگاروں میں عبدالاحد خان، تخلص بھوپالی کا نام سامنے آتا ہے۔ رشید احمد صدیقی سے ان کے دوستانہ تعلقات کا بیان ہمیں ان خطوط میں ملتا ہے، جو رشید صاحب نے تخلص بھوپالی کو لکھے تھے۔

رشید صاحب اور تخلص بھوپالی ایک دوسرے کے قدر دان تھے، دونوں حضرات کے تعلقات اتنے گہرے تھے کہ اپنے بعض نجی معاملات میں ایک دوسرے سے مشورہ لیا کرتے تھے۔

رشید احمد صدیقی کے خطوط انتہائی خلوص اور اپنائیت وسادگی کے غماز ہیں۔ ان کے مطالعے سے ہمیں دونوں صاحبان کے تعلقات ان کی علمی اور ادبی گفتگو، تصانیف پر تبصرے اور رائے، اخلاقی، سماجی خیالات کے ساتھ مکتوب نگار کی زندگی کے متعلق کئی اہم باتوں کا علم ہوتا ہے۔

تخلص صاحب چونکہ ایک طنز ومزاح نگار تھے اور اوپر سے بھوپالی بھی تھے، تو ان کا انداز بڑا ظریفانہ اور مزاحیہ قسم کا تھا۔ چنانچہ ان کے خطوط سے جو لطف اور مسرت رشید کو حاصل ہوتی تھی، اس کا اظہار رشید صاحب نے اپنے خطوط میں اس طرح کیا ہے۔ یہ خط ۱۲/اگست ۱۹۶۳ء میں لکھا گیا تھا، خط ملاحظہ فرمائیے:

> ''.....اپنے خطوط میں جس لطف اور کھلے دل سے آپ اپنا ہی نہیں بلکہ پورے خاندان اور احباب کی طرف سے میرا دل خوش کیا کرتے ہیں، اس کا اسی طرح جواب دینا آسان نہیں۔ یہاں انشاء پردازی کام نہیں دیتی، بلکہ وہ شگفتگی اور دل نوازی درکار ہوتی ہے جو آپ میں بدرجۂ اُتم موجود ہے۔''

اسی طرح مندرجہ ذیل مکتوب ملاحظہ فرمائیں:۔

> ''.....آپ کتنی اچھی باتیں کس خلوص اور تفصیل سے لکھتے ہیں، میری تعریف کرتے ہیں، جی خوش ہوتا ہے۔ کس کا نہ ہوتا ہوگا، جب اس کا یقین ہو کہ یہ سب محبت اور اخلاص سے ہے، اس میں میری نہیں آپ کی بڑائی ہے۔''

(۱۹/فروری ۱۹۶۳ء)

ان خطوط کے مطالعے سے جو بات سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہمیں خط نگار کی زندگی، اس کی ذاتی پسند اور ناپسند، اور انداز فکر کا اندازہ ہوتا ہے، ہمارے یہاں بھوپال میں تحفے تحائف دینے کا سلسلہ جاری رہا ہے، جس سے دلوں میں محبت اور خلوص قائم رہتا ہے، اسی کا نمونہ ایک خط میں ملاحظہ کریں، جس میں علی گڑھ کی تین مشہور چیزیں بھیجتے

ہوئے رشید صاحب تخلص بھوپالی کو لکھتے ہیں کہ:

''علی گڑھ کی یہ تین چیزیں، بسکٹ، گجک اور خورجہ (شلجم کا اچار) اس نواح میں بہت پسند کی جاتی ہے۔ دیکھوں آپ کی کیا رائے ہوتی ہے۔''

بھوپال سے تخلص بھوپالی کے تھلی اور شہد پہنچانے پر اسی خط میں آگے لکھتے ہیں کہ:

''.....بھوپال کی تُھلی بہت زیادہ مرغوب ہے، اس طور پر آپ کا تھلی بھیجنا نہایت درجہ مبارک فال ثابت ہوا، چنانچہ پوری مقدار موصوفہ کے لئے فریز کر دی گئی۔ آنے پر ان کے حوالے کر دی جائے گی۔ تھلی اور شہد یہاں جس جس کو بطور تحفہ دی گئی، سب نے ان کے سو فیصد معیاری ہونے کی تصدیق کی۔ اس طور پر میرے اور آپ کے بھی معیاری ہونے کی تصدیق ہوگئی۔''

(۱۱ر فروری ۱۹۶۴ء)

اس طرح ان خطوط سے علی گڑھ اور بھوپال کی مشہور چیزوں کا علم تو ہوتا ہی ہے، ساتھ ہی ساتھ تحفے اور تحائف دینے کی روایت کا بھی پتا چلتا ہے۔ اور دونوں افراد کے درمیان جو محبت ہے اس کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

بحیثیت خط نگار بھوپال میں جانثار اختر اور صفیہ اختر کے نام خط نگاری کے میدان میں سامنے آتے ہیں۔ دونوں خط نگاروں کے خطوط کے مجموعے ''زیرلب'' اور ''حرف آشنا'' اور ''خاموش آواز'' کے نام سے کتابی شکل میں منظر عام پر آچکے ہیں۔ شادی کے بعد جانثار اختر کے نام لکھے گئے صفیہ اختر کے خطوط ''زیرلب'' میں شامل ہیں۔ جبکہ ''حرف آشنا'' کے خطوط شادی سے پہلے لکھے گئے تھے۔ ''خاموش آواز'' میں جانثار اختر کے وہ خطوط شامل ہیں جو انہوں نے مختلف اوقات میں اپنی دوسری اہلیہ خدیجہ اختر کے نام لکھے تھے۔

ان خطوط کے مطالعے سے صفیہ اختر کے نجی معاملات کا علم ہوتا ہے۔ جبکہ جانثار اختر کے خطوط میں ادبی مسائل کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اردو کے مکاتیبی ادب میں ان خطوط کو ایک اضافے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

کتابیات وحوالہ جات:

۱) خط نگاری ی از عبدالقوی دسنوی ماہنامہ کتاب، ص ۹۱، لکھنو۔

۲) خطوط نگاری تنقیدیں از خورشید الاسلام، ص ۱۱ سے ۱۲۔

۳) حرف آشنا از صفیہ اختر اکتوبر ۴۳ء سے نومبر ۴۷ء تک (صفیہ اختر کے خطوط جاں نثار اختر کے نام۔)

مرزا غالبؔ کی خطوط نگاری

مرزا غالبؔ کی شخصیت کا امتیاز شاعری اور نثر دونوں میں نظر آتا ہے، بالخصوص نثر میں بحیثیت مکتوب نگار وہ منفرد مقام رکھتے ہیں۔ان کے مکتوبات کا مجموعہ ''عودِ ہندی''، ''اردوئے معلیٰ'' اور ''خطوطِ غالب'' نثری ادب کا وہ سرمایہ ہے جس پر ہم فخر کرتے ہیں۔غالب کی خطوط نگاری کے حوالے سے کچھ فقرے عام ہیں کہ 'انہوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا'، 'غالب اپنے اسلوب کے خود ہی موجد اور خاتم ہیں'، 'انھوں نے مروجہ روایتِ اسلوب کے بجائے سادہ، عام فہم اور سلیس اسلوبِ تحریر ایجاد کیا'۔

غالبؔ کی شخصیت اور تخلیقی فکر کا اندازہ ان کے خطوط کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ان کی زندگی کا رکھ رکھاؤ، مزاج کا آہنگ، لفظوں کا استعمال، نادر تراکیب کی تراش خراش، منظر نگاری، تخیل کی جولانی، حسِ مزاح، طنز وظرافت کی کیفیت کے خیالات ومضامین ہر پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔غالب اپنے اسٹائل اور اندازِ اسلوب کے متعلق مرزا حاتم علی بیگ کو خط میں لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ''مرزا صاحب!
>
> میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔'' [۱]

مرزا غالبؔ کا اندازِ اسلوب ہر سطح کے مکتوب الیہ کے لیے منفرد ذائقہ رکھتا ہے، ان کی گفتگو ہر کسی کو متاثر کرتی ہے جس میں دلچسپی کا ایک منفرد پہلو موجود ہے۔وہ اپنے مکتوبات میں دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں سے دل لگی و چھیڑ چھاڑ کا اظہار کرتے ہیں، ان کا دل بہلاتے ہیں، شعر وسخن کی اصلاح کرتے ہیں اور قیمتی مشوروں سے نوازتے ہیں۔مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ان کی محبوبہ چنا جان کی وفات پر تعزیت کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

> ''سنو صاحب! شعرا میں فردوسی، فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں یہ تین آدمی تین فن میں سرِ دفتر اور پیشوا ہیں۔شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور

ڈاکٹر محمد سفیان احمد، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے
ہیں جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔''[۲]

غالبؔ نے اپنے خطوط میں اظہارِ بیان کے لیے خود کلامی کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ وہ مکتوب الیہ سے اپنے معاملات اس انداز میں بیان کرتے ہیں گویا وہ سامنے ہی موجود ہو۔ اس ضمن کے خطوط میں غالب کی شخصیت اوران کے حالات کے کئی پہلو نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں کہ خط پڑھتے ہی ہنسی آجاتی ہے۔ غالب قربان علی بیگ سالک کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی
میں نے اپنے کو غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کہ
لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور
فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک مرا جواب نہیں۔ لے اب تو
قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا کافر
مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو مرنے کے بعد جنت آرام گاہ
،عرش نشیں خطاب دیتے ہیں چوں کہ یہ اپنے آپ کو شہنشاہِ قلم وسخن جانتا
تھا، ''سقر مقر'' اور ''زاویہ ہاویہ'' خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ ''آیئے نجم
الدولہ بہادر'' ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا
رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں: ''اجی حضرت نواب صاحب
! نواب صاحب کیسے اور غلام صاحب ! آپ سلجوقی وافراسیابی ہیں۔ یہ
کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو بولو، کچھ تو اکسو۔'' بولے کیا، بے
حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بازار سے کپڑا، میوہ
فروش سے آم، صراف سے دامِ قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ
کہاں سے دوں گا۔؟''[۳]

غالبؔ نے اپنے تمام اردو مکتوبات میں اسی طرح کا اندازِ بیان اختیار کیا ہے جس میں کاتب اور مکتوب الیہ دونوں بے تکلف گفتگو کرتے ہیں۔ غالب اپنی اردو تحریروں کو 'بے رنگ من است' کہا کرتے تھے لیکن ان کی زندگی

'بارنگ من است' سے عبارت تھی جس کا اظہار ان کے خطوط میں زیادہ نظر آتا ہے۔ غالبؔ نے اپنے خطوط میں کائنات کے مختلف رنگ کو بڑی فن کاری سے پیش کیا ہے ساتھ ہی ان کے خطوط میں عوامی سطح پر کی جانے والی گفتگو ہر کسی کو متاثر بھی کرتی ہے جس میں دلچسپی کا پہلو ہر طرح سے پایا جاتا ہے۔ گویا غالب کے خطوط ایک یار باش آدمی کا کارنامہ ہیں۔

غالبؔ کے خطوط میں مزاح کا عنصر بھی منفرد انداز میں ملتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے تلخ حقائق کا اظہار مزاحیہ انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ پورا واقعہ تصویر بن کر ابھرتا ہے۔ غالبؔ نے اپنے خطوط میں کسی بھی واقعہ کے بیان میں بے جا طوالت کے بجائے بہت ہی اختصار سے کام لیا ہے بلکہ انھوں نے موضوع سے جڑے واقعے کے لازمی حصے کو سادگی اور سلاستِ بیان کی بناوٹ اور تصنع سے پاک رکھا ہے تا کہ تحریر بوجھل نہ ہو سکے۔ غالبؔ اپنی سادگی اظہار اور مختصر بیانی کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسودے کو اصلاح دے کر بھیج دیا، اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عصر نہیں، جو سلام لکھوں۔ میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو کریدا کرو۔ مسودے کو بار بار دیکھا کرو۔ پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں۔ یہاں خیریت ہے وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمہارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار میر سرفراز حسین کو سلام دینا اور دعا کہنا! ہاں حکیم میر اشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمۂ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو''.....[۴]

غالبؔ کے خطوط میں جہاں اندازِ بیان میں انفرادیت ملتی ہے وہیں ان کے خطوط حالاتِ وقت کے مسائل کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ جس میں ہم اس دور کے دلی کے حالات کو دیکھ سکتے ہیں۔ غالبؔ کی پوری زندگی مسلسل آزمائشوں اور مشکلوں سے بھری رہی، اس غم میں ان کے حوصلے نے انھیں ہمیشہ سہارا دیا لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے اور دہلی کے اجڑنے کا غم ایک ایسے زخم کی طرح تھا کہ غالبؔ پوری زندگی اس غم سے نجات نہ پا سکے۔ رفتہ رفتہ شعر و سخن کا سلسلہ کم ہو گیا، وہ اب مایوس کن زندگی گزارتے اور یادِ ماضی میں سکون تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتے۔ غالبؔ ۱۸۵۸ء میں اپنے شاگرد منشی ہر گوپال تفتہ کو خط میں لکھتے ہیں:

''تم اپنے کلام کے بھیجنے میں مجھ سے پرسش کیوں کرتے ہو؟ چار جزو ہیں تو، بیس جزو ہیں تو، بے تکلف بھیج دو۔ میں شاعر سخن سنج اب نہیں رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں کا ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا، شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ میں نے کیوں کر کہا تھا۔''۵

غالبؔ کے مکتوبات میں کاتب اور مکتوب الیہ کے مابین تعلقات کا ایک نجی معاملہ نظر آتا ہے۔ جس میں کسی تیسرے کی گنجائش ممکن نہیں اور نہ ہی اس میں کسی بھی طرح کے مغالطے کا دخل ہے۔ غالبؔ کے خطوط کو اس دور کے حالات کا آئینہ کہا جاتا ہے جس میں انھوں نے اس زمانے کی گردش، مسائلِ زندگی، تہذیب و تاریخ اور دہلی کی عوامی زندگی پر انگریزی سامراجیت کے ظلم و ستم کو اس طرح بیان کیا ہے کہ خطوطِ غالب کی رہنمائی میں ہم عہدِ غالب کو آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ عہدِ غالب کا ایک منظر خطوطِ غالب سے ملاحظہ کریں:

''یہ کوئی سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں روتا ہوں جو مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم مگر، اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں جوان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ اس میں میرا کوئی امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد، ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے؟ جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کی زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔''۶

غالبؔ کے مذکورہ خط سے عہدِ غالب کی واضح تصویر دیکھی جا سکتی ہے، اس وقت دہلی کے کیا حالات تھے وہاں کے رہنے والے کس کیفیت سے دوچار ہو رہے تھے۔ غالبؔ نے ان سبھی چھوٹی بڑی باتوں کا ذکر اپنے خطوط میں کیا اور ساتھ ہی اپنے عہد کے ان مسائل کو بھی پیش کیا ہے جس کا انھوں نے بذاتِ خود سامنا کیا۔ غالبؔ کی زندگی میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ صدمے کی صورت میں نازل ہوا تھا جس کو انھوں نے نہ صرف برداشت کیا بلکہ اس ہنگامے میں

اپنے عزیزوں کو کھویا اور بے گانگی کی زندگی بھی بسر کی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد غالبؔ صرف بارہ سال زندہ رہے، اس دور میں انھوں نے اپنی زندگی کی پتوار کو تقدیر کے دریا کے حوالے کر دیا تھا۔ جس میں زندگی ہچکولے کھاتی ہوئی قضا کی منزل کی طرف مسلسل گامزن رہی۔ اس سلسلے میں تفتہ کو جب خط لکھتے ہیں تو کہتے ہیں:

''میاں نہ مرے سمجھانے کو دخل ہے، نہ تمہارے سمجھنے کی جگہ ہے۔ ایک چرخ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے جو ہونا ہے وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے۔ کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے۔ مرزا عبدالقادر بیدل نے خوب کہا ہے:

رغبت جاہ چہ و نفرت اسباب کدام؟
زیں ہوسہا بگزر ہا مگزر ، می گزرد

مجھ کو دیکھو نہ آزاد ہوں نہ مقید، نہ رنجور ہوں نہ تندرست، نہ خوش ہوں نہ ناخوش، نہ مردہ ہوں، نہ زندہ، جیے جاتا ہوں۔ باتیں کیے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں۔ شراب گاہ پہ جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت۔ جو تقریر ہے بہ سبیلِ حکایت ہے۔''[۷]

غالب کی خطوط نگاری کا عمومی رنگ تو سادگیِ بیان ہے لیکن بعض مقامات پر عبارت کی رنگینی، اظہار کا انداز اور الفاظ کی جادوگری ایسی ہوتی ہے کہ خطوط کا مفہوم اور رنگ و آہنگ دو بالا ہو جاتا ہے۔ مراسلہ کو مکالمہ کا روپ عطا کرنے والے غالبؔ نے اپنی وضع کا طرزِ تکلم تراشا ہے کہ مکالمہ محض کاتب، مکتوب الیہ تک محدود نہیں رہتا بلکہ ایک مجلس اور نشست کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

''بہت دن کے بعد پرسوں آپ کا خط آیا۔ سرنامے پر دستخط اور کے، اور نام آپ کا پایا۔ دستخط دیکھ کر مغموم ہوا۔ خط کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ تمہارے دشمن بہ عارضۂ تپ ولرزہ رنجور ہیں۔ اللہ اللہ، ضعف کی یہ شدت کہ خط کے لکھنے سے معذور ہیں۔ خدا وہ دن دکھائے کہ تمہارا خط تمہارے دستخطی آئے۔ سرنامہ دیکھ کر دل کو فرحت ہو، خط پڑھ کر دونی مسرت ہو، جب تک ایسا خط نہ آئے گا، دل آزردہ آرام نہ پائے گا۔ قاصدِ ڈاک کی راہ دیکھتا رہوں گا۔ جنابِ ایزدی میں سرگرمِ دعا رہوں گا۔''[۸]

خطوطِ غالب میں اس طرح کی عبارت کا سلسلہ دراز ہے۔جس کے عقب میں غالبؔ کی انفرادیت نظر آتی ہے۔غالبؔ نے بیشتر خطوط میں قاری کے تفنن طبع اور مکتوب الیہ کی دلی وابستگی کا سامان مہیا کیا ہے۔مرزا غالبؔ نے اپنے خطوط میں تشبیہات واستعارات کی تراکیب کو بھی مختلف اور نئے ڈھنگ سے باندھا ہے،خطوط کے مضامین کو نئے انداز سے برتا ہے، جومکتوب الیہ کے حسب حال اور موافق استعمال ہوا ہے۔الغرض خطوطِ غالب میں اتنی نیرنگیاں ،نزاکتیں اور نکتہ دانیاں ہیں کہ غالبؔ کا شمار دنیائے ادب کی ان ہستیوں میں ہوتا ہے جن کے خطوط دلچسپی کا ایسا سامان بن گئے ہیں کہ ایک زمانہ ان خطوط کو عظیم ادب پارے کی طرح سینے سے لگائے رکھے گا۔

حواشی:

۱۔خطوط غالب،مرتب غلام رسول مہر،مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور،۱۹۹۳ء،ص ۱۸۷

۲۔خطوط غالب،مرتب غلام رسول مہر،مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور،۱۹۹۳ء،ص ۱۹۶

۳۔خطوط غالب،مرتب غلام رسول مہر،مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور،۱۹۹۳ء،ص ۹۶

۴۔خطوط غالب،مرتب غلام رسول مہر،مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور،۱۹۹۳ء،ص ۲۵۶

۵۔خطوط غالب،مرتب غلام رسول مہر،مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور،۱۹۹۳ء،ص ۱۲۶

۶۔خطوط غالب،مرتب غلام رسول مہر،مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور،۱۹۹۳ء،ص ۱۳۰

۷۔خطوط غالب،مرتب غلام رسول مہر،مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور،۱۹۹۳ء،ص ۱۴۶

۸۔خطوط غالب،مرتب غلام رسول مہر،مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور،۱۹۹۳ء،ص ۴۲۰

CARE LIST APPROVED PEER REVIEWED & REFEREED JOURNAL ISSN 2320-3781

Naqsh-e-Nau

2022-23

International Annual Urdu Journal

(Khutoot Nigari Number)

Editor: Dr. Naseha Usmani

Published by : Dept. of Urdu
Hamidia Girls' Degree College, Prayagraj
University of Allahabad